نبیلہ ابر راجہ

نام کتاب	....	متاعِ دل
مصنفہ	....	نبیلہ ابر راجہ
ناشر	....	گل فراز احمد
		علم وعرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
پروف ریڈنگ	....	محمد زاہد ملک
کمپوزنگ	....	ساجد، انیس احمد
سن اشاعت	....	جنوری 2013ء
قیمت	....	-/500

بہترین کتاب چھپوانے کیلئے رابطہ کریں: 0300-9450911

ملنے کے پتے......

ویلکم بک پورٹ	رشید نیوز ایجنسی
اُردو بازار، کراچی	اخبار مارکیٹ اُردو بازار، کراچی
خزینہ علم وادب	مشتاق بک کارنر
الکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور	الکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
اشرف بک ایجنسی	کتاب گھر
اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی	اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی
کلاسیک بکس بوھڑ گیٹ، ملتان	کشمیر بک ڈپو، تلہ گنگ روڈ، چکوال
رائل بک کمپنی	مکتبہ رشیدیہ جنرل مارکیٹ
نل داد پلازہ، کمیٹی چوک راولپنڈی	چکوال فون:0301-5785262

متاعِ دل

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آئلہ کی تکلیف واذیت اور کرب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ شریں اُس کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ ایک تجربہ کار دائی بھی اُن کے پاس موجود تھی وہ اپنے تئیں ہر کوشش کر رہی تھی جو آئلہ کو اس تکلیف سے جلد نجات دلا سکے۔

''بھابھی آپ عمر کو فون کر دیں شہر میں۔'' دانت پہ دانت جما کے تکلیف برداشت کرتے ہوئے اُس نے منت ریز نگاہوں سے شریں بھابی کی طرف دیکھا تھا۔ ''شریفاں بڑی تجربے کار ہے۔ اس سے بھی مشکل کیس اس نے منٹوں میں نمٹائے ہیں۔ ویسے بھی رات کا وقت ہے عمر بھائی کو آتے آتے بھی چار پانچ گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔ اورنگزیب یہاں ہوتے تو پریشانی کی بات نہیں تھی پر عین وقت پہ وہ بھی عمر بھائی کے ساتھ نکل گئے۔ خیر میں کچھ کرتی ہوں۔'' شریں اُسے پریشانی سے دیکھتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

آئلہ کی زچگی کا وقت قریب تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر کے بتائے گئے حساب کے مطابق ابھی اُس کے ہاں ڈلیوری میں بیس سے پچیس دن باقی تھے۔ یہی اطمینان تھا جس کی وجہ سے عمر زیب اورنگزیب بھائی کے ساتھ کاروباری معاملات نمٹانے شہر گئے ہوئے تھے۔ اگر اُنہیں پتہ ہوتا تو وہ ہرگز نہ جاتے۔ کیونکہ ڈاکٹر نے آئلہ کے طبی معائنے کے بعد عمر زیب سے کہا تھا کہ ڈلیوری کے کم سے کم دس بارہ دن پہلے آئلہ کو ہاسپٹل ایڈمٹ کروا دینا ہے۔ عمر زیب جانے سے پہلے یہ کام کرنا چاہتے تھے۔ مگر آئلہ نے خود ہی سہولت سے منع کر دیا تھا کہ آپ واپس آئیں گے تو میں تب ہاسپٹل ایڈمٹ ہو جاؤں گی۔

پر اس کی تو نوبت ہی نہیں آپائی۔ عمر زیب کو گئے دوسرا دن تھا جب آئلہ کو لیبر پین شروع ہوئی۔ رات کا وقت شہر گھنٹوں کی مسافت پہ تھا۔ شریں شریفاں دائی کو لے آئی۔ دیہات میں اُس کی بڑی شہرت تھی۔ چھوٹے موٹے کیس وہ آرام سے نمٹا لیتی تھی۔ پر آئلہ کا کیس پیچیدہ تھا۔ شاہ زیب کی پیدائش کے بعد آئلہ کے ساتھ کوئی پیچیدگی ہو گی تھی جس کی وجہ سے پہلے کے مقابلے میں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔

وہ درد سے تڑپ رہی تھی۔ تکلیف اُس کی برداشت سے باہر تھی۔ شریفاں اُلٹے پاؤں باہر نکلی تا کہ شریں کو صورتحال بتا سکے۔

وہ اپنے کمرے میں بیڈ پہ بیٹھی تھی۔ حواس باختہ شریفاں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بھی اُس کے اطمینان میں سرمو فرق نہ آیا ''بی بی جی یہ مسئلہ میرے بس سے باہر ہے آپ چھوٹی مالکن کو شہر لے جائیں'' اُس نے اپنے تئیں صورتحال

کے حساب سے درست مشورہ دیا تھا۔ ”اور کئی دیے ہے“ شریں کا لہجہ بہت معنی خیز تھا۔ ”جواب میں شریفاں بے بسی سے اُسے دیکھ کر رہ گئی ”اچھا تم جاؤ میں ڈرائیور کو جگاتی ہوں ساتھ ہی عمر بھائی کو فون کر کے بتاتی ہوں۔“ وہ بیڈ سے اُٹھ گئی اور اُسے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ شریفاں حکم کی تعمیل میں دوبارہ آئلہ کے پاس واپس آ گئی۔ جو درد و اذیت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ایک ثانیے کے لیے شریفاں کا دل لرز سا گیا۔ کیونکہ شریں بی بی کے ارادے اور تیور کچھ اور ہی لگ رہے تھے جبکہ ہر گزرنے والے منٹ کے ساتھ آئلہ کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔

اگلا پورا گھنٹہ شریں نے بظاہر بڑے ہنگامی اقدامات میں گزارا۔ عمر زیب اور اورنگزیب کو فون کیا۔ دونوں بھائی سوئے ہوئے تھے۔ شریں نے فون کرنے میں پورا آدھا گھنٹہ لگایا۔ فون کے بعد ڈرائیور دلدار کو جگایا۔ اُدھر عمر زیب شریں بھابھی کی کال ریسیو کرنے کے بعد سے سخت مضطرب تھا۔ اُس نے بار بار بھابھی سے تاکیدی الفاظ میں کہا کہ آئلہ کو فوراً ہاسپٹل لے جانے کا انتظام کریں۔ اورنگزیب بھائی بھی جاگنے لگے تھے۔ عمر زیب نے آئلہ کا کیس ہینڈل کرنے والی لیڈی ڈاکٹر کو فون کر دیا تھا۔ اُس کا اپنا جدید سہولیات سے آراستہ ہاسپٹل تھا۔ آئلہ ایک بار خیریت سے ہاسپٹل تک جاتی تو باقی کا مسئلہ نہیں تھا۔

☆☆☆

عمر زیب مضطرب انداز میں برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ موسم میں اچھی خاصی خنکی تھی مگر وہ لاپروا تھا۔ اس وقت اُس کی ساری حسیات سمٹ کر آئلہ کی طرف متوجہ تھی۔ آئلہ اُس کی عزیز از جان محبوب بیوی اُس کے دکھ سکھ کی ساتھی۔ اُس کے پیارے سے بیٹے کی ماں۔ وہ دوبارہ تخلیق کے کربناک مراحل سے گزر رہی تھی اور اس سمے وہ اُس سے بہت دور تھا۔ وہ اکیلے دکھ، درد اور اذیت جھیل رہی تھی۔ وہ اُس کے پاس ہوتا تو اذیت اور تکلیف میں کمی تو نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اُس کی ڈھارس تو بندھا سکتا تھا۔ اپنی محبت سے اس اذیت اس کرب کو کم تو کر سکتا تھا۔ اُس نے افسوس سے ہاتھ مسلے۔ ایک پرانا منظر زندہ ہو گیا تھا جب آئلہ رخصت ہو کر اُس کے پاس آئی تھی۔ تب عمر نے زندگی بھر ہر دکھ درد میں اُس کا ساتھ دینے کا عہد کیا تھا۔ اور آج وہ اکیلی تھی۔ کاش وہ نہ آتا آئلہ کو ہاسپٹل ایڈمٹ کروا کے آتا۔ مگر اُس وقت آئلہ نے ہی بڑی سہولت اور نرمی سے انکار کر دیا تھا۔ وقت گزر ہی نہیں رہا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں بھی جیسے رک رک کے چل رہی تھی۔ اورنگزیب بھائی اُس کی حالت دیکھ کر خود پریشان تھے۔ عمر زیب انہیں سونے کا بول کر خود داخلی دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا۔ آسمان پہ بادل جمع ہو رہے تھے۔ بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اُس نے ایک نظر آسمان کو دیکھا جہاں بادل برسنے کو تیار کھڑے تھے۔ ”الٰہی خیر“ جانے کیوں اُس کا دل سکڑ سا گیا۔ اُس نے دوبارا کمرے میں آ کر جیکٹ پہنی اور حویلی فون کیا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ آئلہ کو ابھی کچھ دیر پہلے شریں بھابھی کے ساتھ گھر سے لے جایا گیا ہے۔ اُسے سخت غصہ آیا۔ شریں بھابھی نے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے فون کر کے اطلاع دی تھی۔ اس حساب سے انہیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے تھا اور کال ریسیو کرنے والی ملازمہ بتا رہی تھی کہ وہ لوگ ابھی ابھی روانہ ہوئے ہیں۔ اُس نے غصے سے ریسیور کریڈل پر پٹخا۔

”کاش کاش میں شہر نہ آتا“ اُس نے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔

☆☆☆

گاڑی نارمل رفتار سے سیاہ کولتار کی سڑک پر اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ سپیدہ سحر نمودار ہونے کی تیاری میں تھا۔ آئلہ کی گلابی مائل رنگت پہ مردنی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اب بالکل خاموش تھی۔ وقفے وقفے سے اب اُس پہ غشی طاری ہو رہی تھی۔ اُس کی حالت دیکھ کر شریفاں کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔ اُس کے برعکس شریں کے چہرے پہ کم پریشانی کے آثار تھے۔ شریفاں دائی تھی اُسے آئندہ پیش آنے والے حالات کا کچھ کچھ اندازہ ہو چکا تھا۔ آئلہ ہوش کی وادی سے دور جا رہی تھی۔ اگر کچھ ایسا ویسا ہو گیا۔ تو اُس کی جان کہیں عذاب میں نہ آ جائے۔ یہ تصورات اُسے خوفزدہ کر رہے تھے۔

گاڑی شہر کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ شریں نے آئلہ کے رخساروں پہ ہاتھ پھیرا۔ اُدھر سے کسی ردعمل کا اظہار نہیں ہوا۔ وہ پیچھے ہٹ کے بیٹھ گی اور ہاتھ میں تھامی تسبیح کے دانوں کو گھمانے لگی۔

☆☆☆

ہاسپٹل کے باہر عمر زیب بے تابانہ اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ ساتھ اورنگزیب بھی تھا۔ آئلہ کو فوراً آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ ”بھابھی آپ اتنی دیر سے کیوں لائیں آئلہ کو“ عمر زیب کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔ ”وہ گاڑی میں عین وقت پہ خرابی ہو گی ورنہ اتنی دیر نہ ہوتی“ ”اور گاڑیاں بھی تھی گھر میں صرف ایک گاڑی ہی تو نہیں تھی ناں......“

یوں لگ رہا تھا عمر ابھی رو دے گا۔ شریں چپ سی ہو گی۔ ”میں نے اپنی طرف سے کوئی کمی اور کسر نہیں چھوڑی یہ شریفاں ساتھ تھی اُس نے ہر ممکن طور پر آئلہ کا ساتھ دیا بس آنے سے کچھ دیر پہلے ہی آئلہ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی۔ ورنہ پہلے سب ٹھیک تھا۔“ شریں کا لہجہ غلط بیانی کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں لڑکھڑایا نہ کمزور ہوا۔ عمر زیب کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ طویل کوریڈور میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پہ بیٹھ گیا۔

اورنگزیب بھائی نے بازو اُس کے کندھے پر پھیلا دیا۔ ”حوصلہ کرو۔ اللہ خیر کرے گا۔ آئلہ بھابھی کے لیے صحت و زندگی مانگو“ وہ انہیں کیسے بتاتا کہ اس وقت اُس کا رواں رواں آئلہ کے لیے دعا گو ہے۔ خاصی دیر گزر چکی تھی۔ آئلہ کو آپریشن تھیٹر میں لے جائے ہوئے۔ عمر زیب کو اپنی ہر آتی جاتی سانس بوجھ لگ رہی تھی۔ اُس کو اپنا دم گھٹتا سا محسوس ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں وقت کیا دکھانے والا تھا۔

یوں لگ رہا تھا وہ پل صراط پہ کھڑا ہے اور بس اُس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ انہی خیالات میں غلطاں تھا وہ جب نرس کے ساتھ ڈاکٹر روبینہ اُن تینوں کی طرف آئی۔ عمر زیب میکانکی انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر روبینہ کا چہرا سنجیدگی و افسردگی کی تصویر بنا تھا۔ ”اللہ نے بہت پیاری بیٹی دی ہے آپ کو۔ مگر فی الحال آپ اُسے نہیں دیکھ سکتے کیونکہ بچی ”انکوبیٹر“ میں ہے اُس کی حالت جیسے ہی تسلی بخش ہوتی ہے اُسے لے جایئے گا۔ اور ایم سوری عمر صاحب ہم آئلہ کو نہیں بچا سکے۔ آپ انہیں بہت دیر سے لائے اگر کچھ گھنٹے پہلے لے آتے تو شاید اللہ کرم کر دیتا۔ میں نے آئلہ کے حوالے سے ان تمام پرابلمز سے آپ کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ اتنا لمبا سفر پھر آپ کی مسز کی کنڈیشن۔ ہم کچھ نہیں کر پائے۔ اسی وجہ سے بچی کی حالت بھی زیادہ ٹھیک نہیں ہے۔“ اس وقت ڈاکٹر روبینہ کا چہرا ایک پروفیشنل ڈاکٹر کا چہرا ہر گز نہیں لگ رہا تھا۔ یہ چہرا تو ایک مہربان عورت کا تھا۔

عمر زیب کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا اُس نے ایک لفظ نہیں سنا ہے۔ اگر سنا بھی ہے تو یقین نہیں کیا ہے۔ بھلا آئلہ کیسے اُسے چھوڑ کے جا سکتی ہے۔ اُس نے تو وعدہ کیا تھا میں ہر حال میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔ پھر اتنی جلدی وہ کیسے بھول گی سب کچھ۔

شریں کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو، غم و الم کی تصویر بنا اورنگزیب کا چہرا اور شریفاں کے بین عمر زیب کو یہ حقیقت باور کرا چکے تھے کہ آئلہ سچ مچ اُسے چھوڑ کے جا چکی ہے۔ کویت میں جنم لینے والی آئلہ کا سفر پاکستان میں آ کر ہمیشہ کے

لیے ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

عمر زیب سرزمین پنجاب کے ایک روایتی چوہدریوں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ پر اپنے خاندانی مزاج سے بالکل الگ اور غیر روایتی۔ اُن کے خاندان میں نوکری نہیں کی جاتی تھی۔ جدی پشتی زمیندار تھے اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ عمر زیب نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد نوکری کرنے کی ٹھانی تو بڑے چوہدری صاحب روایتی جلال میں آ گئے۔ پر عمر زیب بھی اُنہی کا بیٹا تھا اُس نے مخالفتوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایک غیر ملکی کمپنی میں نوکری کر لی اور پانچ سال کے کنٹریکٹ پہ کویت آ گیا۔ اس کمپنی کا مالک شیخ عمار بن حیان تھا۔ آئلہ حیان اُس کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ اکثر و بیشتر آفس آتی جاتی رہتی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اُس کی مڈبھیڑ عمر زیب سے نہ ہوتی۔ وہ عیاش طبع اور دل پھینک نہیں تھا پر آئلہ میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ دل اُس کے نام کی مالا جپنے لگا تھا۔ اُس کی نگاہوں کا خاموش پیغام آئلہ حیان تک پہنچ چکا تھا۔ عشق کی آگ دونوں طرف بھڑک رہی تھی۔ شیخ عمار بن حیان بے خبر نہیں تھا۔ اُس نے آئلہ کو روکنے کی کوشش کی پر اس چڑھتی ندی کے آگے بند باندھنا مشکل تھا۔ محبت کی جیت ہوئی اور آئلہ عمر زیب کی بیوی بن گئی۔

اس شادی کے لیے عمر زیب کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے اُسے ہی پتہ تھا۔ پاکستان میں کوئی اس شادی کے لیے راضی نہیں تھا۔ پر عمر زیب بھی اڑ گیا۔ بڑے چوہدری صاحب کو بادل نخواستہ ہار ماننا پڑی۔

یہ شادی کویت میں سرانجام پائی۔ اور اپنی روایتوں کا سر اونچا رکھنے کی خاطر عمر زیب آئلہ کو ایک ہفتے کے لیے پاکستان بھی لایا۔ یہ ایک ہفتہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ اور اُسے دوبارا کویت جانا پڑا۔ کیونکہ اُسے کاروباری معاملات کو بھی دیکھنا تھا۔ آئلہ کی شادی کے چار ماہ بعد شیخ عمار بن حیان اُس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اگر عمر زیب جیسا مخلص ہم سفر نہ ہوتا تو آئلہ کو باپ کی دائمی جدائی کے صدمے کو برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا۔ خصوصاً اس حالت میں جب وہ ماں بننے کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ آئلہ کی ماں تو پہلے ہی فوت ہو چکی تھی۔ اب اُس کے لیے عمر زیب ہی سب کچھ تھا۔

شاہ زیب اُن کی محبت کی نشانی کویت میں ہی پیدا ہوا۔ عمر زیب پہ پاکستان واپس آنے کے لیے دباؤ بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ اُدھر آئلہ کے رشتہ دار بھی اُس سے ناراض تھے کہ اُس نے ایک غیر ملک کے نوجوان کو شریک سفر چنا ہے۔

عمر زیب واپسی کا سامان باندھ چکا تھا۔ کمپنی کا سارا انتظام و انصرام آئلہ اُس کے سپرد کر چکی تھی۔ منیجر بہت قابل بھروسہ تھا۔ عمر زیب عارضی طور پر معاملات اُس کے حوالے کر کے ڈھیروں خواب لیے آئلہ اور ننھے شاہ زیب کے ساتھ واپس پاکستان آ گیا۔

اُن کا ویسا والہانہ استقبال نہیں ہوا جو اُن کے تصور میں تھا۔ اس سے پہلے آئلہ صرف چند دن کے لیے پاکستان آئی تھی۔ اُس وقت اُس کی ساس زندہ تھی سب کی نگاہوں میں اُسے پیار ہی نظر آیا۔ یہ بھی محض اُس کی نظر کا دھوکا تھا۔ اب مستقل طور پر یہاں رہنا پڑا تو ایک ایک کر کے سب خوبصورت خواب چھناکے سے ٹوٹتے چلے گئے۔

شریں بھابھی کی چھوٹی بہن بینا کا رشتہ بزرگوں کی ایما پر عمر زیب سے بہت شروع سے طے تھا۔ وہ آئلہ کی محبت میں ہر روایت کو توڑ بیٹھا پھر اب نفرتیں اُس کی منتظر تھیں۔ بینا کے گھر والے اُس کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہ تھے شریں اس گھر میں اپنی بہن کی آمد کے سپنے دیکھ رہی تھی جو عمر کی بغاوت نے چکنا چور کر دیئے۔ آئلہ ایک اٹل حقیقت تھی ویسے بھی بڑے چوہدری صاحب ابھی حیات تھے اُن کی وجہ سے دلوں میں چھپا زہر کھل کے سامنے نہ آ سکا۔ عمر زیب کو پاکستان آئے تیسرا ماہ ہو رہا تھا جب بڑے چوہدری صاحب جیسا مضبوط سہارا بھی اُس سے چھن گیا۔ اب وہ چاروں طرف سے مخالفتوں میں گھرا ہوا تھا۔ انہی حالات میں آئلہ دوسری بار امید سے ہوئی تو ڈاکٹر نے اُس کے معائنے کے بعد بتا دیا کہ اس بار بہت احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ بازی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ وہ گھریلو حالات اور نفرتوں کی وجہ سے بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ عمر زیب کا سہارا ہی اُس کے لیے سب کچھ تھا پر اُسے بھی غم دوران نے اتنی فرصت نہیں دی تھی کہ سکون سے آئلہ کے دل کی بات جان پاتا۔ وہ اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔

وہاں کویت میں اتنا بڑا بزنس تھا پر اورنگزیب بھائی اور شریں بھابھی نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ وہ وہاں جا ہی نہیں پا رہا تھا۔ ورنہ دل اُس کا بھی کرتا تھا کہ آئلہ کو یہاں سے لے کر بہت دور چلا جائے۔ پر اورنگزیب بھائی ہی اب خاندان میں بڑے اور کرتا دھرتا تھے اُن کا حکم ماننا بھی لازم تھا۔ ویسے بھی آئلہ اور عمر زیب کے ساتھ اُن کا رویہ بہت نرم تھا۔

وہ تو کہتے تھے کہ آئلہ اب اس گھر کی بہو ہے ہمارے گھرانے کی عزت ہے اسے ہماری روایتوں کا امین ہونا چاہیے۔ عمر زیب بھائی کا کہا کیسے ٹال سکتا تھا۔ اُس نے آئلہ سے کہا تھا کہ میں اب ساری عمر اِدھر ہی گزاروں گا تم بھی سب رشتے بھول جاؤ۔ وہ شوہر پرست عورت سب کچھ بول کر شوہر کی خوشی میں خوش تھی۔ عمر زیب دل ہی دل میں کچھ پلان کر رہا تھا۔ آئلہ بہت بڑی جائیداد کی مالک تھی۔ وہ اُن کے سارے خاندان سے زیادہ دولت مند تھی۔ اس خوبی کی بنا پہ نوکیلی زبانوں نے آہستہ آہستہ زہر اُگلنا بند کر دیا تھا۔ اس کا کریڈٹ آئلہ کو ہی جاتا تھا جس نے اس پُر اذیت ماحول میں بے مثال صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ وہ اپنی کشتیاں جلا چکی تھی۔

عمر زیب سارا کاروبار پاکستان سیٹل کرنے کی فکر میں تھا۔ آئلہ نے کمپنی کے سارے شیئرز فروخت کرنے کو کہا تھا۔ اس سلسلے میں عمر کی کچھ اور کمپنیوں سے بات بھی ہو چکی تھی۔ آئلہ کی ڈلیوری قریب تھی۔ وہ ابھی تک گاؤں میں ہی رہائش پذیر تھے۔ عمر شہر میں گھر بنوا رہا تھا جو تعمیر کے آخری مراحل میں تھا۔ اُس کی کوشش تھی کہ آئلہ نئے مہمان سمیت نئے گھر میں قدم رکھے۔ پر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

آئلہ اپنے ابدی گھر روانہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

آئلہ کو یہ دنیا چھوڑے تین ماہ گزر چکے تھے۔

شریں بھابھی، اورنگزیب بھائی اور خاندان کے دیگر افراد نے عمر کی بھرپور دلجوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ آئلہ کی آخری نشانی کو عمر زیب نے متاعِ جاں بنا لیا تھا۔ بڑے چاؤ سے اُس کا نام ''دُرِ یکتا'' رکھا تھا۔ شریں بھابھی نے شاہ زیب اور ننھی دریکتا کو بہت اچھے طریقے سے سنبھالا تھا۔ اُن کی مدد کروانے کی خاطر بینا بھی حویلی آ جاتی۔ اُسے دریکتا سے بہت پیار تھا۔ اُسے اٹھائے اٹھائے پھرتی۔ آئلہ کی جگہ خالی تھی اور یہ خلا پُر ہونا ہی تھا۔ یہ اٹل حقیقت تھی کیونکہ اورنگزیب بھائی عمر زیب کو بارہا دوسری شادی کا بول چکے تھے۔ وہ نہ انکار کرتا نہ اقرار بس خاموش ہو جاتا۔ اُس کی خاموشی میں ہزار ہا معنی چھپے ہوئے تھے۔ شاہ زیب ابھی صرف ڈھائی سال کا تھا اور ننھی دریکتا چند ماہ کی۔ دونوں بچوں کو ماں کی آغوش کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

''عمر کیا سوچا ہے تم نے'' اورنگزیب بھائی اُسے بغور دیکھ رہے تھے۔ بینا بھی پاس موجود تھی اور دریکتا کو گود میں لٹائے لاڈ کر رہی تھی۔ ''بھائی جان میں شہر میں سیٹل ہونے کی پوری تیاری کر چکا ہوں۔ کمپنی کے سارے شیئرز میں نے فروخت کر کے ایک اور کاروبار میں لگا دیئے ہیں۔ مجھے اب بزنس کی دیکھ بھال کرنی ہے اور اپنے بچوں کو بھی دیکھنا ہے۔ فی الحال میں نے شادی کا سوچا ہی نہیں ہے۔ یہی بچے میری کائنات ہیں''۔ وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر بول رہا تھا۔ ثریں کی نگاہوں میں غصہ اُبل رہا تھا۔ اُسے عمر کا فیصلہ ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ بینا چار ماہ سے شاہ زیب اور دریکتا کو سنبھال رہی تھی۔ راتوں کی نیندیں حرام کر رہی تھی اور عمر نے یہ صلہ دیا تھا۔ وہ شہر جانے کی بات کر رہا تھا۔ اور واقعی اُس نے اپنا کہا پورا کر دیا۔ دو ماہ کے مختصر عرصے میں سب کچھ سمیٹ کر گاؤں کی حویلی خالی کر گیا

بینا ایک بار پھر روتی تڑپتی رہ گئی۔

اب اُس کی ساری اُمیدیں دم توڑ گئی تھیں۔ گھر والوں نے اُس کا رشتہ زبردستی طے کر دیا۔ لڑکا کراچی میں سیٹل تھا اور بینا کی دور پرے کی خالہ کا بیٹا تھا۔ کھاتا پیتا گھرانہ تھا چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہوا۔ حمزہ احمد کی بیوی ایک حادثے کا شکار ہو کر اپنے دو سالہ بچے باسط کو چھوڑ گئی تھی بینا نے مجبوراً حمزہ احمد کو قبول کیا۔

☆☆☆

عمر زیب نے شاہ زیب اور دریکتا کے لیے گورنس رکھ دی تھی مگر دوست احباب مشورہ دیتے کہ شادی کر لو۔ اس طرح بچوں کو ماں کا پیار بھی ملے گا۔ اور گھر کے لیے عورت کی ضرورت بھی پوری ہو جائے گی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے دوستوں کی مانتے ہوئے شادی کر لی۔ راحیلہ بہت اچھی بیوی اور ماں ثابت ہوئی۔ ایک بار پھر عمر زیب کی زندگی میں گھریلو سکون اور خوشیاں لوٹ آئیں۔ راحیلہ شاہ زیب اور دریکتا کی پرورش سگی ماں کی طرح کر رہی تھی۔ عمر کو ہر طرح کا سکون میسر تھا۔

اُس کی دوسری شادی نے ثریں بھابھی اور اورنگزیب بھائی کو ناراض کر دیا تھا۔ انہوں نے اُس سے ملنا جلنا ہی ختم کر دیا۔ عمر خود ہی ڈھیٹ بن کر گاؤں جاتا پر ان میں گرمجوشی ختم ہو گئی تھی۔ ثریں کے اپنے شکوے تھے اب تو اورنگزیب بھی اُس کے ہمنوا بن چکے تھے۔

عمر زیب کی دوسری زندگی کی خوشیوں کا دور بھی مختصر ثابت ہوا۔ راحیلہ کو بلڈ کینسر تھا۔ اور آخری اسٹیج پہ تھا۔ شومئی قسمت کہ راحیلہ کے بطن سے عمر زیب کی کوئی اور اولاد نہیں ہوئی۔ شادی کے آٹھ سال بعد وہ بھی اُس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ شاہ زیب اور دریکتا سمجھدار تھے۔ خاص طور پہ دریکتا سمجھدار ہونے کے ساتھ ساتھ حساس بھی تھی۔

راحیلہ نے اُن دونوں بہن بھائی کو ماں کا پیار دیا تھا۔ اُن کی پرورش، دیکھ بھال، تعلیم و تربیت میں اپنا تمام تر خلوص اور محبت صرف کی تھی۔ راحیلہ عمر زیب کی پسند یا محبت نہیں تھی۔ مگر اُن کے بھائی، بھابھیاں اس بات پہ ناراض تھے کہ عمر نے ایک بار پھر خاندان سے باہر کی لڑکی کو چنا ہے۔ ثریں بھابھی کو اپنا غم کھائے جا رہا تھا کہ عمر نے بینا کو دوسری بار ٹھکرایا۔ بڑھتے بڑھتے اُس کے دل کا یہ زخم ناسور بن چکا تھا۔ عمر کی دوسری شادی کے بعد اُس نے اورنگزیب کے دوسرے دو بھائیوں اور اُن کی بیویوں کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا تھا۔ عمر گاؤں آتا راحیلہ کے ساتھ دونوں بچوں کو بھی لاتا پر اُن سب کا رویہ اجنبیوں اور بیگانوں والا ہوتا۔ کوئی سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ راحیلہ ہنس ہنس کر اُس کی شرمندگی دور کرنے کی کوشش کرتی۔ اُس نے ہر طرح عمر کا بھرپور ساتھ دیا۔ اب شاہ زیب اور دریکتا دونوں دودھ پیتے بچے نہیں تھے۔ باشعور تھے۔ عمر کی اس منزل پہ تھے کہ اپنا خیال خود رکھ سکتے تھے۔ مگر اُس کی دائمی جدائی عمر کے ساتھ ساتھ اُن دونوں بہن بھائیوں کے لیے بھی کسی سانحے سے کم نہیں تھی۔ یہ راحیلہ ہی تھی جس نے عمر زیب کو گھر کی طرف سے بے فکر کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے اُس نے اپنے بزنس کو بھرپور ترقی دی تھی۔ کیونکہ راحیلہ نے بچوں کی ماں کی کمی پوری کر دی تھی۔ شاہ زیب اور دُریکتا نے پُرسکون نارمل گھریلو ماحول میں پرورش پائی تھی۔ کوئی اور عورت شاید یہ سب نہ کر پاتی جو راحیلہ نے کیا تھا۔ اُس نے اُن دونوں کو ماں کا پیار دیا تھا۔ بینا کی ساری توجہ اس بات پہ تھی کہ کسی طرح وہ ایک بار عمر کی بیوی بن جائے بعد کی بعد میں دیکھی جانی تھی۔ اسی وجہ سے تو وہ دریکتا کو اُٹھائے اُٹھائے پھرتی کہ عمر کی نگاہوں میں سما جائے۔ پر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اُس کی تمام تر کوششوں کے باوجود اُس کی جگہ راحیلہ عمر کی ہم سفر بن گئی تھی۔ پر یہ صدمہ ثریں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ عمر نے ایک بار پھر بینا کو ٹھکرایا تھا۔ اُس نے روتے دھوتے شادی کے لیے ہاں کی تھی۔ اپنے شوہر سے اُس کے لڑنے جھگڑنے کی خبریں ایک تواتر سے ثریں تک پہنچتی رہتی تھیں اور وہ اندر ہی اندر کڑھتی۔ اب تو راحیلہ بھی نہیں رہی تھی۔ بچے جوان ہو رہے تھے۔

☆☆☆

سیٹی پہ شوخ سی دھن بجاتے ہوئے وہ آئینے میں خود کو دیکھتا بالوں میں برش کر رہا تھا۔ برش کرنے کے بعد اُس نے پرفیوم اُٹھایا اور خود پہ اسپرے کیا۔ مکمل طور پر اپنی تیاری سے مطمئن ہونے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکلا۔ ڈائننگ ٹیبل پہ اُس کا انتظار ہو رہا تھا۔ عمر زیب نے فخر سے لمبے چوڑے شاہ زیب کو دیکھا۔ قد کاٹھ شکل و صورت میں وہ ہو بہو اُن کی کاپی تھا۔ اُنہی کی طرح یونانی دیوتاؤں کا سا حسن سمیٹے اور مغرور کھڑی ناک روشن آنکھیں۔ ''اللہ نظر بد سے محفوظ رکھے'' عمر زیب نے اپنی نظر لگنے کے ڈر سے ایک ثانیے کے لیے اپنی نگاہیں اُس کی طرف سے موڑ لی تھیں۔ ''بھائی جلدی کرو نا۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے''۔ دریکتا نے خفگی سے اپنی ستواں ناک سکیڑی۔ تب تک شاہ زیب کرسی گھسیٹ کر اُس کے مقابل بیٹھ چکا تھا۔

وہ جلدی جلدی کھا رہا تھا۔ کالج پہنچنے کی جلدی تھی۔ دریکتا اولیول کر رہی تھی۔ ڈرائیور اُسے پہلے ڈراپ کرنے کے بعد پھر شاہ زیب کو کالج چھوڑتا۔ شاہ زیب ڈرائیونگ سیکھ چکا تھا۔ پر عمر نے ابھی تک اُسے ڈرائیونگ کی اجازت نہیں دی تھی۔

مجبوراً وہ بائیک چلا کر اپنا شوق پورا کرتا۔ عمر زیب اُس کے علم میں لائے بغیر ایک گاڑی اُس کے لیے پسند کر کے ادائیگی بھی کر چکے تھے۔ چند دن بعد اُس کی سالگرہ تھی یہ تحفہ اُس موقعے پر شاہ زیب کو ملنا تھا۔

عمر زیب دونوں بچوں کو دیکھ دیکھ کر جی رہے تھے۔

☆☆☆

دریکتا اُسی کے انتظار میں تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کی طرف گیا ہوا تھا۔ واپسی دیر سے ہوئی۔ دریکتا اُس کے انتظار میں گیٹ کے آس پاس ٹہل رہی تھی۔ ''ابھی تک جاگ رہی ہو'' شاہ زیب نے پیار سے اُس کے سر پہ چپت لگائی۔ ''بھائی پپا گاؤں جا رہے ہیں'' اُس نے گیٹ کے ساتھ بنی پختہ روش پہ چلتے چلتے اُسے بتایا تو وہ رُک گیا۔ ''تمہیں کس نے بتایا''، ''بھائی خود پپا نے بتایا ہے کہ اُن کا گاؤں جانے کا بہت دل کر رہا ہے پچھلے دو سال سے وہ جا نہیں پائے ہیں''، ''اچھا یہ تو نئی بتائی ہے تم نے'' چلتے چلتے شاہ زیب اپنے بیڈ روم کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اندر آ کے دونوں بیٹھ گئے۔ ''بھائی میرا دل بھی کر رہا ہے جانے کو پپا کے ساتھ''۔ ''تو چلی جاؤ ناں''۔ اُس نے جوتے اُتارتے ہوئے مشورہ دیا' بھائی

تم بھی جاؤناں میرے ساتھ۔ اُس کے لہجے میں بے انتہا لجاجت تھی۔

''میں نہیں جاتا۔ پپا پسند نہیں کرتے۔ میں تو آخری بار شاید چار سال پہلے گیا تھا گاؤں'' اُس نے حساب لگا کر بتایا۔ ''نہیں اگر ہم دونوں مل کر پپا کو کہیں گے تو وہ مان جائیں گے''، ''بہت خوب تم اس لیے میرے انتظار میں تھی'' شاہ زیب فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔

وہ اُس کی چالاکی بھانپ چکا تھا۔ پپا نے جانے کیوں اُن کا گاؤں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ کبھی کھل کر انہوں نے اس موضوع پر اظہار خیال بھی تو نہیں کیا تھاناں۔

عمر زیب نہیں چاہتے تھے کہ رشتہ داروں کی اندرونی مخالفتیں اُن کی اولاد پہ عیاں ہوں۔ گزشتہ کچھ سالوں سے اُن کا گاؤں جانا نہ جانے کے برابر تھا۔ آخری بار جب وہ گئے تھے تو تینوں بھائیوں میں سے کسی نے بھی سلام دعا کے علاوہ اُن سے اور بات نہیں کی تھی۔ شریں بھابھی کا رویہ سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ مجبوراً وہ آنکہ کی قبر پہ فاتحہ خوانی کر کے لوٹ آئے تھے۔

اب اتنے سال بعد انہوں نے گاؤں جانے کا قصد کیا تو دریکتا نے بھی دبے دبے لہجے میں جانے کی بات کی تھی۔ اُدھر سے کسی نے بھی ان ڈھائی سالوں میں چکر نہیں لگایا تھا۔ عمر زیب کا دل مچل رہا تھا اپنوں سے ملنے کو۔ اُن کے دل میں تو سب کی محبت موجود تھی۔ یہ محبت ہی تھی جو انہیں وہاں لے جاتی تھی۔ اُدھر سے تو جیسے سب نے نہ آنے کی قسم کھالی تھی۔

اب دُریکتا شاہ زیب کی منتیں کر رہی تھی کہ وہ بھی پپا سے بات کرے تاکہ وہ راضی ہو جائیں۔

☆☆☆

عمر زیب نے باری باری اُن دونوں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جہاں دُور دُور تک کسی ریاکاری کے کوئی آثار نہیں تھے۔ دُریکتا کے ساتھ ساتھ شاہ زیب نے بھی کہا تھا کہ وہ اُن کے ساتھ گاؤں جانا چاہتا ہے۔ اب فرار کی گنجائش نہیں تھی۔ مجبوراً وہ مان گئے۔ وہ کس طرح مانے تھے اُن کا دل ہی جانتا تھا۔

پہلے صرف اورنگزیب ہی شریں کے کہنے میں آ کر اُس سے ناراض ہوئے تھے بعد میں باقی دونوں چھوٹے بھائی بھی اُن کے ہم خیال ہو گئے تھے۔ عمر زیب ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ سگے رشتوں کی یہ سفاک حقیقتیں اُن کی اولاد پہ عیاں ہوں۔ پر دریکتا ضد کر رہی تھی اور ساتھ بھائی کو بھی ملا لیا تھا۔ ''تم دونوں اپنے کپڑے اور ضروری سامان رکھ لو۔ ہمیں کل صبح نکلنا ہے''

عمر زیب نے بالآخر حامی بھر ہی لی۔ ''اوہ پپا زندہ باد'' دریکتا اُٹھ کر اُن سے لپٹ گئی۔

شاہ زیب بھی مسکرانے لگا۔

عمر زیب انہیں خوش دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ بھول گئے تھے۔

☆☆☆

کچا راستہ شروع ہو چکا تھا۔ گاڑی اِدھر اُدھر ڈول رہی تھی۔ پر ڈرائیور بہت ہوشیار اور تجربہ کار تھا۔ عمر ان دونوں کو اپنی زمینوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ کچے میں ایک متروک کنواں تھا اُس پہ نظر پڑتے ہی عمر کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ اُس سے کچھ آگے اُجڑا ہوا ڈیرا تھا جہاں کبھی بڑے چوہدری صاحب محفلیں سجاتے تھے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کے ساتھ۔ اب تو کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

کھول کر نیچے اُترے۔ وہ قبرستان کے داخلی دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ دُریکتا اور شاہ زیب نے بھی اُن کی تقلید میں قدم اُن کے ساتھ ملا دیئے۔ عمر نے سب کی قبروں پر پہ فاتحہ خوانی کی۔ واپسی پر اُن کی آنکھوں کے گوشے نم تھے۔ خود دریکتا کی بھی ایسی ہی حالت تھی۔

ڈرائیور نے دوبارا گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ اب سرسبز کھیت سامنے تھے۔ راستہ اب بھی کچا ہی تھا پر ہریالی نظروں کو بھا رہی تھی۔ دریکتا بڑی دلچسپی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ بالآخر یہ طویل سفر لوہے کے بلند و بالا گیٹ کے سامنے اختتام پذیر ہوا۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا تو اندر سے چھوٹا گیٹ کھول کر چوکیدار باہر نکلا۔ عمر زیب کو دیکھتے ہی اٹین شین ہو گیا زوردار سلام جھاڑا اور گیٹ کھول دیا گاڑی اندر آ گئی۔ کبھی اس گھر کے در و دیوار کی ایک ایک اینٹ میں اپنائیت کی مہک تھی پر آہستہ آہستہ سب کچھ ختم ہوتا گیا۔ اب بس یادیں تھیں۔ عمر نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُن کی آمد کی اطلاع گھر کے مکینوں تک پہنچ چکی تھی۔

ایک دراز قد گوری رنگت والی لڑکی اندرونی رہائشی دروازے سے باہر نکلی۔ اُس کا رخ انہی کی طرف تھا۔ کچھ ہی دیر میں اور بھی چہرے آنے والے مہمانوں کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ نوجوان نسل کی دلچسپی دریکتا اور شاہ زیب میں تھی۔ کچھ ہی دیر میں عمر چچا اور اُن کے لمبے چوڑے خوبرو بیٹے اور نازک سی بیٹی کی آمد کی خبر گھر کے ایک ایک مکین تک پہنچ چکی تھی۔

دریکتا اور شاہ زیب نے کافی عرصے بعد اپنے ان کزنز کو دیکھا تھا خاص طور پر دریکتا کا لگاؤ واضح طور پر محسوس کیا جا رہا تھا۔ اُن سب کا رویہ دوستانہ تھا۔ البتہ خاندان کے کرتا دھرتا ہنوز دل میں پرانی نفرت کے بیج اُگائے بیٹھے تھے۔ جن کی بھرپور فصل پک کر تیار تھی۔ اس نفرت کی فصل میں زہریلے نوکیلے کانٹے دار پھل تھے۔ جن کا ذائقہ دریکتا اور شاہ زیب نے فی الحال چکھا نہیں تھا۔

شریں اور گھر کی دیگر عورتوں کا رویہ مناسب ہی تھا۔ چچا لوگوں نے بھی سر پر ہاتھ پھیر دیے تھے۔ تایا اورنگزیب نے اپنے پورشن میں اُن تینوں کے لیے تینوں کمرے تیار کروا دیئے تھے۔ یہ سب ہنگامی حالات میں ہوا تھا۔ کیونکہ عمر نے اپنے آنے کی پیشگی اطلاع نہیں دی تھی۔ پھر بھی عمر کے نزدیک اُن کا رویہ غنیمت تھا۔

مائرہ رات کو دریکتا اور شاہ زیب کے لیے خود دودھ کے گلاس لے کے آئی۔ شریں چچی کی اس بیٹی کا رویہ اُن کے ساتھ باقی کزنز کی نسبت بہت ہی نرم اور خصوصی تھا اس وجہ سے دریکتا کو وہ اچھی بھی لگی تھی۔

☆☆☆

شاہ زیب اور دریکتا ایک ہی کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مائرہ کو بھی دریکتا نے پاس بٹھا لیا۔ ''آپ کیا کرتی ہیں مائرہ'' شاہ زیب نے پہلی بار پوری توجہ سے اُس کی سمت دیکھا۔ کیسی گھور نشلی روشن آنکھیں تھیں مائرہ نے نظر چرا لی۔ میں کالج کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ ایف ایس سی فرسٹ ایئر میں ہوں۔ اصل میں مجھے اس وقت تک ایف ایس سی کلیئر کر لینا چاہیے تھا مگر مجھے ایڈمشن لینے میں دیر ہو گی پھر میں یہاں کی تعلیم کے معیار سے مطمئن نہیں ہوں۔ ایک قریبی شہر کے کالج میں ایڈمشن لیا ہے۔ آتے جاتے ہی کافی ٹائم لگ جاتا ہے۔ اُس نے تفصیل سے بتایا اور چہرے پہ آئے بال پیچھے کیے۔ مائرہ شاہ زیب سے کچھ چھوٹی ہی تھی اس لیے دریکتا اُسے آپ جناب کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ ''آپ ہمارے ساتھ

گزرتے شریں نے بھی سن لیا۔ وہ اِدھر ہی آ رہی تھی۔ یہ بات سن کر اُس کے ہونٹوں پر معنی خیز سی مسکراہٹ آ گئی۔

ہلکے سے دروازہ بجا کر وہ اندر داخل ہوئی۔ شاہ زیب اُنہیں دیکھ کر مؤدب ہو گیا۔ ''اور سناؤ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ مائرہ کو بتا دو لے آئے گی''۔ اُن کے لہجے میں یکا یک در آنے والا پیار بے سبب نہیں تھا۔ ''نہیں تائی جان کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہے''۔ دُریکتا انہیں درمیان پا کر خوش ہوگی۔ ''پھر تم لوگ باتیں کرو میں جا رہی ہوں۔ دن بھر ہونے والی بھاگ دوڑ مجھے تھکا دیتی ہے''۔ وہ انہیں اس طرح باتیں کرتا چھوڑ کر اُٹھ گئیں۔ مائرہ رات ایک بجے کے بعد اپنے بیڈ روم میں آ کر لیٹی۔ وہ بھی ایسے کہ اُس کی آنکھوں میں دور دور تک نیند کے آثار نہیں تھے۔

اُدھر دریکتا بھی شاہ زیب کے پاس سے اُٹھ آئی تھی۔ اُسے پپا سے دل ہی دل میں کچھ شکوے ہو چلے تھے۔ کہ وہ انہیں اتنے عرصے بعد کیوں گاؤں لائے۔ یہاں تو سب کزنز شریں تائی سب کتنی محبت سے پیش آ رہے تھے۔ تائی نے شکوہ بھی کیا کہ عمر جانے کیوں تمہیں گاؤں نہیں لاتا ہے اس لیے ہم بھی شہر اُس کے پاس نہیں جاتے کہ جب وہ خود یہاں آنا پسند نہیں کرتا تو ہماری آمد بھی اپنے گھر اُسے پسند نہیں آئے گی۔ دریکتا دل ہی دل میں کسی حد تک اُن سے متفق تھی۔

شاہ زیب بھی دروازہ بند کر کے لیٹ گیا۔ معاً اپنے پاؤں کے نیچے اُسے کسی چیز کے چبھنے کا احساس ہوا۔ وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا اور لائیٹ جلا کے دیکھا۔ یہ نازک سی پائل تھی۔ اُسے یاد آ گیا کہ یہ مائرہ کی ہے کیونکہ وہی اِدھر بیٹھی تھی۔ اُسی کی پائل تھی۔ لاک کھل جانے سے وہ اُس کے پاؤں سے اُتر گی تھی۔ دریکتا تو جیولری پسند ہی نہیں کرتی تھی یہ پائل مائرہ کی ہی تھی۔ شاہ زیب نے ہاتھ میں پکڑ کر بغور دیکھا۔ یہ بہت نازک سی پائل تھی۔ جس میں چھوٹے چھوٹے نگ جڑے تھے۔ بعد میں شاہ زیب کو خود ہی ہنسی آ گی کہ وہ کتنے غور سے دیکھ رہا ہے۔ اُس نے سائیڈ ٹیبل کے پاس رکھ دی کہ صبح مائرہ کے دے دے گا۔ بہت جلد وہ نیند کی وادیوں میں اُترا تھا۔

☆☆☆

اُس کا دروازہ ہولے سے ناک ہوا۔ اجنبی جگہ پہ رات گزری تھی پھر بھی نیند اچھی آئی تھی۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی وہ پپا کے ساتھ گاؤں سے کوچ کر گیا تھا۔ پھر کبھی کبھی آنا ہوتا۔ ہر رات ایسی مدہوشی کی نیند سویا کہ دن گیارہ بجے ہی دروازہ ناک کرنے پہ آنکھ کھلی۔ شاید ان در و دیوار میں اپنائیت مانوس سی تھی تب ہی تو وہ آرام سے سویا تھا۔ ورنہ اپنے کمرے اور بیڈ کے بغیر اُسے بڑی بے آرامی ہوتی تھی۔ اُس نے سلیپنگ گاؤن پہن کر دروازہ کھول دیا سامنے مائرہ کھڑی تھی۔ ''جاگ جایئے کزن۔ ناشتہ تیار ہے جلدی آیئے اور ہاں دیر مت کیجیے گا۔'' اُس کے لبوں پہ پُرکشش مسکراہٹ سجی تھی۔ شاہ زیب کو کھڑکی سے اندر آتی دھوپ یکا یک بہت ہی دلفریب سے محسوس ہوئی تھی۔ ''اوکے میں آتا ہوں لیکن آپ کی ایک چیز میرے پاس ہے'' وہ وہیں سے مڑا۔ مائرہ اُس کے پیچھے کھلے دروازے سے اندر آ گی۔ شاہ زیب ٹیبل پہ پائل ڈھونڈ رہا تھا۔ پر وہ وہاں نہیں تھی۔ ''کون سی چیز ہے میری'' وہ بھی شاہ زیب کے پیچھے متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ''ارے رات کو یہ ٹیبل پہ ہی تو رکھی تھی کہاں گی''۔

سائیڈ ٹیبل کے پائے کے ساتھ کچھ چمک رہا تھا۔ شاہ زیب نے ہاتھ بڑھایا۔ اُس کی مطلوبہ پائل مل گئی تھی۔ ''یہ رہی آپ کی پائل''۔ رات کو آپ یہاں بیٹھی تھیں غالباً اس کا لاک کھل گیا تھا جب ہی یہ گر گئی ہوگی۔ شاہ زیب نے پائل اُس کی طرف بڑھائی۔ ''میں صبح سے ڈھونڈ رہی تھی شکر ہے مل گئی۔ یہ پائل بہت پسند ہے مجھے۔ آرڈر پہ بنوائی تھی''۔

اُس نے بے تابی سے پائل شاہ زیب کی ہتھیلی سے اٹھائی اور پھر داہنی ٹانگ کا پائنچہ اٹھا کر پاس اُدھر ہی پہننے لگی۔ شاہ زیب نے آنکھ چرالی۔ مائرہ کے ٹراوزر کے پائنچے خاصے کھلے تھے وہ اس طرح کر رہی تھی جیسے کمرے میں اکیلی ہو۔ اُس کی صاف شفاف دودھیا پنڈلی بڑی دل فریب سی لگ رہی تھی۔ بالآخر وہ پائل پہن کر سیدھی ہوئی تو شاہ زیب قدرے دور ہٹ گیا۔ ''تھینکس کزن میں جاتی ہوں فریش ہو کے آپ فوراً آؤ'' مائرہ خوش دلی سے بولتی دروازہ بند کر کے جا چکی تھی۔

شاہ زیب شاور لیتے ہوئے اُسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مائرہ کی ننھے منے نگوں والی پائل اور شفاف دودھیا پنڈلی اُس کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھی۔

☆☆☆

ناشتے میں خاصا اہتمام تھا۔ مگر شاہ زیب قدرے شرمندہ تھا کیونکہ وہ خاصی دیر سے بیدار ہوا تھا۔ وہ اور مائرہ ڈائننگ ٹیبل پہ اکیلے تھے۔ اُس نے پپا کا پوچھا تو مائرہ نے بتایا کہ وہ زمینوں کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ وہ ناشتہ کر کے فارغ ہوا تو شریں تائی آ گئیں۔ مائرہ بھی بیٹھ گی۔ پھر باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مائرہ نے ہی آفر کی کہ باغ میں چلتے ہیں پھر آپ کو ٹیوب ویل کی طرف لے جاؤں گی۔ دریکتا ایسے کاموں میں بڑی خوشی خوشی حصہ لیتی تھی جھٹ تیار ہو گی اور شاہ زیب کو بھی آمادہ کر لیا۔ اُن کے ساتھ باقی کزنز بھی تھے۔ جانے کیوں سب کو تیار ہوتا دیکھ کر مائرہ کا منہ سا بن گیا تھا۔ پیدل ہی یہ قافلہ روانہ ہوا۔

راستے میں جگہ جگہ سبزہ تھا۔ آنکھوں کو تراوٹ سی مل رہی تھی۔ شاہ زیب نے ایک جگہ رک کر گہرے گہرے سانس لیے۔ جیسے اس ماحول اور اس فضا کی ساری تازگی کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتا ہو۔ مائرہ اُس کے پیچھے ہی تھی۔ ''کزن آپ کو یہ سب اچھا لگ رہا ہے''۔ اُس نے غور سے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بہت اچھا میں پچھتا رہا ہوں کہ اتنے عرصہ گاؤں کیوں نہیں آیا''۔ ''ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جانے کیوں عمر چچا آپ کو گاؤں لانے سے کتراتے رہے حالانکہ ہم سب لوگ آپ کو ہمیشہ سے مس کرتے رہے''۔ مائرہ کا بات کرنے کا انداز بہت سادہ سا تھا مگر شاہ زیب کے ذہن میں اُس کا جملہ اٹک سا گیا کہ ''جانے کیوں عمر چچا آپ کو گاؤں لانے سے کتراتے رہے''۔ واقعی پپا کیوں ایسا کرتے رہے۔ کل سے اب تک اُس نے سب کے رویوں میں گرمجوشی محسوس کی تھی۔ تایا اورنگزیب کے ساتھ ساتھ اُن کی اولادیں، دونوں چچا اُن کی بیویاں بچے سب اتنی محبت سے پیش آ رہے تھے۔ کچھ ایسے ہی خیالات دریکتا کے بھی تھے کہ پپا خواہ مخواہ نہ خود اتنا عرصہ گاؤں آئے نہ انہیں آنے دیا۔

وہ اپنوں کی محبت سے سرشار تھی۔

☆☆☆

ٹیوب ویل کے پاس بیٹھ کر مائرہ نے دونوں پاؤں ٹھنڈے تازہ پانی میں ڈبو دیئے۔ پل بھر میں ٹھنڈے پانی نے ٹانگوں اور پاؤں کے ساتھ ساتھ ٹراوزر کے پائنچوں کو بھی بھگو دیا۔ ایک بار پھر اُس کی پنڈلیاں شاہ زیب کے سامنے تھیں۔ اچھی خاصی ٹھنڈ تھی پر وہ نہ جانے کس مٹی سے بنی تھی اُسے سردی کا پتہ ہی نہیں تھا۔ مزے سے پانی کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ شاہ زیب کو ایک بار پھر نظر چرانا ہی پڑی۔

مائرہ کی معصوم سی بیباکی اُسے عجیب سی لگ رہی تھی۔ جیسے اُسے کچھ پتہ ہی نہ ہو جیسے اُس نے اس دنیا میں پہلی بار قدم رکھا ہو۔ اُس کا کزن کہہ کر مخاطب کرنا شاہ زیب کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ باقی لڑکے لڑکیاں اُس کا نام لے رہے

تھے۔ پر وہ صرف کزن کہہ رہی تھی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا مگر مائرہ کا اہمیت دینا اچھا لگ رہا تھا۔

شام کو وہ لوگ گھر لوٹے تو مختلف لوازمات سمیت کھانا اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ شاہ زیب تھک چکا تھا۔ کھانا کھا کر سو گیا۔ مغرب کے بعد دریکتا نے بڑی مشکل سے اُسے اُٹھایا۔

آج اورنگزیب تایا نے سب بھائیوں کی دعوت کی تھی۔ رات کا کھانا اُن کی طرف تھا۔ لمبے سے ڈائننگ ہال میں بڑی رونق تھی۔ صبح عمر زیب اور اُن دونوں بہن بھائی نے واپس شہر جانا تھا۔ ایک طرح سے آج اُن کی الوداعی دعوت تھی۔ باتوں اور کھانوں کا سلسلہ اکٹھے اکٹھے چل رہا تھا۔ شریں بھابھی نے روئے سخن عمر کی طرف موڑا۔ ''عمر بھائی مائرہ کو پڑھنے کا بہت شوق ہے یہاں کے کالج کا آپ کو پتہ ہے ایک سال اس کا ضائع ہو گیا ہے اب قریبی شہر کے ایک کالج میں داخلہ لیا ہے تو وہاں آنے جانے میں ہی اچھا خاص وقت لگ جاتا ہے جب سے آپ لوگ آئے ہیں یہ کہہ رہی ہے کہ میں نے بھی وہاں ہی داخلہ لینا ہے۔ ہوسٹل میں رہ لے گی آپ بس اس کا داخلہ کروا دینا۔'' شریں بھابھی کا رویہ حد سے زیادہ پُر تکلف تھا۔ عمر کو ہوسٹل والی بات بہت بُری لگی۔ ''میں مائرہ کا ایڈمشن کروا دوں گا مگر میرے ہوتے ہوئے یہ ہوسٹل میں کیوں رہے۔ جیسے دریکتا میری بیٹی ہے اس طرح مائرہ بھی ہے۔ بیٹا تم اپنا ضروری سامان پیک کر لینا۔ کل تم بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔'' اب اُن کا مخاطب مائرہ تھی۔ خوشی سے اُس کا بُرا حال تھا۔ اتنی آسانی سے سب کچھ ہو جائے گا اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اُس نے ہی شریں کو سب سے پہلے بتایا تھا کہ دریکتا کہہ رہی ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو اور اُدھر ہی کسی اچھے سے کالج میں ایڈمشن لے لو۔ اورنگزیب کے آگے اُسی رات شریں نے یہ تجویز رکھی تھی۔ آئیڈیا بُرا نہیں تھا۔ ویسے بھی عمر اُن کا بھائی تھا۔ ''اگر مائرہ اُس کے گھر رہ کر تعلیم حاصل کرتی تو برائی ہی کیا تھی۔'' ڈائننگ ٹیبل پہ جان بوجھ کے شریں نے سب کے سامنے وہ بات چھیڑی تھی۔

اِدھر گاؤں میں سب کچھ تھا۔ دولت، جائیداد، کھانے پینے کی فراوانی۔ پر شہر والی تیز رفتاری اور چکا چوند نہیں تھی۔ شریں چاہتی تھی کہ مائرہ اُدھر رہ کر سب مینرز سیکھ لے۔ شاہ زیب کو دیکھتے ہی اُس کے ذہن میں ایک پرانی خواہش نے سر اُٹھایا تھا۔ اُسے کوئی مشکل ہی نہیں ہوئی۔ عمر بہت خوش ہوا کہ مائرہ کو پڑھنے کا اتنا شوق ہے۔

اُس نے بہت خوشی خوشی اپنا بیگ تیار کیا تھا۔ صبح اُسے عمر چچا کے ساتھ اُن کے گھر چلے جانا تھا۔ اُسے اچھی طرح پتہ تھا کہ باقی دونوں چچیاں اور اُن کی بیٹیاں دل ہی دل میں جل رہی ہوں گی کہ وہ عمر چچا کے ساتھ اُن کے گھر جا رہی ہے۔ وہیں رہ کر پڑھے گی۔ سو اُس نے اپنی طرف سے اُن سب کو جلانے کا پورا پورا انتظام کر لیا تھا۔

☆☆☆

عمر چچا کا گھر بہت خوبصورت اور ویل ڈیکوریٹڈ تھا۔ پوری طرح شہری مزاج سے ہم آہنگ۔ مائرہ کو دریکتا کے ساتھ والا کمرا دیا گیا۔ اگلے کچھ دنوں میں مائرہ کا ایڈمشن بھی ہو گیا۔ اب شاہ زیب خود ڈرائیونگ کرتا اور اُن دونوں کو بھی ڈراپ کر دیتا۔ شہر آ کر مائرہ نے خود کو پہلے سے زیادہ سنوار لیا تھا۔ بال سٹیپس میں کٹوا لیے۔ جدید فیشن کے مزید ملبوسات خرید لیے وہ گاؤں کی پروردہ نظر ہی نہیں آتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس میں سیکھنے کی صلاحیت بہت زیادہ تھی۔ پھر آنے سے پہلے شریں نے اُسے بہت سی ہدایات بھی دی تھیں جن کو وہ پوری طرح فالو کر رہی تھی۔ اُس کا رنگ روپ مزید نکھرتا جا رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ خوبصورت نہیں تھی پر اُسے خوبصورت نظر آنے کا گُر آتا تھا اور اس کا استعمال اُس نے بہت خوبصورتی اور سلیقے کے ساتھ کیا تھا۔ وہ شریں جیسی ماں کے زیر سایہ پروان چڑھی تھی بیباک، نڈر اپنی طرف موڑنے اور متوجہ کرنے کے سارے طریقے اُسے آتے تھے۔

☆☆☆

شاہ زیب شام کو گھر لوٹا تو بڑی خاموشی تھی۔ حالانکہ اس وقت پپا اور دریکتا شام کی چائے پہ اُس کا انتظار کر رہے ہوتے کہ کب وہ گھر لوٹے۔ پھر خوب ڈسکشن ہوتی ہر موضوع پہ۔ پر آج لان میں پڑی چیئرز خالی تھیں۔ البتہ لیونگ روم میں مائرہ مل گی وہ کوئی فیشن میگزین دیکھنے میں لگی ہوئی تھی۔ ''پپا ابھی نہیں آئے اور یہ دریکتا کہاں ہے''۔ ''چچا تھوڑی دیر پہلے کسی دوست کی طرف گے ہیں اور دریکتا آنٹی زیبا کی طرف گی ہے کہہ رہی تھی انہوں نے میلاد پہ بلوایا ہے''۔ اُس نے پڑوسیوں میں سے ایک کا نام لیا۔ آنٹی زیبا کا گھر تین گلیاں چھوڑ کر تھا۔ کافی اچھے تعلقات تھے اُن کے ساتھ اس لیے آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ''تم نہیں گئی''۔ ''اصل میں میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے سو نہیں گی''۔ وہ میگزین رکھ کر اُس کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ اب اُن میں اچھی خاصی بے تکلفی ہو گی تھی پر شاہ زیب ایک حد میں ہی رہتا۔ خود وہ بھی اُسے کزن یا آپ کہہ کر ہی بلاتی تھی۔ پر اُس کے ایک ایک عمل اور انداز سے خاص توجہ کا اظہار ہوتا تھا۔ شاہ کہیں سے بھی لوٹ کے گھر آتا تو اُسے چائے پانی کا پوچھتی۔ اگر وہ رات کو لیٹ آتا تو اکثر جاگ رہی ہوتی اُسے کھانے کا کہتی نہ کھایا ہوتا تو اُس کے لیے کھانا گرم کر کے لے آتی۔ اُس سے چھوٹے موٹے کاموں کا پوچھ لیتی۔ یہ سب شاہ زیب کو بہت عجیب بھی لگتا اور اچھا بھی کیونکہ مائرہ کا تعلق اُس خاندان سے تھا جہاں کی لڑکیاں پانی بھی ملازموں سے منگوا کے پیتی ہیں اور خود مائرہ اُس کی خدمت کے لیے بے قرار نظر آتی۔ یہ سب باتیں ایک خاص جذبے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ شاہ زیب پہ کچھ واضح نہیں تھا مگر وہ انجان بھی نہیں تھا۔

''آپ چائے پیو گے''۔ مائرہ کچن کی طرف جا رہی تھی اُسے بھی پوچھ لیا۔ ''ہاں بنوا دو''۔ شاہ زیب نے جیکٹ اُتار کر پاس پڑے صوفے پہ اُچھال دی۔ مائرہ چائے کا کہہ کر واپس آ گی۔ آج پہلی بار دونوں اس طرح بیٹھے تھے کہ ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔ ریڈ کلر کے ٹراؤزر شرٹ میں وہ شعلہ جوالہ لگ رہی تھی۔ سردی اور فلو کی وجہ سے آنکھیں اور ناک بھی سرخ سرخ سی نظر آ رہی تھی مگر اس عالم میں وہ شاہ زیب کو پہلے سے بڑھ کر اچھی لگ رہی تھی۔ ''طبیعت زیادہ خراب ہے کیا'' اُس نے ہمدردی سے پوچھا۔ ''ہاں بس فلو ہے اس وجہ سے سر میں بھی درد ہے''۔ ''تو آرام کرو ناں''۔ اُس نے مشورہ دیا۔ ''آرام ہی تو کر رہی ہوں''۔ مائرہ کے لہجے میں عجیب سی یاسیت رچی تھی۔ شاہ زیب کو محسوس ہوا کہ جیسے کچھ ہے آج سے پہلے اُس نے کبھی مائرہ کو اس طرح نڈھال سا نہیں دیکھا تھا۔ ''کوئی پرابلم ہے تو بتاؤ''۔ شاہ زیب اُس کی طرف قدرے جھکا عین اُسی وقت مائرہ نے اپنا سر اوپر اُٹھایا تو اپنی دھن میں اُس کا سر شاہ زیب سے ٹکرایا۔ اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔ شاہ زیب نے غیر ارادی طور پہ اُس کے لبوں پہ ہاتھ رکھا تو مائرہ نے دوسرا ہاتھ اُس کے کندھے پہ رکھ دیا۔ جیسے سہارا لینا چاہ رہی ہو۔ پل بھر کا تصادم تھا دونوں ایک دوسرے کی دھڑکنیں تک سن سکتے تھے۔ باہر دروازے پہ آہٹ ہوئی شاید کوئی ہوا کا جھونکا تھا جو دروازے سے چھیڑ خانی کر رہا تھا مگر شاہ زیب بہت تیزی سے دور ہوا۔ سارا فسوں چھناکے سے ٹوٹا۔ اُس کے بعد وہ وہاں رُکا نہیں اپنے بیڈ روم میں آ کے ہی دم لیا۔

مائرہ کو اُس رات تیز بخار تھا۔ پر شاہ زیب بھی بے قرار تھا۔ وہ دو بار بہانے سے اُس کے پاس آیا دریکتا مائرہ کے پاس ہی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے چلا گیا۔ پر تھوڑی دیر بعد پھر آ گیا۔ اب کی بار مائرہ اُٹھ کے بیٹھی ہوئی تھی اور دریکتا کچن میں اُس کے لیے سوپ لینے گی تھی۔ ''کیسی طبیعت ہے''۔ بے قراری اُس کے لہجے سے عیاں تھی''۔ ''اب ٹھیک ہو گی

ایسے لگ رہا تھا جیسے چوری کر رہا ہو اور رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا ڈر ہو۔ کچھ بھی تھا سہی مگر اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

مائرہ دو ماہ کے عرصے میں پہلی بار گاؤں گئی تھی۔ شریں اور اورنگزیب اُسے مس کر رہے تھے۔ اورنگزیب اُسے خود لینے آئے تھے۔ وہ چلی آئی۔ حالانکہ دل نہیں کر رہا تھا۔ شاہ زیب بھی گھر نہیں تھا۔ ابو نے پیشگی اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی بس اچانک اُسے لینے آئے تھے۔ ناچار وہ اُن کے ساتھ چلی آئی۔ شریں نے کتنی بار اُسے لپٹایا پیار کیا۔

رات کو ذرا فرصت ملی تو اُسے باتیں پوچھیں۔ ''عمر کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے؟'' شریں نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ ''بہت اچھا وہ بہت خیال رکھتے ہیں میرا''۔ دریکتا کی سناؤ'' ''وہ بالکل بہنوں کی طرح ہے''۔ ''اور شاہ زیب'' شریں کے الفاظ ولہجہ بہت معنی خیز تھا ''وہ بھی ٹھیک ہے''۔ ''یہ تو اچھی بات ہے''۔ شریں مطمئن سی تھی۔

''میری بات یاد رکھنا''۔ یاد ہے مائرہ قدرے خفگی سے گویا ہوئی۔ ''یاد رکھنا تم نے عمر کی بہو بننا ہے۔ ایسا نہ ہو تمہارا حال بھی بینا خالہ کی طرح ہو''۔ ''آپ بینا خالہ کی بات مت کریں میں اُن کی طرح کمزور نہیں ہوں''۔ چلو اچھی بات ہے اگر تم کمزور نہیں ہو۔ ویسے بھی شاہ زیب تمہارے چچا کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جان ہے عمر کی اُس میں۔'' (امی شاہ زیب کی جان عنقریب میرے پاس ہوگی) مائرہ نے بڑے غرور سے یہ جملہ دل میں کہا تھا۔

بینا خالہ کے ماضی کے بابت اُسے ایک ایک بات امی سے معلوم ہوئی تھی۔ لمبے چوڑے شاہ زیب کو دیکھتے ہی ذہن میں کچھ باتیں گڈمڈ ہوئی تھیں۔ عمر زیب چچا نے پہلی شادی اپنی پسند سے کر کے بزرگوں کی روایات کو توڑا۔ پھر آنلہ چچی کے بعد پھر اپنی مرضی سے دوسری شادی کی پر بینا خالہ کے آنسو اور محبت اُنہیں نظر نہ آئے۔ انہیں دوسری بار ٹھکرایا۔ ٹھکرائے جانے کی یہ اذیت بینا کے ساتھ ساتھ پورے گھرانے نے بھی جھیلی تھی۔ ان میں شریں بھی شامل تھی۔ عمر زیب کا یہ جرم ناقابل معافی تھا۔ اب تو اورنگزیب بھی بیوی کا ہم خیال بن چکا تھا۔ چنانچہ وہ بھی عمر کے ساتھ رکھائی سے پیش آنے لگا۔ راحیلہ کی موت بھی اس رکھائی اور سردمہری کی دیوار کو نہ گرا سکی۔ آہستہ آہستہ باقی چھوٹے بھائیوں کی نگاہیں بھی بدلنے لگیں وہ خود ڈھیٹ بن کر اُن کے پاس گاؤں آتا۔ آخری بار تو کسی نے سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔ مجبوراً وہ آنلہ کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر لوٹ آیا۔

اتنے برسوں میں شریں نے اپنی اولاد کو یہی باور کرایا تھا کہ عمر چچا نے زیادتی کی ہے۔ اس بار عمر چچا اکیلے گاؤں نہیں آئے تھے۔ وہ لمبا چوڑا غضب کی وجاہت سمیٹے شاہ زیب بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ شریں بہت محبت سے ملی۔ اورنگزیب کا دل بھی بھائی کی محبت سے لبریز ہوا تھا۔ دریکتا اور شاہ زیب آخر تھے تو انہی کا خون۔ پل بھر میں دلوں کی دوری ختم ہوئی تھی۔ مگر یہ سب عارضی تھا۔

☆☆☆

مائرہ کے شہر جانے کے بعد دونوں چچیاں دل ہی دل میں عمر زیب سے ناراض تھیں کہ عمر نے اُن کی اولادوں کو تو بالکل بھی نہیں پوچھا اور مائرہ کو ساتھ لے گیا ہے۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہی تھی کہ کس طرح دریکتا اُن کی بہو بن جائے تو وہ بھی شریں کے سامنے سر اُٹھا کے بات کر سکیں۔ فوزیہ نے دل ہی دل میں اپنے بیٹے اسجد کے حوالے سے فیصلے بھی کر لیتے تھے۔ اسجد ہوسٹل میں رہ تعلیم حاصل کر رہا تھا وہ بہت آگے تک جانا چاہتا تھا عمر زیب چچا کی طرح اُس کی منزل بھی سب کچھ حاصل کر لینے تک تھی۔ اگر عمر کا داماد بن جاتا تو یہ منزل بڑی آسانی سے حاصل ہو جاتی۔ فوزیہ مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ جب اسجد کے رشتے کے لیے عمر سے بات کرے۔

فرح چچی کی سوچ فوزیہ سے ذرا الگ قسم کی تھی وہ مائرہ کے شہر جانے کے بعد اپنا ارادہ تبدیل کرنے پہ مجبور ہوئی تھی۔ اگر عمر اُن کے بیٹے کو گھر داماد بنا لیتا تو کتنا اچھا ہوتا دریکتا کے ساتھ ساتھ بہت ساری دولت بھی ملتی۔ فوزیہ اور فرح دونوں نے اپنے اپنے مجازی خداؤں اور عمر زیب کے بھائیوں سے بھی بات کر لی تھی۔ انہیں بھی اس رشتے میں کوئی برائی نظر نہیں آ رہی تھی۔ آخر کو عمر چھوٹا بھائی تھا وہ اگر اُسے نہ پوچھتے تو کون پوچھتا۔ خونی رشتوں کا حق تو ہوتا ہے اور وہ اپنا فرض نبھانا چاہتے تھے۔

اس بار عمر کو گاؤں آنے کی دعوت وہ خود دے رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً شہر کے چکر بھی لگا رہے تھے۔ عمر بہت خوش تھا کہ بالآخر اُس کے بھائیوں کو اُس کا احساس ہو ہی گیا ہے۔ برسوں کی دوریاں ختم ہو گی ہیں اور برف پگھل گئی ہے۔

☆☆☆

مائرہ کہیں بھی نہیں نہیں آ رہی تھی۔ شاہ زیب کو عجیب سی کھد بھد لگی ہوئی تھی۔ اُس سے زیادہ دیر رہا نہیں گیا دریکتا سے پوچھ بیٹھا۔ ''مائرہ کہاں ہے کافی دیر سے نظر نہیں آئی ہے''۔ ''بھائی وہ تو تایا ابو کے ساتھ صبح گاؤں چلی گئی ہے۔ وہ لینے آئے تھے کہ سب گھر والے اُسے یاد کر رہے ہیں''۔ دریکتا نوٹ بک پہ جھکے جھکے بولی۔

وہ شاہ زیب کے چہرے پہ پھیلی اداسی کے رنگوں کو نہ دیکھ پائی تھی ورنہ بہت کچھ جان جاتی۔

☆☆☆

مائرہ نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ابو اُسے واپس چھوڑ گئے تھے اور عمر چچا کے ساتھ ساتھ دریکتا اور شاہ زیب کے لیے بہت کچھ لائے بھی تھے۔ شاہ زیب کالج سے آنے کے بعد دوستوں کی طرف نکل گیا تھا۔ وہ آج کل کم ہی گھر ٹکتا تھا کلب کے بعد دوست ہوتے یا پھر بائیک۔ آج بھی وہ اسی شغل میلے میں لگا ہوا تھا۔ مائرہ کو مایوسی ہوئی وہ گھر نہیں تھا۔ وہ اصل میں اُس کے تاثرات جانچنا چارہی تھی کہ اُس کی آمد پہ اُسے دیکھ کے شاہ زیب کس طرح ری ایکٹ کرتا ہے۔ جب وہ گئی تھی تب بھی شاہ زیب نہیں تھا اور ابھی آئی تھی تو تب بھی نہیں تھا۔ خیر اُس نے آنا تو گھر ہی تھا۔ مطمئن سی ہو کر اُس نے اپنے کپڑے الماری میں لٹکائے اور سفر کی دھول مٹی سے پیچھا چھڑانے کی خاطر شاور لینے لگی۔

دریکتا اُسے دوبارہ اپنے درمیان پا کر بہت خوش ہوئی۔ اورنگزیب اُسے یہاں چھوڑ کر زیادہ دیر نہیں رکے گاؤں میں کچھ مسائل تھے وہ اُسے چھوڑ کر ڈرائیور کے ساتھ واپس روانہ ہو گے۔ دریکتا نے خود اُس کے لیے چائے بنائی۔ دونوں نے لان میں بیٹھ کے پی۔ شاہ زیب ہنوز غائب تھا۔ مائرہ نے خود سے اُس کا نہیں پوچھا۔ احتیاط لازم تھی۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی وہ اُس کا کزن تھا وہ اُس کے بارے میں پوچھ سکتی تھی۔ دریکتا نے بھلا کیا کہنا تھا۔ پر مائرہ کے اپنے دل میں چور تھا جو اُسے روک رہا تھا۔

☆☆☆

مائرہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ڈرامہ دیکھ رہی تھی شاہ زیب اُسے دیکھ کر خوشگوار حیرت سے دوچار ہوا۔ ''کب واپس آئی اور اپنے جانے کا بتایا ہی نہیں۔ بے مروتوں کی طرح چلی گئی۔ میں نے کون سا روک لینا تھا؟'' ایک دبا دبا سا شکوہ

شاہ زیب کے لبوں پہ آ ہی گیا۔ وہ ایک سانس میں بول گیا۔ ''آپ روک لیتے تو میں کبھی نہ جاتی''۔ وہ رک رک کر بہ
آہستہ آواز میں بولی تھی۔ شاہ زیب حیرانی سے اُسے تکنے لگا۔ مائرہ نے نظر نہیں چرائی۔ جانے ابھی اُس پہ اپنے محسوسا
کا کون سا در وا ہوا تھا وہ جان ہی نہیں پایا۔ ''اچھا یہ بتاؤ گاؤں میں سب کیسے ہیں''۔ وہ فوراً سنبھل گیا تھا۔ ''ٹھیک ٹھاک
اے ون ہیں سب۔ اور امی نے آپ کے لیے کچھ چیزیں بھجوائی ہیں میں آپ کے کمرے میں رکھ دوں گی''۔ وہ بھی نار
ہو گی تھی۔ ''ٹھیک ہے میں ذرا فریش ہو لوں پھر بات ہوتی ہے''۔ شاہ زیب اُسے کچھ سوچتا چھوڑ کر جا چکا تھا۔

☆☆☆

بہت خوبصورت موسم تھا۔ لاتعداد بدلیاں آسمان پہ جمع ہو کر بھاگتی پھر رہی تھیں مائرہ برآمدے میں بیٹھی مو
سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ دریکتا اندر سوئی ہوئی تھی۔ شاہ زیب بھی کالج سے آنے کے بعد آرام کر رہا تھا۔ عمر زیب اپ
آفس میں تھے۔ موسم کی خوبصورتی جولانی پہ دیکھ کر مائرہ باہر آئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے موٹی موٹی بوندیں گریں اور پیاس
دھرتی کا سینہ سیراب ہونے لگا۔ مائرہ برآمدے سے صحن کی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئی۔ بارش اُس کے پاؤں کو بھگونے لگی۔

شاہ زیب کی آنکھ بارش کی بوندوں سے کھلی۔ اُس نے گلاس ونڈو سے پردہ اُٹھایا۔ سامنے کا منظر واضح تھا۔ ہر
چیز بارش سے نہا رہی تھی۔ مائرہ اس دلفریب منظر کا حصہ بنی برآمدے کے پلر کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ شاہ زیب
چھلانگ مار کر بیڈ سے اُترا۔ اگلے چند سیکنڈز میں وہ بھی مائرہ کے پاس کھڑا تھا۔ ''کیا ہو رہا ہے''۔ ''موسم انجوائے ہو رہا
ہے''۔ وہ دلکشی سے مسکرائی۔ اس سمے شاہ زیب کو وہ موسم کی طرح ہی البیلی نظر آئی۔ بارش کی بوندوں نے اُسے کہیں کہیں
سے بھگو ڈالا تھا۔ کچھ قطرے اُس کے سر کے بالوں میں بھی اٹکے نظر آ رہے تھے۔ کہیں دور آسمان کی لامتناہی وسعتوں میں
بجلی کڑکنے کا زوردار چھناکا ہوا مائرہ کے لبوں سے بڑی زوردار چیخ برآمد ہوئی اور اُس نے شاہ زیب کو اس خوف سے بچنے
کے لیے ڈھال بنا لیا۔ اُس کی نازک گداز بانہوں نے شاہ زیب کا سہارا غیر ارادی طور پر لیا تھا۔ یہ لمس یہ احساس یہ گرفت
یہ مہک شاہ زیب کے لیے بڑی انوکھی اور دلکش سی تھی۔ اُس کے دل نے بے اختیار یہ خواہش کی تھی کہ کاش مائرہ اسی طرح
اُس کی بانہوں کی گرفت میں محفوظ رہے۔ پر ایک لمحہ ہی تو تھا۔ مائرہ کو بہت تیزی سے احساس ہوا کہ وہ اُس کے کس قدر
قریب ہے۔ یہ احساس آنے کی دیر تھی مائرہ اُسے چھوڑ کر منظر سے ہٹی اور اپنے بیڈروم میں آ گئی۔

وہ کتنی دیر وہیں کھڑا مائرہ کے اُس لمس اور اُس مہک کے احساس میں گھرا رہا۔ لمبے لمبے سانس لے کر اُس نے
مائرہ کی معدوم ہوتی خوشبو کو اپنے سینے میں بھرنے کی کوشش کی۔ شعور میں کسی کمی کا احساس ہوا تھا تو تکمیل کی تمنا بھی جاگ
پڑی۔ مائرہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور دل شدت سے اُس کا متلاشی تھا۔

وہ اُس کے بیڈروم کے دروازے پہ رُکا پر اندر داخل نہیں ہوا۔ کچھ سوچ کے واپس مڑ گیا۔ دل انوکھی لے پہ
دھڑک رہا تھا۔ وہ دل میں چھپے جذبوں کو پہچان چکا تھا۔

مائرہ اُس کی اولین چاہت و محبت و آرزو اور خواہش بننے کے مراحل میں تھی۔ وہ پھر رات کے کھانے پہ ہی نظر
آئی۔ مگر اس طرح کے شاہ زیب سے گریزاں اور نظر چرائے ہوئے۔ اُسے عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ شاہ زیب سے رہا نہیں
گیا اُس کے راستے میں کھڑا ہو گیا ''مجھ سے ناراض ہو'' مائرہ نے حیران شکوہ کناں نگاہیں اُوپر اُٹھائیں اور نفی میں سر ہلایا
''پھر مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہی بھاگ کیوں رہی ہو مجھ سے''۔ وہ تھانے داروں والے انداز میں بولا تو مائرہ کی
آنکھوں میں بے بسی سے ڈولتی دکھائی دی ''مجھے نہیں پتہ''۔ ''کیوں نہیں پتہ''۔ ''بس نہیں پتہ ناں''۔ شاہ زیب کو جانے
کیوں اُسے تنگ کرنے میں لطف آ رہا تھا۔ ''کس کو پتہ ہے''۔ ''آپ کو پتہ ہوگا''۔ وہ گریزاں گریزاں سی بہت اچھی لگ
رہی تھی۔ ''نہیں مجھے نہیں پتہ تم بتاؤ ناں''۔ ''آپ کو سب پتہ ہے''۔ شاہ زیب حیران سا ہوا۔ سارے راز اُس ایک ثانیے
میں اُس پہ منکشف ہوئے۔ ایک دوسرے کی چاہت کا راز۔

''بھلا مجھے کیا پتہ ہے''۔ وہ انجان بننے سے گویا ہوا تو مائرہ اُسے دیکھ کر رہ گی۔ وہ وہاں سے ہٹنا چاہ رہی تھی پر
شاہ زیب دیوار بن کے راستے میں حائل تھا ''ہٹیں میں جاؤں''۔ ''اگر میں نہ ہٹوں تو'' شاہ زیب کی چمکیلی آنکھوں سے
خودسری چھلکی تو مائرہ نے دونوں ہاتھوں سے اُسے آگے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ شاہ زیب نے اُس کے دونوں ہاتھ تھام
لیے۔ اس جرأت پہ وہ حیران ہوئی اتنے میں دریکتا اچانک ڈائننگ ہال سے باہر نکلی تو شاہ زیب نے مائرہ کے ہاتھ چھوڑ
دیے مگر وہاں سے جانے سے پہلے وہ اُسے سرگوشی میں کہنا بھولا نہیں تھا کہ ''میں نے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں''۔
مائرہ کی نگاہ اُس کے مضبوط قدموں پہ تھی۔

☆☆☆

نیم تاریک ریسٹورنٹ میں دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ شاہ زیب نے اپنے محسوسات،
خیالات، اور آنے والی تبدیلی سب کچھ مائرہ کی سماعتوں تک پہنچا دیا۔ اُس نے صاف سیدھے نپے تلے انداز میں چاہت
کا اظہار کر دیا۔ مائرہ کافی دیر خاموش رہی جیسے بولنے کے لیے الفاظ جمع کر رہی ہو۔ ''کیا ہماری محبت کو عمر چچا قبول کر لیں
گے؟'' خاصی دیر بعد اُس نے خاموشی توڑی اور وہ عجیب سا سوال کیا۔ کم از کم شاہ زیب کو تو وہ سوال عجیب ہی لگا تھا۔
''کیوں اس میں برائی کیا ہے جو وہ قبول نہیں کریں گے بلکہ انہیں خوش ہونا چاہیے وہ اپنی فیملی سے رشتوں سے بہت محبت
کرتے ہیں میں نے ایک تڑپ دیکھی ہے اُن میں اپنے رشتوں کی محبت کے لیے'' مائرہ نے یقین نہ کرنے والے انداز
میں اُسے دیکھا، آپ لوگ اتنا عرصہ گاؤں نہیں آئے بلکہ چچا آپ کو لائے ہی نہیں خود بھی اُدھر کا رُخ کرنا چھوڑ دیا۔ اور
دونوں چچا ہم کزنز لوگ آپ سے ملنے کی آرزو ہی کرتے رہے۔ عمر چچا کو مگر لگتا ہے کہ پسند نہیں تھا کہ اپنی فیملی سے اپنے
بھائیوں سے قریب ہوں۔ اُنہوں نے تو آپ دونوں بہن بھائی کو بھی نہیں آنے دیا۔'' مائرہ کا لہجہ کاٹ دار تھا۔ شاہ زیب
اُس کی کہی باتوں میں حقیقت ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا''۔ ''بہر حال میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا
ہوں۔'' اُس نے پل بھر میں فیصلہ کیا اور مائرہ کو بتا بھی دیا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا کیونکہ چچا کبھی نہیں مانیں گے۔'' اُس نے
شدت سے نفی میں سر جھٹکا۔ ''وہ مانیں گے ضرور مانیں گے''۔ شاہ زیب کا انداز قطعی بے لچک تھا۔ ''آپ کہہ کر دیکھ لیں
اُس کے بعد جو طوفان آئے گا آپ بھی دیکھ لیں گے''۔ ''ارے کون سا طوفان آئے گا پتہ نہیں کیا کیا بول رہی ہو۔ مجھے تو
بس اتنا پتہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں''۔ ''شاہ زیب مجھے ڈر لگ رہا ہے اُس وقت سے جب ہم دونوں کو اپنے اپنے
ٹوٹے دل کی کرچیاں سمیٹنی پڑی گئیں۔ عمر چچا کی آنکھوں میں مَیں نے اپنے گھرانے کے لیے بیگانگی اور بے رُخی دیکھی
ہے۔ وہ کبھی نہیں مانیں گے''۔ ''وہ مائرہ تمہاری غلط فہمی ہے یہ۔ پپا اپنی فیملی سے اپنے بھائیوں سے بہت محبت کرتے
ہیں''۔ ''اگر وہ محبت کرتے ہیں تو اتنا عرصہ اُنہوں نے خود کو آپ لوگوں کو اپنوں سے دور کیوں رکھا۔ دوسری شادی کے بعد
تو وہ گاؤں سے بالکل ہی کنارہ کش ہو گے تھے۔ اتنے عرصے بعد وہ آپ دونوں کو گاؤں لائے۔ کبھی سوچا ہے کبھی پوچھا
اُن سے''۔ وہ ایک سانس میں بولے گی۔ شاہ زیب کے ماتھے پر تفکرات کی لکیریں نمایاں ہونے لگی۔ مائرہ پتہ نہیں کیا کیا
بول رہی تھی جو بھی تھا شاہ زیب سوچنے پہ مجبور ہو رہا تھا۔

اظہارِ محبت کے بعد وہ ہلکا پھلکا تو ہو گیا تھا پر ایک اور بوجھ ذہن و دل پہ سوار ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ویٹر بل لایا تو وہ پے کر کے اُٹھ کھڑا ہوا ساتھ ہی مائرہ کو بھی اشارہ کیا۔ اُس کی تقلید میں مائرہ نے بھی با جانب قدم بڑھائے۔

آج کا سارا دن شاہ زیب کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ بہت مطمئن تھی۔ کتنی جلدی یہ مشکل مرحلہ بھی گیا تھا۔ شاہ زیب نے خود محبت کا اظہار کر کے اُس کے غرور میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ گاؤں کی پروردہ ایک عام سی نے لمبے چوڑے خوبرو شاہ زیب کو اپنا اسیر بنا ہی لیا تھا۔ بینا خالہ تو ناکام رہی تھی پر جیت اُس کے حصے میں آئی تھی۔ و بھی خوشی مناتی کم تھی۔

پہلی نظر میں ہی شاہ زیب کو دیکھ کر اُس کا دل دھڑکا تھا۔ وہ نظر انداز کے لیے جانے کے قابل بھی تو نہیں اُس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ شاہ زیب اس طرح اُسے محبت کرنے لگے گا۔ خود شاہ زیب کے اپنے کا ایک سے ایک خوبصورت اور طرحدار لڑکی تھی۔ اُس کا دل مائرہ پہ آیا۔ اُسے نسوانی لمس اور حدت سے روشناس کرانے مائرہ ہی تو تھی۔ یہ لمس یہ حدت یہ نرمی شاہ زیب کے لیے بہت انوکھی اور سربستہ سی تھی۔ اور وہ روز بروز اُس میں اضاف جا رہی تھی۔ شاہ زیب کا دل اُسے کھوجنے کے لیے مچلتا پر وہ چکنی مچھلی کی طرح پھسل پھسل جاتی۔ اتنی عمر کی نہیں تھی پر سمجھ تھی اور نسوانیت کی قدر و قیمت سے آگاہ بھی تھی۔ تب ہی تو وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔

کتنی بار تنہائی میسر آئی تھی۔ اس عالم میں وہ شاہ زیب کو انجان پنے میں چھو لیتی اور پھر بیگانگی سے پیچھے جاتی۔ کہ جیسے اُسے کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ اُس کی دانستہ چشم پوشی اور بناوٹی مصنوعی معصومیت شاہ زیب کے دل پہ قیا ڈھاتی۔ وہ بہت مشکل سے ضبط کرتا۔ شوریدہ مچلتا گرم خون رگوں میں رواں تھا۔ وہ اپنے ہی جذبوں کی بے تابی و سے سہم جاتا اور اُدھر مائرہ یوں ری ایکٹ کرتی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

☆☆☆

''دریکتا تیار ہو رہی تھی اُس کی فرینڈ کی برتھ ڈے تھی۔ شاہ زیب نے کہا تھا جب تیار ہو جاؤ مجھے اُٹھا لینا جب تک تھوڑی دیر آرام کر لوں۔''

سو وہ بے فکر تھی۔ اس لیے آرام و سکون سے تیار ہوئی۔ آئینے میں خود کو دیکھا مطمئن سی تھی کہ اچھی لگ ہوں۔ اب شاہ زیب کو اُٹھانا تھا اُس نے بھی تو چینج کرنا تھا۔ اُس نے گنگناتے ہوئے دروازہ ناک کیا تو وہ ہاتھ کے سے ایک دم کھل گیا۔ اندر کا منظر حیران کن تھا۔ مائرہ شاہ زیب کے بہت قریب کھڑی اُس کی ٹائی کی ناٹ باندھ رہی تھی انداز میں جنم جنم کی بے تکلفی اور اپنائیت تھی۔ آہٹ سے وہ دونوں بیک وقت اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔ مائرہ کے ما سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ وہ بھاگنے والے انداز میں دریکتا کے پاس سے گزر کر باہر آ گئی۔ شاہ زیب بھی بہت شرمندہ لگ تھا۔ گاڑی میں بھی وہ اس سے نظر نہیں ملا پا رہا تھا۔

مائرہ خود ہی اُس کے بیڈ روم میں آئی تھی۔ وہ چینج کر کے پرفیوم اسپرے کر رہا تھا جب وہ اُس کے قریب بڑے آرام سے پرفیوم کی بوتل اُس کے ہاتھ سے لی اور خود اسپرے کرنے لگی۔ اُس کے بال برش سے سنوارے۔ مائ انداز بہت عام اور نارمل سا تھا۔ جیسے اس بات اور اس قربت کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ ''ٹائی کی ناٹ ڈھیلی ہے میں

کرتی ہوں۔'' ٹائی کی ناٹ باندھنے کے بہانے دوری کچھ اور بھی کم ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ شاہ زیب بے خود ہوتا آہٹ ہوئی اور وہ حواسوں میں واپس آ گیا۔ مائرہ بڑی تیزی سے باہر نکلی۔ وہ ندامت سے نگاہیں جھکا کے رہ گیا۔

''میں تمہیں نو بجے تک پک کر لوں گا۔'' دریکتا کو ڈراپ کر کے گاڑی موڑ کر وہ فقط یہی کہہ سکا۔ دریکتا بہت چپ چپ سی تھی۔ مائرہ کے انداز بہت عجیب سے ہو رہے تھے۔ وہ اکثر نوٹ کرتی۔ شاہ زیب کے کپڑے دُھل کے آتے تو وہ پریس کرنے کھڑی ہو جاتی۔ وہ گھر میں ہوتا تو مائرہ پاس ہی بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھی چائے اور کبھی کھانے کا پوچھتی۔ اس کے ایک ایک عمل سے کوئی خاص چیز چھلکتی۔ دریکتا جسے کوئی نام دینے سے قاصر تھی۔ اور آج اُس نے جو منظر دیکھا تھا وہ ہضم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ اتنی قربت اتنی اپنائیت مائرہ کے انداز میں اتنا استحقاق جیسے جنم جنم کی بے تکلفی ہو۔ جب وہ یہاں شروع میں آئی تو اتنی چھپی چھپی سی رہتی خاموش خاموش۔ اُس کا یہ روپ دریکتا کے لیے حیران کن تھا۔

پارٹی میں بھی وہ اسی معاملے کو سوچتی رہی اور ٹھیک طرح سے انجوائے بھی نہ کر سکی۔ آج کل فائنل ایگزامز کے بعد چھٹیاں تھیں۔ اُس کے بعد رزلٹ متوقع تھا تب اُس نے سوچنا تھا کہ کیا کرے۔ اُس دوران وہ فارغ ہی تھی۔ مائرہ بھی ایگزام دے چکی تھی۔ پپا نے کہا تھا کہ جب مائرہ گاؤں جائے تو تم بھی ساتھ چلی جاؤ۔ جب انہوں نے کہا تھا تب وہ خوش تھی پر اب دل بجھا بجھا سا تھا۔

☆☆☆

مائرہ واپسی کے لیے تیار تھی۔ عمر بھی دو دن کے لیے ساتھ ہی گاؤں جا رہے تھے۔ شاہ زیب بھی تیار تھا۔ اس لیے دریکتا کو اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ سو وہ بھی جا رہی تھی پر بکل دل کے ساتھ۔

اس باران کا استقبال پہلے سے بھی بڑھ کر والہانہ انداز میں ہوا۔ گرمجوشی سب کے رویوں میں نمایاں تھی۔ رات کا کھانا فرح چچی کی طرف تھا حالانکہ اورنگزیب نے کہا تھا کہ رات کا کھانا سب اِدھر ہی کھائیں گے۔ پر بھائی اور بھاوج کے سامنے اُن کی ایک نہیں چلی۔ فرح اور نوید بڑی محبت اور اصرار سے اُن تینوں کو اپنی طرف لے آئے۔

البتہ سونے کا انتظام تایا اورنگزیب کے گھر ہی تھا۔ فرح چچی نے کئی بار دریکتا سے اصرار کیا کہ رات اُن کے گھر ہی رہے پر مائرہ اُسے اپنے ساتھ لے آئی۔

☆☆☆

عمر زیب کے ساتھ باقی تینوں بھائی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑے اچھے ماحول میں بات چیت ہو رہی تھی۔ اچانک ہی گفتگو کا رُخ دریکتا اور شاہ زیب کی طرف مڑ گیا۔ ''کیا سوچا ہے دریکتا کے بارے میں'' یہ سوال نوید بھائی کی طرف سے آیا۔ ''بھائی نوید میں آپ کا سوال نہیں سمجھ پایا ہوں'' عمر زیب نہ سمجھ آنے والے انداز میں انہیں تکنے لگے۔ ''ارے بھائی میرا مطلب ہے کہ دریکتا خیر سے سیانی ہو گئی ہے خیر سے اُس کی شادی کے بارے میں بھی سوچا ہے کہ نہیں''۔ اب کے انہوں نے کھل کے اپنا سوال دہرایا۔ ''ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے جب تعلیم سے فارغ ہو گی تو دیکھا جائے گا''۔ عمر نے سکون سے جواب دیا۔ ''بیٹیاں سیانی ہو جائیں اور جب رشتے موجود ہوں تو اس فریضے کو جلدی ادا کر لینا چاہیے۔'' یہ ہارون بھائی بولے تھے۔ ''کر لوں گا پہلے پڑھ لکھ تو جائے۔'' عمر نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ''کوئی منگنی وغیرہ کوئی بات تو پکی کر لو۔ پڑھائی کا کیا ہے بعد میں چلتی رہے

گی۔ دریکتا کے لیے کون سا رشتوں کی کمی ہے اپنا اسجد ہے۔ دیکھا بھالا ہے پڑھ رہا ہے ابھی۔ تعلیم مکمل ہونے پہ شادی ہو جائے گی''۔ نوید بھائی کی بات اتنی مشکل نہیں تھی کہ عمر کی سمجھ میں نہ آتی۔ اب ہارون بھائی بھی بول پڑے قاسم بھی تو ہے اسجد سے بڑا لائق فائق ہے۔ پھر عمر جس کو اپنی بیٹی کے لیے پسند کرے۔ ''ہاں تم لوگ ٹھیک کہہ رہے ہو۔ شاہ زیب اور دریکتا کی شادی خاندان میں ہی ہونی چاہیے۔ رشتے اپنے خاندان میں موجود ہوں تو باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ گھر کی دولت وعزت گھر میں ہی رہے تو اچھا ہے''۔ اورنگزیب بھائی بھی گفتگو میں شامل ہو گئے۔ عمر کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ سو چپ ہو کے ہر بات پہ سر ہلاتا رہا۔

☆☆☆

سب سے زیادہ شاہ زیب یہاں آکر خوش تھا۔ شریں تائی کی خصوصی توجہ ومحبت اُسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ یہاں آکے مائرہ سے باتیں کرنے کے بے شمار مواقع اور آزادی اس کے علاوہ تھی۔ کوئی پوچھنے اور دیکھنے والا نہیں تھا۔ دوپہر میں مائرہ کے ساتھ وہ متروک ڈیرے کی طرف نکل گیا۔ اتنے دنوں کی بے تابیاں اکٹھی تھیں جذبوں کو اظہار اور قبولیت کا راستہ مل رہا تھا اور مائرہ حوصلہ افزائی بھی کر رہی تھی پر ایسے جیسے کسی پیاسے کو کنویں کے پاس لا کر کھڑا کر دیا جائے اور پانی پینے بھی نہ دیا جائے۔ عجیب اختیار اور بے اختیاری تھی۔

''کب بات کریں گے رشتے کی عمر چچا سے۔'' وہ امید کے دیئے جلائے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''بہت جلدی کروں گا نہ فکر کرو۔ پپا کا موڈ دیکھوں گا پہلے اُس کے بعد دیکھوں گا کہ یہ بات کس طرح کی جائے''۔ ''آپ تو کہہ رہے تھے کہ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے اور اب کہہ رہے ہیں کہ موڈ دیکھ کر بات کروں گا۔ کیا کہوں میں اس پہ''۔ وہ نروٹھے پن سے گویا ہوئی۔ تو شاہ زیب پریشان ہو گیا۔ مائرہ کے ماتھے کے بل اُس کی جان نکال لیتے تھے جیسے۔ ایسا ہی جنونی اور انتہا پسند تھا وہ اپنے جذبوں میں ''اچھا ناں جلد بات کروں گا۔ صبر نہیں ہو رہا ہے کیا؟'' وہ شرارت پہ اُتر آیا۔ ''میں تو صبر کر ہی رہی ہوں آپ سے ڈر لگتا ہے کہ آپ کی بے صبری و بے قراری مجھے کسی مشکل میں نہ ڈال دے۔'' وہ بڑے ناز سے ابرو چڑھا کر نشیلی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ ''تمہاری عزت مجھے ہر چیز سے پیاری ہے کبھی آنچ نہیں آنے دوں گا''۔ یک لخت وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ''تو پھر چلیئے گھر ایسا نہ ہو کہ اعلان گمشدگی نشر ہو رہا ہو''۔ مائرہ کے احساس دلانے پہ اُسے وقت گزرنے کا پتہ چلا تو وہ چونک گیا۔ ''اچھا آؤ گھر چلیں''۔ ''اگر کسی نے پوچھ لیا کہ کہاں گے تھے تو کیا کہیں گے''۔ وہ اُسے امتحان میں ڈالنے والے سوال کر رہی تھی۔ ''کہہ دوں گا کچھ نہ کچھ آؤ چلیں''۔ شاہ زیب نے اپنا ہاتھ اُس کے سامنے پھیلا دیا۔ مائرہ نے بلا جھجک اپنا ہاتھ اُسے تھمایا۔ شاہ زیب کی نگاہوں میں محبت کے اَن گنت رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

مائرہ نے آنکھ چرالی۔

☆☆☆

دو دن گزر چکے تھے۔ تیسرے دن عمر نے واپسی کا مقصد کیا تو دریکتا بھی اُس کے ساتھ تیار ہو گی۔ شاہ زیب کا موڈ کچھ دن مزید رُکنے کا تھا اس لیے عمر اور دریکتا واپس آ گئے۔ پپا اُسے کچھ پریشان سے لگ رہے تھے۔ مگر پوچھنے پہ ٹال گے۔ دوبارہ اُس نے بھی جرح نہیں کی خاموش ہو گی۔ شاہ زیب کی طرف سے اُلجھن سی تھی۔ کہاں وہ گاؤں کا نام سننا پسند نہیں کرتا تھا اور اب اُدھر رکنے کے لیے بے قرار تھا۔ اُس کی بے قراری کا سبب دریکتا اچھی طرح جان گی تھی۔ سبب بڑا مضبوط تھا۔ مائرہ ہی وجہ تھی۔ جو وہ اُدھر رک گیا تھا۔ جو کچھ دریکتا جانتی اور دیکھتی تھی عمر اُس سے لاعلم تھے۔ وہ تو شاہ زیب

اور مائرہ کی بڑھتی دلچسپی سے بھی واقف نہیں تھے۔ دریکتا حساس فطرت کی تھی بہت سی باتیں خود ہی محسوس کر لیتی تھی اور دل ہی دل میں کڑھتی تھی۔ مائرہ کی جب سے شاہ زیب میں دلچسپی بڑھنی شروع ہوئی تھی تب سے مائرہ کی بات چیت اُس سے بہت کم ہو کر رہ گئی تھی۔ زیادہ تر وہ اپنے کمرے میں ہی بند رہتی تھی۔ اس تبدیلی سے بھی وہ اَپ سیٹ تھی۔ حالانکہ مائرہ کے یہاں آنے پہ سب سے زیادہ خوشی اُسی کو ہوئی تھی۔ اور اب مائرہ ہی اُسے اگنور کر رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ کیوں ایسے کر رہی تھی۔ دریکتا مسلسل اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆☆☆

آفس سے واپسی پہ عمر اپنے دوست طاہر لغاری کی طرف چلے گے۔ اُن کے ذہن پہ بہت بوجھ تھا۔ اپنا ہر مسئلہ وہ طاہر سے ڈسکس کر لیتے تھے۔ عمر کی پوری زندگی اور خاندان سے طاہر اچھی طرح واقف تھے۔ عمر بھی اُس پہ بے پناہ اعتبار کرتے تھے۔ راحیلہ کے ساتھ عمر کی شادی میں طاہر ہی پیش پیش رہے تھے۔ طاہر لغاری کے ساتھ اُن کے مضبوط دوستانہ گھریلو تعلقات بھی تھے۔ ان مضبوط تعلقات کی ایک وجہ کچھ ملتی جلتی باتیں بھی تھیں۔ طاہر کی بیگم بھی ایک حادثے میں اُس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ ایسی ہی کیفیت اور مسئلہ عمر کے ساتھ بھی تھا سو اُن کے خیالات میں بھی کافی حد تک ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔

گاؤں سے واپسی کے بعد عمر کے پاس کافی باتیں جمع ہو گی تھیں جو اُن کے خیال میں طاہر سے ڈسکس کرنا ضروری تھیں۔

طاہر لغاری اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ''بڑے دن بعد چکر لگایا ہے''۔ وہ عمر سے بغل گیر ہوئے اور پھر الگ ہو کر اُسے صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''سات دن ہی تو ہوئے ہیں اتنا زیادہ ٹائم تو نہیں گزرا''۔ وہ پھیکے سے انداز میں زبردستی مسکرائے۔ ''کیا بات ہے اَپ سیٹ سے لگ رہے ہو؟'' طاہر فوراً تاڑ گئے کہ کوئی بات ہے''۔ میں گاؤں گیا تھا۔ سنڈے کو دو دن رہا ہوں۔ شاہ زیب ابھی تک اُدھر ہی ہے۔ ''انہوں نے بات کا آغاز کیا''۔ یہ تو اچھی بات ہے تم گاؤں گئے ہو۔ مگر تمہیں خوش نظر آنا چاہیے اپنوں سے مل کر تمہاری خوشی کئی گنا بڑھ جاتی ہے لیکن تم آج خوش نظر نہیں آرہے ہو۔ ''نہیں طاہر خوش تو ہوں ....'' وہ بولتے بولتے رُک گئے۔ طاہر اس دوران اُسے دیکھتے رہے کہ وہ خود سے کوئی بات کرے اور اُن کا یہ عمل عمر کو بولنے پہ آمادہ کر دیتا تھا۔ اس بار بھی اُنہیں پریشانی نہیں ہوئی عمر نے ساری بات بتا دی۔ ''طاہر میرے بھائی کہہ رہے ہیں کہ مجھے شاہ زیب اور دریکتا کا رشتہ خاندان میں ہی طے کرنا چاہیے۔ اورنگزیب بھائی نے کہا ہے کہ خاندان کی عزت اور دولت خاندان میں ہی رہنی چاہیے۔ سچ پوچھو تو میں پریشان سا ہوں۔ جانے کیوں میرے دماغ میں بُری بُری باتیں جنم لے رہی ہیں۔ خاص طور پہ اُن کی یہ بات میرے ذہن میں اٹک کے رہ گئی ہے خاندان کی عزت اور دولت والی''۔ ''تم آرام وسکون سے سوچو سب کے رویئے دیکھو اور اُس کے بعد جو فیصلہ کرنا ہے کرو''۔ طاہر نے مناسب مشورہ دیا۔ ''میری دوسری شادی کے بعد پورے خاندان نے مجھ سے ملنا ملانا اور آنا جانا ختم کر دیا تھا۔ میں خود ہی ڈھیٹ بن کے جاتا تھا۔ اپنے بچوں سے ہر بات چھپائی تا کہ نفرت کے شعلے کہیں اُن کے دامن کو جلا نہ دیں۔ درمیاں میں بھائیوں اور بھابیوں کے تلخ رویئے کی وجہ سے کافی عرصہ میں گاؤں جانے کی جرأت ہی نہ کر سکا۔ اور نہ ہی اُدھر سے کبھی کسی نے آ کر میرا حال احوال پوچھنے کی ضرورت سمجھی۔ اتنے عرصے کے بعد گاؤں گیا تو اپنے بچوں کو لے گیا۔ سب نے بات کی مجھ سے۔ لیکن اب ایک دم سے بچوں کے رشتے کی بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی ہے۔ کہاں تو کوئی

مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا اور کہاں اب بچوں کے رشتے طے کرنے کی بات ہو رہی ہے۔ میرے بچے ہی میرے لیے سب کچھ ہیں۔ میں نے اپنوں کی نفرتیں اور بیگانگی سہی ہے نہیں چاہتا اس کا نشانہ میری لاولاد بنے''۔ بولتے بولتے عمر جذباتی ہو گئے اور آواز بھی بھرا گئی تو طاہر نے اپنا بازو اُس کے کندھے کے گرد حمائل کر دیا۔ ''فی الحال خاموش رہو اور دیکھو۔ تمہاری اولاد ہے تمہیں اپنی اولاد کے معاملے میں پوری طرح اختیار اور آزادی ہے۔ جہاں تمہارا دل چاہے اُن کے مستقبل کا فیصلہ کرو۔ اور پریشان مت ہو مرد بنو کیا عورتوں کی طرح ٹسوے بہانا شروع کر دیئے ہیں''۔ طاہر نے جان کر طنز کیا اور واقعی عمر نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا۔ ''اور سناؤ اشعر کیسا ہے بات ہوتی ہے تمہاری''۔ ''ہاں ہوتی ہے ٹھیک ہے وہ بھی۔ اپنی جاب میں مصروف ہے کہتا ہے اِدھر آ کر پولیس ڈیپارٹمنٹ ہی جوائن کرے گا''۔ ''یہ تو اچھی بات ہے اشعر بہت سمجھدار اور بہادر ہے خطروں سے بے نیاز اور نڈر۔ اُس کے لیے یہی مناسب ہے''۔ عمر نے سراہا۔ طاہر نے ہونٹوں سے سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ طاہر نے چائے کے ساتھ خاصا اہتمام کر لیا۔ یہی وجہ تھی جب عمر زیب گھر واپس آئے تو کھانے کی حاجت ہی نہیں تھی۔ دریکتا نے اکیلے ہی کھانا کھایا۔

☆☆☆

مائرہ چھٹیوں کے بعد گاؤں سے آ گئی تھی اور شاہ زیب پہ زور دے رہی تھی کہ عمر چچا سے اپنے اور اُس کے رشتے کی بات کرے۔ کیونکہ اُس کی بینا خالہ بھی اپنے بیٹے کے لیے اُس کا رشتہ مانگ رہی تھی۔ باسط مائرہ سے تین سال بڑا تھا۔ بینا کی بڑی آرزو تھی کہ مائرہ اُس کی بہو بنے۔ مگر شریں کا ارادہ کچھ اور تھا۔ اُس کی نگاہ شاہ زیب پہ تھی۔ اُدھر مائرہ نے باسط کے رشتے کا بتا کر شاہ زیب کو پریشان کر دیا تھا۔ مائرہ نے کہا تھا کہ امی ابو ہاں کر دیں گے اگر آپ کی طرف سے خاموشی رہی۔

''میں آج پپا سے بات کرتا ہوں''۔ وہ مائرہ کو تسلی دے کر پپا کے بیڈ روم کی طرف آ گیا مگر وہ وہاں نہیں تھے۔ معاً اُسے یاد آیا کہ اس وقت وہ اسٹڈی روم میں ہوں گے۔ اُس نے اُدھر کا ہی رُخ کیا۔ وہ مطالعے میں مگن تھے۔ شاہ زیب اُن کے سامنے رُکا تو وہ چونک گے۔ جانے کیا بات تھی جو اس وقت وہ اُن کے پاس آیا۔ کیونکہ جب وہ اسٹڈی روم میں ہوتے تو سختی سے کہتے کہ مجھے ڈسٹرب مت کیا جائے۔ شاہ زیب کے چہرے پہ بے پناہ سنجیدگی اور اضطراب تھا۔ عمر پریشان ہو گئے اور کتاب بند کر کے رکھ دی۔ ''پپا آپ سے ایک بات کرنی ہے''۔ وہ کہتے ہوئے کچھ ہچکچاہٹ کا شکار ہونے لگا۔ ''خیریت تو ہے اس وقت کون سی بات کرنی ہے جو تم نے صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اور کہتے ہوئے گھبرا بھی رہے ہو''۔ ''پپا میں مائرہ سے محبت کرتا ہوں اور اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں''۔

اُس نے تمام تر حوصلہ جمع کر کے کہہ ہی دیا۔ اُدھر عمر حیران حیران نگاہوں سے اُسے تکتے رہ گے جیسے یہ توقع نہ کر رہے ہوں کہ وہ بھی یہ بات کر سکتا ہے۔ باہر اسٹڈی روم کے دروازے کے ساتھ مائرہ چپکے سے کھڑی تھی۔ وہ شاہ زیب کے پیچھے آئی تھی۔ وہ خود اپنے کانوں سے سننا چاہتی تھی سب کچھ۔ شاہ زیب نے اپنی بات کر دی تھی اب اندر خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔ ایک سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ ''تمہارے ذہن میں یہ بات کیسے آئی اور ابھی تمہار عمران باتوں کے قابل نہیں ہے۔ بیس سال کے بھی نہیں ہوئے ہو پورے اور شادی کی بات کر رہے ہو''۔ عمر زیب بڑے تلخ انداز میں گویا ہوئے۔ باہر کھڑی مائرہ سر تا پا سلگ اُٹھی۔ ''عشق عاشقی کے چکر سے نکل آؤ اپنی تعلیم پہ توجہ دو اور جاؤ اپنے بیڈ روم میں''۔ عمر قطعی بے لچک اور ٹھوس انداز میں بولے۔ شاہ زیب کے کندھے جھک سے گئے وہ تھکے تھکے قدموں سے باہر نکلا۔ مائرہ تیزی سے دروازے کی اوٹ میں ہو گی۔ شاہ زیب اُس کی وہاں موجودگی سے بے خبر آگے بڑھ گیا۔ جب وہ اپنے کمرے

میں گھسا مائرہ تب دروازے کی اوٹ سے باہر نکلی۔ اُس کے تو پورے وجود میں آگ لگ گئی تھی۔ عمر چچا نے شاہ زیب کی اچھی خاصی انسلٹ کر دی تھی اور اُس کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلا تھا۔ ''بزدل کہیں گا''۔ اُس نے بڑے تنفر سے یہ لفظ ادا کیے۔ وہ ابھی اور اسی وقت شاہ زیب سے اس بزدلی کی بابت بات کر کے شرم دلانا چاہتی تھی مگر رات کافی ہو گئی تھی اور اُسے غصہ بھی بہت زیادہ آیا ہوا تھا۔ وہ بات کرتی تو لازماً اُس کی آواز اونچی ہو جاتی اور پھر کوئی نہ کوئی جاگ جاتا۔ سب کو پتہ چلتا اور بات بڑھتی۔ وہ ہرگز ایسا نہیں چاہتی تھی بلکہ خاموشی سے سب کام انجام ہوتا دیکھنے کی خواہش مند تھی۔

گھر میں شاہ زیب سے بات نہیں ہو سکتی تھی اس موضوع پہ۔ کیونکہ دریکتا اور پھر عمر زیب موجود ہوتے۔ اس بات کو کرنے کے لیے سکون فراغت اور تنہائی درکار تھی۔ سو اس کے لیے باہر ہی کوئی جگہ مناسب تھی۔ جہاں کسی کے مخل ہونے کا امکان نہیں تھا۔ وہ آنکھیں موند کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی کیونکہ نیند تو آ کے نہیں دے رہی تھی۔

دوسری طرف عمر زیب اور شاہ زیب بھی جاگ رہے تھے۔ عمر کی پریشانی اپنی جگہ تھی۔ شاہ زیب نے اُس کے سامنے کھڑے ہو کر محبت اور شادی کی بات کی تھی۔ شاہ زیب کی پریشانی اپنی نوعیت کی تھی کہ پپا نے اُس کی بات ہی نہیں سنی ہے اُلٹا انسلٹ کر دی ہے۔ تینوں نفوس اپنی اپنی جگہ خود کو حق بجانب تصور کر رہے تھے۔

☆☆☆

مائرہ اور شاہ زیب کالج جانے کے بجائے قریبی ریسٹورنٹ میں آ کے بیٹھ گئے۔ یہاں فیملی کیبن بھی تھے۔ وہ دونوں بھی ایک ایسے ہی کیبن میں موجود تھے۔ دریکتا کو ڈراپ کر کے دونوں نے یہاں بیٹھ کر بات کرنے کا پروگرام بنایا۔

مائرہ بہت پریشان پریشان سی لگ رہی تھی۔ شاہ زیب کی اپنی حالت اُس سے مختلف نہیں تھی۔ رات بھر اُسے نیند نہیں آئی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ مائرہ نے اُس پہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ رات عمر چچا اور اُس کے مابین ہونے والی گفتگو وہ سن چکی ہے۔ ''آپ نے چچا سے بات کی رات کو......'' شاہ زیب نے سر جھکا لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مائرہ اُس کے چہرے کے تاثرات میں موجود شکست کی کوئی تحریر پڑھ سکے۔ ''ہاں کی تھی'' خاصی دیر بعد وہ گویا ہوا۔

''کیا کہا آپ نے اور پھر چچا نے کیا جواب دیا؟'' وہ ایک بار پھر نگاہیں چرانے لگا۔ ''میں نے بات کی پپا سے وہ کہتے ہیں ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہوئے ہو پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو''۔ وہ کہتے ہوئے بہت شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ مائرہ کے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ رینگنے لگی۔ ''شاہ زیب میں نے آپ کو پہلے ہی کہا تھا کہ عمر چچا کبھی نہیں مانیں گے۔ مجھے اُن کے انداز میں اپنی ساری فیملی کے لیے ایک عجیب اور بے نام سی نفرت نظر آتی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ کبھی مانیں گے۔ ٹھیک ہے امی ابو باسط کے لیے ہاں کر دیں گے۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ نے تو اپنی طرف سے کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کے رہے گا۔ آپ شاید میری قسمت میں نہیں ہیں۔ اس لیے ابتدائی مرحلے میں ہی انکار ہو گیا ہے۔ ویسے بھی بینا خالہ امی کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں کہ جلدی سے ہاں کر دیں''۔ شاہ زیب کے دل پہ باسط کے نام سے چھریاں سی پھر گئیں جیسے تڑپ ہی تو اُٹھا۔ ''پپا کو ماننا ہو گا۔ تم میری محبت ہو۔ تمہارے لیے مجھے اگر پپا کو چھوڑنا پڑا تو وہ چھوڑ دوں گا''۔ ''اتنا حوصلہ اور ہمت ہے آپ میں''۔ مائرہ اُسے آزما رہی تھی۔ ''حوصلہ اور ہمت بہت ہے وقت آنے پہ تم بھی دیکھ لو گی''۔ اُس کے لہجے میں پختہ چٹانوں کا سا عزم تھا۔ ''اور کون سا وقت آئے گا بینا خالہ چکر پہ چکر لگا رہی ہیں اور اِدھر عمر چچا مان ہی نہیں رہے ہیں''۔ وہ جھنجلا اُٹھی۔ ''کہا ناں نہ پریشان ہو۔ بہت جلدی تم میری ہو گی۔ پپا کو ماننا ہو گا سب کچھ میں عاقل و بالغ ہوں۔ وہ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے نہ میں

اُن کی مانوں گا۔ میری اپنی زندگی ہے اپنی خواہشات ہیں۔ کسی کو بھی اپنے ساتھ اپنے جذبات کے ساتھ کھیلنے یا تماشہ کرنے کی اجازت نہیں دوں گا بے شک وہ پپا ہی کیوں نہ ہوں۔ میں ان سے اُن کی نفرت کا سبب بھی پوچھوں گا''۔ اس سمے وہ بہت خودغرض اور سنگدل سا نظر آ رہا تھا۔ سرشاری مائرہ کی رگ وپے میں دوڑنے لگی۔ منزل دور نہیں تھی۔ شاہ زیب چٹانی عزائم رکھتا تھا۔ اُس نے اپنی منوا کے چھوڑنی تھی۔ مائرہ کو یقین ہو چلا تھا۔

☆☆☆

دریکتا بے چینی سے شاہ زیب کا انتظار کر رہی تھی وہ اُسے ابھی تک لینے نہیں آیا تھا۔ چھٹی ہوئے بھی آدھ گھنٹہ ہو رہا تھا۔ اُس نے چوتھی بار رسٹ واچ پہ وقت کا اندازہ لگایا تھا۔ اُدھر شاہ زیب ابھی تک مائرہ کے ساتھ تھا۔ اُسے تیزی سے بھاگتے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا کہ دریکتا اُس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ مائرہ نے ہی کہا کہ دریکتا کو چھٹی ہو چکی ہوگی۔ تب ہی اُسے ہوش آیا اور وہ تیزی سے کی چین اُٹھا کر گاڑی کی سمت لپکا۔

دریکتا اُسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اُسے تاخیر سے آنے کا سبب اُس نے نہیں پوچھا۔ بلکہ خاموشی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ مائرہ خلاف توقع آج اگلی سیٹ پہ بیٹھی تھی۔ ورنہ وہ بھی اُس کے ساتھ پیچھے ہی بیٹھتی تھی۔

واپسی کا سفر خاموشی سے طے ہوا۔ نہ مائرہ نے کوئی بات کی اور نہ ہی دریکتا یا شاہ زیب میں سے کوئی بولا۔

شاہ زیب گاڑی میں چابی یونہی لگی چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ مائرہ بھی بیگ اُٹھا کر اُتر گئی۔ اُن دونوں کا رویہ دریکتا کو بہت عجیب اور پُراسرار سا لگ رہا تھا۔ وہ کوئی بات بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ رات جو کچھ ہوا دریکتا اُس سے لاعلم تھی۔ ورنہ شاید اس خاموشی کا سبب کسی نہ کسی حد تک وہ جان ہی لیتی۔

☆☆☆

شاہ زیب کے زور زور سے بولنے کی آواز پہ دریکتا نے بہت تیزی سے سلام پھیرا۔ اُس کا دل دہل سا گیا۔ پھر اُس سے دعا ہی نہیں مانگی گئی۔ اُس نے مصلےٰ یونہی چھوڑا۔ اور اُلٹے سیدھے جوتے پہن کر باہر دوڑ لگائی۔ شاہ زیب آج سے پہلے کبھی اس طرح اونچی آواز میں نہیں بولا تھا۔ ٹی وی لاؤنج کا منظر دریکتا کے خاصا پریشان کن تھا۔ شاہ زیب پپا کے سامنے اکڑ کر کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سرکشی اور ہٹ دھرمی واضح تھی۔ وہ دروازے کا پٹ تھام کر اُدھر ہی کھڑی ہو گئی۔ ''میں عاقل و بالغ ہوں مجھے اپنی پسند منتخب کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔ مجھے میرے دین نے پسند کی شادی کا پورا حق دیا ہے''۔ وہ گویا ایک ایک لفظ چبا کر بول رہا تھا۔ ''گیٹ لاسٹ فرام ہیئر شاہ زیب''۔ عمر زیب پوری قوت سے دھاڑے۔ شاہ زیب اُدھر ہی جما رہا۔ ''میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میں نے شادی کرنی ہے تو صرف مائرہ سے کرنی ہے''۔ میں جا رہا ہوں فی الحال لیکن پپا یہ مت سمجھئے گا کہ میں نے ہار مان لی ہے۔ آپ ٹھنڈے دل سے سوچ لیں پھر مجھے جواب دیں میں انتظار کر لوں گا ابھی بھی بے صبری نہیں مجھے۔'' اس وقت دریکتا کو شاہ زیب بہت خودغرض نظر آ رہا تھا۔ پپا کے سامنے کس طرح بدتمیزی سے اکڑ کر کھڑا تھا۔ مائرہ کا نام لیے جانے پہ اُس پہ ساری حقیقت کھل گئی کہ سارا جھگڑا دراصل کس بات پہ ہے۔

شاہ زیب دھم دھم کرتا دریکتا کو ہاتھ سے پرے کرتا نکل گیا۔ وہ بھاگ کر پپا کے پاس آئی۔ جو کرسی پہ گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے تھے۔

''پپا آپ ٹھیک ہیں ناں۔'' وہ اُن کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اُن کے دونوں ہاتھ تھام لیے جو بےحد سرد سے محسوس ہو رہے تھے۔ ''جاؤ میں ٹھیک ہوں''۔ اُن کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش صاف محسوس کی جا رہی تھی۔ دریکتا کے دل کو کچھ ہوا ''پپا کیا ہوا ہے آپ کو...... اور بھائی اس طرح کیوں بول رہا تھا۔ مجھے بھی تو بتائیں نا''۔ وہ سخت متوحش تھی۔

''بیٹھو اِدھر اوپر''۔ عمر زیب نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ اُن کی پیشانی کی ایک رگ بار بار پھڑک رہی تھی۔ اور یہ اُسی وقت ہوتا تھا جب وہ بہت پریشان ہوتے اور کسی سے کچھ کہہ نہ پاتے۔ آج ایسا لگ رہا تھا اگر انہوں نے دل پہ پڑا بوجھ نہ اُتارا تو اُن کا دماغ، دل، وجود سب ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھر جائے گا۔ دریکتا اُن کے دونوں ہاتھ تھامے سخت پریشانی کے عالم میں اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ اُنہوں نے مسکرانے کی کوشش کی پر اس کوشش میں وہ دریکتا کو پہلے سے بڑھ کر قابل رحم لگے۔ اُس کا دل کٹنے لگا اور آنکھوں میں نمی در آئی۔ ''وہ کہتا ہے کہ مائرہ کے لیے میرا پرپوزل لے کر جائیں فوراً۔ ورنہ اُس نے دھمکی دی ہے کہ اگر اُس کی بات نہ مانی گئی تو وہ کورٹ میرج کر لے گا۔ کچھ اُلٹا سیدھا کر لے گا اپنے ساتھ۔'' عمر زیب یکدم برسوں کے بیمار نظر آنے لگے تھے۔ دریکتا اُن سے بڑھ کر پریشان تھی۔ یکا یک شاہ زیب کو کیا ہو گیا تھا کیسی باتیں کر رہا تھا وہ۔ پپا کے سامنے اُس نے آنکھیں اُٹھا کر بات نہ کی تھی اور آج خود اُس نے شاہ زیب کو کتنی بدتمیزی سے بات کرتے سنا اور دیکھا۔

مائرہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ سارا دن اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ شاہ زیب دل کی بھڑاس نکال کر جا چکا تھا۔ دریکتا اور عمر زیب بالکل خاموش تھے۔ ایک طوفان نے اُس کے آشیانے کا رُخ کر لیا تھا۔ یہ طوفان اپنے ساتھ سب کچھ بہا لینے کے درپے تھا۔

''پپا پریشان مت ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' دریکتا نے بھیگی آنکھوں سمیت مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اُنہیں تسلی دی تو وہ فقط سر کو ہلا کر رہ گئے۔

عمر زیب نے آنے والے وقت کی آہٹوں کو پہچان لیا تھا۔ شاہ زیب کے تیور ہار ماننے والے نہیں لگ رہے تھے اُنہیں ہی جھکنا تھا۔ ساری عمر خود کو خاندانی سازشوں کے تانے بانوں سے دور رکھا تھا پر اتنی احتیاط کے باوجود ہونی ہو کر رہی تھی۔ اس بار جب وہ گاؤں گئے تو تینوں بھائیوں نے جس طرح رشتوں کی بات کی تھی تب سے وہ اندر ہی اندر کھٹک لگے تھے۔ مگر اُنہیں کچھ خوش فہمیاں بھی لاحق تھیں جو شاہ زیب کی سرکشی نے دور کر دی تھیں۔ مائرہ بھائی کی بیٹی تھی اپنا خون تھا۔ اگر یہ شادی ہو جاتی تو اس میں مضائقہ بھی تو نہیں تھا۔ پر شرمین نے مائرہ کو مہرہ بنا کر آگے بڑھایا تھا۔ وہ اچھی طرح جان گئے تھے۔

☆☆☆

برآمدے اور بیرونی گیٹ کے علاوہ سارے گھر کی لائیٹیں آف تھیں۔ شاہ زیب نے گاڑی ڈرائیو وے میں کھڑی کر کے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ سارا گھر خاموشی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پپا کے بیڈ روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک ثانیے کے لیے اُس کے قدم رکے پر پھر فوراً ہی آگے بڑھ گئے۔ مائرہ اُسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ تو جیسے شاہ زیب کی آمد کے انتظار میں دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اُس کے قدموں کی مخصوص چاپ کو پہچان کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ ملگجی سی روشنی میں اُس کا سراپا واضح تھا۔ اُس نے ہونٹوں پہ اُنگلی رکھتے ہوئے شاہ زیب کو خاموشی کا اشارہ کیا۔ دونوں اندر آ کر بیٹھے گئے۔

مائرہ کی رتجگے کی گواہ آنکھیں سرخ سرخ سی نظر آ رہی تھیں جیسے بہت دیر تک روتی رہی ہو۔ شاہ زیب کو پپا کے

کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے جو ملال ہوا تھا مائرہ کی آنکھیں دیکھ کر پل بھر میں مٹ گیا۔ ''تم نے کھانا کھایا''۔

''نہیں'' مائرہ نے نفی میں سر ہلایا ''کیوں نہیں کھایا''۔ وہ فکرمندی سے بولا ''بس جی نہیں چاہ رہا تھا عمر چچا بہت اَپ سیٹ رہے ہیں۔ آپ نے اس طرح بول کر اچھا نہیں کیا ہے۔ بات منوانے کے ضد کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ اب وہ سوچ رہے ہوں گے اس کے پیچھے میری امی کا اور میرا ہاتھ ہے جس کی وجہ سے آپ اُن سے یوں بولے۔ میں اپنی فیملی اور اپنی عزت کے معاملے میں بہت حساس ہوں آپ کو پتہ ہونا چاہیے۔'' مائرہ کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔ ''تمہاری عزت میری عزت ہے پیا کچھ کہہ کے تو دیکھیں۔ میں اُن سے ابھی جواب مانگ لیتا پر وہ سو رہے ہیں کل دیکھوں گا۔ اور تم فکر مت کرو۔ وہ نارمل ہو جائیں گے۔'' شاہ زیب نے اُسے دائیں بازو کے گھیرے میں سمیٹ لیا۔ کچھ پل اس کیفیت میں گزر گئے مگر پھر بہت جلد مائرہ اُس سے دور ہو گی۔ ''آپ جائیں آرام کریں رات کافی ہو گی ہے۔ اس طرح یہاں بیٹھنا مناسب نہیں ہے''۔ ''کوئی بات نہیں بہت جلد تم میرے پاس ہو گی پھر دیکھوں گا کہاں بھاگ کے جاؤ گی مجھ سے''۔ شاہ زیب ٹھنڈی سانس بھرتا پلٹ گیا۔

اگر وہ ایک بار پیچھے مڑ کے دیکھ لیتا تو اُسے مائرہ کی آنکھوں میں انجانی سی خوشی اور کامیابی کی چمک صاف نظر آ جاتی۔

اُسے مائرہ کی آنکھوں کی سرخی تو نظر آ گی تھی پر عمر زیب کے دل کا خون اُسے بالکل نظر نہیں آیا تھا۔ اُس کی سرکشی کا گھاؤ بھرنے والا نہیں تھا۔ اپنی دلی خواہشات کے سامنے اُن کی تکمیل کے سامنے اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ محبت کی کالی پٹی جوان آنکھوں پہ بندھ جائے تو پھر اپنی بھلائی بھی نظر نہیں آتی۔

☆☆☆

عمر شکست خوردہ نظر آ رہے تھے۔ شاہ زیب آج بھی اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ پر آج اُس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ عمر نے ہار مان لی تھی اور مائرہ کے گھر رشتہ جلد لے جانے کا کہہ دیا تھا۔ ''تم فکر مت کرو۔ میں بہت جلد اورنگزیب سے بات کروں گا۔ اب مائرہ کا اس طرح ہمارے میں رہنا ٹھیک نہیں ہے جس لڑکی نے کل بہو بن کر ہمارے گھر آنا ہے اُسے اپنے ماں باپ کے پاس موجود ہونا چاہیے۔'' شاہ زیب بہت شرمندہ تھا۔ پر عمر نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے کچھ بھی بولنے سے روک دیا۔ ''بس ٹھیک ہے میں غلطی پہ تھا۔ کچھ بھی سہی مائرہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔ ایک طرح سے میرا اپنا خون ہے۔ وہ میری بہو بن جاتی ہے تو اچھی بات ہے۔ اپنے خاندان کے ساتھ میرا رشتہ اور مضبوط ہو جائے گا۔ اچھا ہے میرے پاس اپنی برسوں پرانی غلطی کی تلافی کا سنہرا موقع ہے۔'' آخری جملہ انہوں نے بہت ہی آہستہ آواز میں کہا۔ جو کوشش کے باوجود شاہ زیب نہ سن سکا۔ اُسے تو آج اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملی تھی۔ دلی مراد اتنی آسانی سے پوری ہونے جا رہی تھی۔ اُس کے پاس مزید کچھ سوچنے کا ٹائم ہی نہیں تھا۔ ہنستا مسکراتا وہ مائرہ کو یہ خوشخبری سنانے کے لیے ڈھونڈنے لگا۔

☆☆☆

عمر زیب نے طاہر لغاری کو بھی گاؤں ساتھ جانے کے لیے کہا تھا۔ ہاں دریکتا اور شاہ زیب اس بار ساتھ نہیں جا رہے تھے۔ صرف عمر زیب اور طاہر لغاری ہی جا رہے تھے۔ شاہ زیب کے لیے مائرہ کا رشتہ طلب کرنا تھا۔ رسم و رواج کو بھی تو دیکھنا تھا۔ وگرنہ شاہ زیب کا بس چلتا تو مائرہ کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس لے آتا۔ ہمیشہ کے لیے۔

طاہر لغاری، عمر زیب کے ساتھ مائرہ بھی آئی تھی۔ وہ اپنی ساری چیزیں بھی سمیٹ کے لے آئی تھی۔ ایسا تو

مکن ہی نہیں تھا کہ وہ گھر میں ہونے والی سرگرمیوں سے بے خبر رہتی۔ پھر شاہ زیب اُسے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بتاتا تھا۔ اس لیے وہ گاؤں واپسی پہ بہت خوش تھی۔

عمر زیب کے ساتھ طاہر لغاری اور مائرہ کو دیکھ کر شریں ٹھٹھک سی گی۔ مائرہ نے اشاروں میں اُن کی آمد کا مقصد بتا دیا تھا۔ اُسے تو ہاتھ پاؤں پڑے گے۔ ہارون اور نوید تک بھی خبر پہنچ گی اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ دونوں کی بیویوں کو پتہ نہ چلتا، ذرا سی دیر میں سب اُن کے ہاں جمع ہو گے۔ عمر نے اپنی آمد کی غرض و غائیت بیان کر دی۔ اورنگزیب بہت خوش ہوا۔ اُٹھ کر بھائی کو گلے لگایا۔ ''مائرہ تمہاری بیٹی ہے اب یہ ہماری نہیں ہے نہ اس پہ ہمارا کوئی حق ہے'' اورنگزیب کے لہجے سے ہی اُس کی خوشی محسوس کی جا رہی تھی۔

فرح اور فوزیہ قدرے الگ بیٹھی شریں کو دیکھ رہی تھیں۔ سب کو مٹھائی کھلاتے ہوئے وہ کتنی خوش نظر آ رہی تھی جیسے میدان مار لیا ہو۔

شاہ زیب اور مائرہ کی بات پکی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

فرح اور نوید میں بحث چل رہی تھی۔ ''میں کہتی ہوں اب آپ بھی بات کریں عمر بھائی سے اس سے پہلے کہ کوئی اور یہ تیزی دکھا جائے آپ اپنے طور پہ کہہ دیں عمر بھائی سے۔ تا کہ سب کو پتہ چل جائے۔ ارے میں کیسے بات کر دوں پچھلی بار اس موضوع پہ بات ہوئی تھی۔ تو عمر نے کہا تھا کہ ابھی دریکتا پڑھ رہی ہے۔ چھوٹی ہے۔ اُس کے بعد دیکھا جائے گا''۔ ''نوید نے پرانی بات کے الفاظ رد و بدل کے ساتھ پھر سے اپنی شریک سفر کے سامنے دہرائی تو وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گی۔ ''ابھی آپ عمر بھائی کے پاس تو نہیں گئے ہیں ناں۔ جب ہم اُن کے گھر جا کر اسجد کے رشتے کی بات کریں گے تو پھر وہ یہ نہیں کہیں گے کہ ہماری بیٹی چھوٹی ہے۔ یہ تو ہر باپ کہتا ہے مگر ایک نہ ایک دن بیٹی ذات کو پرائے گھر رخصت تو کرنا ہوتا ہے۔ عمر خوش ہو گا۔ ہمارا اسجد لائق فائق تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ عمر کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ بیٹی دینے میں۔ آخر کو اورنگزیب بھائی کی طرح آپ بھی اُس کے بھائی ہیں۔ شریں بھابی نے تو ایک بار بھی نہیں کہا کہ ہماری مائرہ چھوٹی ہے۔ انہوں نے تو جیسے شکر ادا کیا۔ شاہ زیب کے رشتے پہ۔ آخر کو اتنی بڑی جائیداد کا وارث ہے۔ راج کرے گی مائرہ۔'' فرح کے لہجے سے رشک و حسد صاف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بول رہی تھی اور نوید خاموشی سے سن رہے تھے۔ دل میں بیگم کی باتوں سے وہ بھی متفق تھے۔

☆☆☆

کچھ اسی طرح کی باتیں حویلی کے دوسرے حصے میں موجود فوزیہ اور ہارون میں بھی ہو رہی تھیں۔ فوزیہ تو باقاعدہ شوہر سے لڑ رہی تھی۔ ''آپ منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ اور فرح نوید بھائی کے ساتھ رشتے کے لیے چلی جائے گی۔ آپ بھی عمر کے بھائی ہیں۔ اُس کی بیٹی پہ ہمارا بھی حق ہے''۔ ''میں دو تین دن تک جاؤں گا عمر کی طرف''۔ بالآخر ہارون زیب نے فیصلہ کر ہی لیا۔ فوزیہ کی باچھیں خوشی سے کِھل گئیں۔ ''میں بھی تو جاؤں گی ناں۔ آخر کو قاسم کی ماں ہوں۔ صاف کہہ دوں گی عمر بھائی سے کہ دریکتا ہماری امانت ہے''۔ وہ ہاتھ نچا کے بولی۔ ہارون دل میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ عمر نے تو کہہ دیا تھا کہ جب تک دریکتا تعلیم سے فارغ نہیں ہو جاتی اُس وقت تک وہ اُس کا رشتہ طے کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور فوزیہ نے ناک میں دم کیا ہوا تھا کہ جاؤ اور جا کے عمر بھائی سے بات کرو۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں

طرح اور نوید اُن سے پہل کرنے میں بازی نہ لے جائیں۔

شریں بھابھی کی تیزی اور عقل مندی سے دونوں ہی خائف تھیں۔ اُس نے مائرہ کو شہر عمر بھائی کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجا تھا اور اب بالآخر وہ اُسی گھر کی مالکن بننے جا رہی تھی۔ تیزی اور ہوشیاری اسی کو کہتے ہیں۔ اُن دونوں کو یہ بات پتہ نہیں تھی کہ عمر زیب شاہ زیب کی ضد سے مجبور ہو کر گاؤں آئے ہیں۔

☆☆☆

ایک بوجھ عمر کے سر سے اُتر گیا تھا۔ شاہ زیب کی ضد پوری ہو گی تھی۔ اب بہن ہونے کی حیثیت سے دریغ کے اپنے ارمان تھے۔ وہ چاہ رہی تھی کہ دھوم دھام سے بھائی کی منگنی ہو۔ عمر اُس کی خواہش ٹال نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ منگنی کے دعوت نامے چھپوائے گئے۔ دوست احباب میں تقسیم ہوئے۔ مائرہ کے لیے بوتیک سے زرق برق منگنی کا جوڑا لیا گیا ساتھ جیولری۔ بہت دھوم دھام سے منگنی ہوئی۔ اب باضابطہ طور پہ مائرہ شاہ زیب کی منگیتر بن گئی تھی۔ وہ آئے روز گاؤں پہنچا ہوتا یا پھر مائرہ کے کالج۔ اپنے مستقبل اور پڑھائی کی طرف سے وہ بالکل لاپروا ہو گیا تھا، دل و دماغ میں مائرہ سے ملنے کی دھن سمائی رہتی۔ باقی دنیا کی کسی چیز کی اُسے ہوش نہیں تھی۔ اُس کی دنیا مائرہ سے شروع ہو کر مائرہ پہ ہی ختم ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں اُس نے شاہ زیب پہ کیا جادو کیا تھا جو اُسے اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

بس وہ ہی وہ تھی۔

عمر زیب کی طبیعت گزشتہ ہفتے سے خراب تھی۔ تھوڑا سا گلا خراب ہوا اُس کے بعد زکام شروع ہوا پھر پورے جسم کو بخار نے جکڑ لیا۔ وہ کہیں آنے جانے کے قابل ہی نہیں رہا۔ گھر پہ بستر کا ہی ہو کے رہ گیا۔ طاہر لغاری دو دن پہلے آ کے دیکھ گے تھے پھر اس کے بعد وہ بھی نہیں آئے۔ اُن کا بیٹا انگلینڈ سے آیا ہوا تھا وہ دوستوں رشتہ داروں اور ملنے ملانے والوں کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اشعر انگلینڈ میں ہی مقیم تھا آج کل چھٹیوں میں پاکستان آیا تھا۔ طاہر بہت خوش تھے۔ اشعر کے آنے سے پہلے وہ روز عمر زیب کے پاس آتے کافی دیر بیٹھتے۔ گپ شپ لگاتے۔ وہ نہیں آ رہے تھے تو عمر بھی اداس اُداس تھے۔ طاہر سے بات کر کے وہ اپنے مسئلے مسائل دکھ درد بھول جاتے۔

نویں دسویں دن اُن کی حالت میں کچھ بہتری ہوئی تو وہ خود گاڑی ڈرائیو کر کے طاہر کی طرف چلے گے۔ وہاں خوشیوں کے سارے رنگ اُترے ہوئے تھے۔ طاہر لغاری کے اکثر رشتے دار اشعر کی آمد کا سن کر آئے ہوئے تھے۔ جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔

طاہر لغاری سے حقیقی معنوں میں دوستی راحیلہ کی شادی کے بعد شروع ہوئی تھی۔ طاہر اُس وقت انگلینڈ سے آئے ہوئے تھے۔ اُن کے بیوی بچے وہیں تھے۔ طاہر کا اپنا بزنس تھا اور اُس میں وہ خاصے کامیاب تھے۔ راحیلہ کے ساتھ شادی پہ آمادہ وہ طاہر ہی کی وجہ سے ہوئے تھے۔ بعد میں طاہر پھر انگلینڈ واپس لوٹ گے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا وہیں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اُن کی بیگم ایک اتفاقی حادثے میں اللہ کو پیاری ہو گئی تو انہوں نے دیکھ بھال کر دونوں بیٹیوں کی شادی اُدھر انگلینڈ میں ہی کر دی۔ اشعر دونوں بہنوں سے چھوٹا تھا۔ چار سال پہلے طاہر لغاری مستقل طور پہ پاکستان لوٹ آئے۔ یہیں گھر بنایا۔ اُن کے اکثر رشتہ دار بھی اِدھر ہی تھے۔ سو لگتے لگتے دل لگ ہی گیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اشعر نے بھی اُن کے پاس لوٹ آنا تھا۔ بیٹیاں بھی اکثر و بیشتر پاکستان اُن کے پاس چکر لگا جاتیں۔ وہ خوش تھے اور بے فکری زندگی گزار رہے تھے۔ فکر معاش سے آزاد تھے اس لیے بڑھاپے میں بھی عمر چور تھے۔ چہرے پہ تازگی اور مسکراہٹ رہتی۔ وہ ہنسنے ہنسانے والے انسان تھے۔ اسی بنا پہ عمر زیب کی ان کے ساتھ بہت بنتی تھی۔

عمر زیب کو دیکھ کر طاہر گرمجوشی سے اُس کے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ اشعر بھی اُن کی تقلید میں اُٹھ کھڑا ہوا اور عمر سے ملا۔ وہ چند ثانیے کے لیے اُسے دیکھتے رہ گے۔ بہت شاندار صحت تھی اشعر کی۔ لمبا چوڑا کڑیل جوان، اُس کی گرفت میں مضبوطی اور سختی تھی۔ ''اللہ نظر بد سے بچائے۔'' انہوں نے دل ہی دل میں دعا دی۔ وہ اُن سے حال احوال پوچھ رہا تھا۔ بہت صاف اور رواں اُردو میں لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ انگلینڈ میں پلا پڑھا ہے۔ طاہر نے اپنی اولاد کو اپنی روایات اور ماحول سے الگ نہیں کیا تھا۔ وہ انگلینڈ میں رہ کر بھی پاکستانی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ویسے بھی اشعر پاکستان آتا جاتا رہتا تھا۔ یہاں کا کلچر رہن سہن، زبان، بولی، کچھ بھی اُس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

عمر زیب کافی دیر اُس سے باتیں کرتے رہے۔ اشعر کچھ کام مکمل کرنے کے بعد پاکستان میں ہی رہنے کا خواہش مند تھا۔ آئندہ دو ایک سالوں میں اُس نے لوٹ آنا تھا۔ وہ بہت باشعور اور سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ اس لیے عمر کو اچھا ہی لگا۔ اُدھر اُن کا اپنا لاڈلا بیٹا تھا جسے آج کل کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ اُسے بس گاؤں اور مائرہ کے کالج کے چکر لگانے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ رات کا کھانا کھائے بغیر طاہر اور اشعر نے اُنہیں اُٹھنے نہیں دیا۔

☆☆☆

کالج کے باہر گاڑی لیے شاہ زیب مائرہ کے ہی انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں گیٹ سے باہر نکلی تو پہلی نگاہ شاہ زیب پر ہی پڑی۔ اُس کی ساتھی لڑکیوں نے کھی کھی کر کے ہنسنا شروع کر دیا۔ مائرہ شرمندہ سی ہو کر اُنہیں ڈانٹنے لگی۔ ''کیوں ہنس رہی ہو تم لوگ''۔ ''تمہارا دیوانہ آج پھر آیا ہوا ہے''۔ سمرن اُس کی گہری دوست چہک کر بولی۔ ''ہاں میں بھی دیکھ رہی ہوں''۔ وہ کچھ تنک کر بولی تو سمرن حیرت سے اُسے تکنے لگ گی۔ شاہ زیب دولت مند اور خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ مائرہ کو بے پناہ چاہتا تھا۔ مائرہ بڑے فخر سے بتاتی تھی کہ شاہ زیب نے اُس کی خاطر اپنے پپا سے ٹکر لی ہے اور لڑ جھگڑ کر اُسے اپنایا ہے۔ اس سچوایشن میں کبھی کبھی سمرن کو اُس کی بیزاری سمجھ نہیں آتی تھی۔ حالانکہ مائرہ شاہ زیب کے مقابلے میں اتنی حسین بھی نہیں تھی۔ وہ سب فرینڈز شاہ زیب کی پرسنالٹی اور اُس کی نت نئی مہنگی گاڑیوں سے خاصی متاثر تھیں پر مائرہ کی تیوریاں چڑھی ہی رہتیں۔

شاہ زیب نے گاڑی کا اگلا دروازہ اُس کے لیے کھول دیا۔ خود مائرہ کا ڈرائیور کالج گیٹ سے کچھ ہٹ کر مالکن کے انتظار میں تھا۔ شاہ زیب نے پیسے دے کر اُس کا منہ بند کیا ہوا تھا۔ مائرہ کے ساتھ کچھ وقت گزار کر وہ اُسے گیٹ کے پاس چھوڑ دیتا۔ جہاں سے وہ اپنی گاڑی میں گھر جاتی۔ کچھ دن گزرتے ہی وہ گاؤں پہنچ جاتا۔ رات گزار کر اگلے دن گھر لوٹتا۔ اُس کی وارفتگی کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ کل سے بینا خالہ اپنے بیٹے باسط کے ساتھ حویلی آئی ہوئی تھیں۔ اس وجہ سے مائرہ جلدی گھر لوٹنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ جھنجلائی ہوئی روٹھی روٹھی سی لگ رہی تھی۔ اُس کا دھیان بھی شاہ زیب میں نہیں تھا۔ اُس نے بہت جلدی اُس کی یہ ذہنی غیر حاضری پکڑ لی۔ ''کیا بات ہے کن خیالوں میں گم ہو''۔ شاہ زیب گاڑی موڑ کر مین روڈ سے اُتر آیا تھا۔ پاس ہی تھوڑی سی آبادی تھی۔ اُس نے گاڑی ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑی کر دی۔ اب مائرہ مکمل طور پہ اُس کے سامنے تھی۔ ''شاہ زیب روز روز اس طرح ملنا ٹھیک نہیں ہے۔ امی ابو کو آپ کا آئے روز گاؤں چلے آنا بھی پسند نہیں۔ آپ اپنی ہی روایات کو بھول رہے ہیں۔ اس سے میری عزت پہ حرف آتا ہے۔ مائرہ غصے میں تھی۔ شاہ زیب بھی غصے میں آ گیا۔ چابی اگنیشن میں گھما کر گاڑی سٹارٹ کی اور واپس ہو لیا۔ مائرہ کو کالج کے پاس کھڑی اُس

کی گاڑی کے پاس ڈراپ کرکے وہ زن سے نکل گیا۔ اس دوران نہ تو مائرہ نے اُس سے بات کی نہ روکنے کی کوشش کی۔ اُسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ باسط نے اُسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ ”آہا آ گئی ہو واپس“ وہ اُس سے تین سال بڑا تھا۔ پر قد کاٹھ ڈیل ڈول ایسا تھا کہ مائرہ سے کم سے کم چار پانچ سال بڑا نظر آتا۔ عمر کے مقابلے میں اُس کے چہرے پر پختگی تھی۔ مائرہ آپ جناب کا تکلف کے لیے بغیر دھڑلے سے تم کہہ کر مخاطب کرتی۔ ”ہاں تم سناؤ کیا ہو رہا تھا“۔ وہ بیگ رکھ کر اُس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”ہونا کیا تھا تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ آؤ تو گپ شپ لگاؤں تم سے۔ پتہ ہے یہاں میری دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ کیا ہے“۔ ”نہیں مجھے نہیں پتہ“۔ اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”یہاں میری دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ تم ہو صرف تم“۔

مائرہ کا دل دھڑک اُٹھا۔ اُصولی طور پہ باسط کے منہ سے یہ بات سن کر اُسے خفا ہونا چاہیے تھا۔ روکنا چاہیے تھا۔ مگر اُسے حیرت انگیز طور پہ جانے کیوں یہ بات بالکل بُری نہیں لگی۔ ”خالہ کو بہت جلدی تھی ناں تمہاری منگنی کی۔ آخر کو تمہارے چچا کا بیٹا بہت امیر ہے جائیداد کا مالک ہے۔ اُس کے سامنے ہم غریبوں کی دال کہاں گلنی تھی۔ پیسے والے جیت گے اور ہم غریب دل والے منہ دیکھتے رہ گے۔ اُن نے بہت طنزیہ انداز میں یہ سب باتیں کی تھیں۔ مائرہ خاموشی سے دیکھتی رہی۔ ایک بار بھی اُسے نہیں ٹوکا“۔ کہا بھی تو اتنا کہ ”میں یونیفارم تبدیل کر لوں۔ پھر خالہ سے اور تم سے بات ہوتی ہے“۔ اُسے وہیں کچھ سوچتا چھوڑ کر مائرہ اندر غائب ہوگی۔

☆☆☆

شاہ زیب بہت ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے گھر پہنچا۔ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اپنے بیڈروم میں آکر بستر پہ ڈھیر ہو گیا۔ دل میں مائرہ کی بے رُخی نے آگ لگا دی تھی۔ اوپر سے رہ رہ کر اُس کی باتیں ذہن پہ ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ ”شاہ زیب روز روز اس طرح ملنا ٹھیک نہیں۔ امی ابو کو آئے روز آپ کا گاؤں چلے آنا بھی پسند نہیں۔ آپ اپنی ہی روایات کو بھول رہے ہیں۔ ایسے میری عزت پہ حرف آتا ہے“۔ شاہ زیب نے غصے میں بیڈ پہ پڑے تمام تکیئے کارپٹ پہ دے مارے۔ غصہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کتنا فاصلہ طے کر کے موسم کی شدت کی پروا کیے بغیر اُسے دیکھنے اور ملنے کے شوق میں آئے روز جاتا اور اُسے پرواہ ہی نہیں تھی۔ گویا شاہ زیب اُس کی انسلٹ کر رہا تھا۔ آج تو اُس نے بیگانگی کی حد کر دی تھی۔ ایک بار بھی اُسے روکا نہ منایا۔ بس غصے میں بیٹھی دیکھتی رہی اُس کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دریکتا پریشان سی ہوگی کہ جانے کیا بات ہے جو شاہ زیب اس طرح کمرا بند کیے پڑا ہے۔ اُس نے دروازے پہ زوردار انداز میں دستک دی۔ چند سیکنڈز کے بعد اُس نے دروازہ کھول دیا۔ عجیب بکھرا بکھرا سا حلیہ تھا اُس کا۔ آنکھیں سرخ چہرے پہ یاسیت جیسے برسوں کا مریض ہو۔ ”بھائی کیا ہوا ہے۔ کسی نے کچھ کہا ہے جو شام سے اس طرح لیٹے ہوئے ہیں“۔ اُس کی محبت نے جوش مارا۔ ”نہیں کسی نے کیا کہنا ہے بس ایسے ہی دل دل چاہ رہا تھا اکیلے رہنے کو۔ خیر تم چائے بنواؤ ایک کپ میں اُدھر ٹی وی لاؤنج میں ہی آ رہا ہوں پپا اور تمہارے پاس“۔ وہ سر ہلاتی کچن کی طرف آ گئی۔ چائے لے کر جب وہ ٹی وی لاؤنج میں آئی تو شاہ زیب پپا کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ بڑے دن بعد آج وہ اس طرح پپا کے پاس بیٹھا نظر آیا تھا۔ اُسے بہت اچھا لگا۔ بڑا بھرپور منظر تھا مکمل گھریلو منظر۔ بھائی، بہن اور باپ۔ ہلکی پھلکی گپ شپ ہو رہی تھی جب باتوں کے درمیان شاہ زیب اچانک خاموش ہو گیا۔ اُس کی خاموشی بڑی معنی خیز تھی جانے اس کے پس منظر میں کیا راز تھا۔ بالآخر راز کھل ہی گیا۔ ”پپا میں شادی کرنا چاہتا ہوں“۔ عمر کے ساتھ ساتھ دریکتا بھی حیران ہوئی۔ ”وقت آنے پہ شادی بھی ہو جائے گی“۔ عمر خاصے حل سے کام لے رہے تھے۔ ”لیکن پپا میں بہت جلد شادی کرنا چاہتا ہوں ایک دو ماہ کے اندر اور میں نے پلان بھی کر لیا ہے“۔ اُس کا انداز حتمی تھا۔ ”ابھی تمہاری تعلیم مکمل نہیں ہوئی ہے کم سے کم چار پانچ سال لگیں گے اُس کے بعد شادی کا سوچا جائے گا“۔ ”پپا میں نے شادی کرنی ہے بس۔ مزید تعلیم میں نے حاصل نہیں کرنی۔ آپ کے ساتھ بزنس میں ہیلپ کرنی ہے آفس میں بیٹھنا ہے“۔ وہ پھر روایتی ضد پہ اُتر آیا تھا۔ عمر نے اُسے سمجھانے کی ایک آخری کوشش کی۔ ”تمہاری عمر ابھی اتنی زیادہ نہیں ہے کہ تم شادی کے بارے میں سوچ سکو۔ بیس اکیس سال کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہوتی“۔ ”پپا میں سمجھدار ہوں۔ شادی کی ذمہ داری اُٹھا سکتا ہوں۔ بس جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ کل سے آپ کے ساتھ آفس جاؤں گا“۔ عمر سر پکڑ کے بیٹھ گے۔ یہ اب نئی دھن اُس کے دماغ میں سما گی تھی۔ شاہ زیب کا منہ بند کرنے کی خاطر اُنہیں اورنگزیب بھائی سے بات تو کرنی تھی۔ اُنہیں پتہ تھا بھائی نے اتنی جلدی مائرہ کی شادی نہیں کرنی ہے۔ وہ بھی پڑھ رہی تھی۔ کم سے کم شاہ زیب تک اُن کا جواب تو پہنچ جاتا۔ اِسی طرح اُس کے ساتھ نمٹا جا سکتا تھا۔

وہ اورنگزیب بھائی سے بات کرنے کی سوچ رہے تھے کہ وہ خود ہی چلے آئے۔ عمر اُن سے تپاک سے ملے۔ سب کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد دونوں بیٹھ گے۔ ”شاہ زیب کہیں نظر نہیں آ رہا ہے کہاں ہے“۔ اُن کی متلاشی نگاہیں بے چین سی لگ رہی تھی۔ ”دوستوں کی طرف گیا ہے۔ آپ سنائیں کیسے آنا ہوا ہے“۔ ”بس ایک کام تھا تم سے اس لیے آیا ہوں۔ اصل میں مائرہ نے اپنی ماں سے بات کی ہے کہ شاہ زیب ہر تیسرے دن اُس کے کالج چلا آتا ہے۔ اُس کا یہ عمل مناسب نہیں ہے ابھی یہ بات کسی کو پتہ نہیں ہے مگر جب کھل گئی تو میری بیٹی کی کتنی بدنامی ہوگی۔ یہ بات کسی نے نہیں سوچی ہے۔ میں اسی لیے آیا ہوں کہ اُسے سمجھاؤ یہ چیز اچھی نہیں ہے“۔ عمر کا دل چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ اُس میں سما جائیں۔ شاہ زیب نے اپنی حرکتوں سے اُنہیں اور خاندان کو بدنام کرنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اُنہوں نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا۔ یہ وقت ہوش سے کام لینے کا تھا نہ کہ جوش سے۔ ”بھائی جان میں آپ کی طرف آنے کی سوچ رہا تھا اچھا ہوا آپ خود چلے آئے۔ میرا دل ہے کہ شاہ زیب اور مائرہ کی شادی کر دی جائے۔ ہماری بہتری اسی میں ہے۔ شاہ زیب جوان خون کا مالک ہے۔ جذبات پہ بند نہیں باندھے جا سکتے۔ آپ دو تین ماہ میں تیاری کریں میں بھی کرتا ہوں اور مائرہ کو رخصت کرا کے لے آتا ہوں۔ اس مسئلے کا یہ سب سے اچھا حل ہے“۔ عمر کی بات پہ اورنگزیب خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے۔ ”چلو ٹھیک ہے میں گھر جا کر شریں سے بات کرتا ہوں۔ میرے خیال سے تمہاری بات ٹھیک ہے شادی کر دینی چاہیے“۔ اُن کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پہ مرکوز تھیں۔ عمر نے سکون کا سانس لیا۔ یہ مسئلہ تو حل ہوا تھا۔

☆☆☆

فوزیہ نے نوید کا پیچھا لے لیے تھا کہ آپ عمر بھائی سے رشتے کی بات جلدی کریں۔ مائرہ اور شاہ زیب کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی اُس کے سینے پہ سانپ لوٹ رہے تھے کہ اُس کے مجازی خدا فضول میں تاخیر کر رہے ہیں۔ اُنہیں خدشہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہیں کوئی اور دریکتا کا رشتہ نہ مانگ بیٹھے۔ فرح کی باتیں اُنہوں نے اپنے کانوں سے سنی تھیں وہ اپنے بیٹے قاسم کو گھر داماد بنانے کے چکر میں تھی اور اُس کی پلاننگ بڑے دور تک کی تھی۔

☆☆☆

چھٹی کے دن عمر زیب دیر سے ناشتہ کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ دریکتا اور شاہ زیب بھی ہوتا۔ دریکتا صرف چھٹی کے دن ہی ناشتہ کرتی باقی دن اُسے کالج پہنچنے کی جلدی ہوتی اور وہ ناشتے کے نام پہ چائے یا دودھ ہی پیتی۔ آج

شاپنگ وہ خود کر رہا تھا۔ مائرہ کے لیے ''برائیڈل'' خالصتاً اُس کی چوائس تھی۔ جوں جوں وقت قریب آ رہا تھا اُس کا
اشتیاق، بے قراری اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

مائرہ سے بات بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی۔ جب سے شادی کی تیاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا اُس نے پپا
کے ڈانٹنے پہ گاؤں جانا چھوڑ دیا تھا۔ دوسرے مائرہ فون پہ بات بھی کم ہی کرتی۔ ویسے بھی شادی کے دن قریب تھے اُس
نے کافی حد تک برداشت کا مظاہرہ کیا تھا۔ درکیتا خریدی ہوئی چیزیں کھول کے بیٹھ جاتی، کپڑے، جوتے، جیولری، جانے
کیا کیا اِلا بلا۔ پر اُسے بہت اچھا لگتا۔ وہ پپا سے ایک ایک چیز پہ رائے لیتی اور شاہ زیب سپنوں اور رنگوں کی دنیا میں کھو
جاتا جہاں مائرہ اُس کے ہمراہ ہوتی کوئی رکاوٹ اور دوری نہ ہوتی۔ وہ جلدی جلدی ناشتہ کر رہا تھا اُسے ارمان کے ساتھ
آج اپنی شادی کی خصوصی شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ پپا نے ٹوکا بھی آرام سے کھاؤ۔ ''پپا ارمان آ رہا ہے میں لیٹ ہو
جاؤں گا''۔ اُس نے دودھ کا گلاس آدھا پی کر باقی چھوڑ دیا اور نپکن سے ہاتھ صاف کر کے اُٹھ گیا۔

درکیتا نے ناشتے کے بعد تمام برتن اُٹھوائے۔

عمر زیب طاہر لغاری کو فون کرنے لگے۔ اشعر نے اگلے ہفتے انگلینڈ واپس جانا تھا۔ وہ چاہ رہے تھے کہ اشعر کی
زبردست سی دعوت کی جائے۔ ''السلام علیکم'' فون دوسری طرف سے طاہر نے ہی ریسیو کیا اور سلام کیا۔ ''وعلیکم السلام کیا کر
رہے ہو''۔ اُنہوں نے پوچھا۔ ''کچھ خاص نہیں ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔ اس عمر میں اور کیا کرنا ہے''۔ طاہر نے اپنے مخصوص
شگفتہ انداز میں قہقہہ لگایا تو عمر بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ ''اشعر کی واپسی کب تک ہے''۔ ''یار اُس نے بارہ تاریخ کو جانا
ہے رات کی فلائیٹ ہے''۔ طاہر نے فوراً حساب لگا کر بتایا۔ ''تو ایسا کرو کہ میں دس تاریخ کو تمہیں اور اشعر کو دعوت پہ
انوائیٹ کر رہا ہوں آ جانا''۔ ''نیکی اور پوچھ پوچھ میں سر کے بل آؤں گا۔ کافی ٹائم ہو گیا ہے اچھا سا کھانا کھائے ہوئے۔
''طاہر نے بات کے اختتام پر پھر قہقہہ لگایا''۔ ''میں تمہیں اچھا سا کھانا ہی کھلاؤں گا۔ چلو بعد میں بات ہوتی ہے۔'' عمر نے
سیل فون بات ختم کر کے سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا اُنہوں نے جیسے ہی فون رکھا ملازم اندر داخل ہوا۔ صاحب جی گاؤں سے
مہمان تشریف لائے ہیں میں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا ہے''۔ ''ٹھیک ہے جاؤ میں اُدھر ہی آ رہا ہوں''۔ وہ سوچ
رہے تھے کہ شاید اورنگزیب بھائی اور شریں بھابھی ہوں گے پر اُن کے سامنے نوید بھائی اور فوزیہ بھابھی مہمانوں کی
صورت میں کھڑے تھے۔ نوید بھائی نے اُنہیں گلے لگا لیا حال احوال پوچھا۔ فوزیہ بھابھی نے بھی خوش اخلاقی سے اُن کا
حال دریافت کیا۔ پھر اس مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد عمر نے اُنہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

درکیتا کو بھی اُن کی آمد کی اطلاع مل گی وہ سیدھی ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ فوزیہ چچی نے اُسے بہت پیار سے
گلے لگایا۔ اکٹھے تین چار بوسے اُس کے رخساروں پہ ثبت کیے۔ ''کیسی ہے میری بیٹی تم نے تو گاؤں آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔
کافی عرصے سے چکر نہیں لگایا ہے۔ ویک اینڈ پہ اسجد بھی آیا تھا تمہارا پوچھ رہا تھا۔ فارینہ کہہ رہی تھی آج تمہیں ساتھ لے
کر آؤں۔'' انہوں نے اپنی چھوٹی بیٹی کا نام لیا۔ درکیتا محبت کے اس پُر خلوص مظاہرے سے بہت متاثر ہوئی''۔ ''جاؤ گی
ناں گاؤں میرے ساتھ''۔ وہ پُر امید نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ اُس کا سر خود بہ خود ہی میکانکی انداز میں اثبات میں
ہلا۔ ''چچی میں آؤں گی ضرور لیکن ابھی نہیں میرے کورز ہو رہے ہیں۔ اُس کے بعد آؤں گی''۔ ''ہاں ہاں ضرور آنا سب بہن
بھائی تمہارا پوچھتے ہیں''۔ درکیتا کا دل محبت سے سرشار ہو گیا کہ اُس کے کزنز اُس سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر

اُن کے پاس بیٹھ کر کچن کی طرف آ گئی تاکہ خانساماں کو کھانے بارے میں بتائے۔ چچا اور چچی آئے تھے اہتمام لازمی تھا۔
''بھائی جان ہم آپ کے پاس خاص کام کے سلسلے میں آئے ہیں۔'' درکیتا کے جانے کے بعد فوزیہ چچی نے
بات کرنے کے لیے تمہید باندھی تو عمر کو ایسا لگا کہ جیسے وہ خاص کام درکیتا کے سلسلے میں ہو۔ اُنہوں نے بے اختیار پہلو
بدلا۔ فوزیہ نے نوید کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ باقی بات تم کرو۔ نوید فوراً نگاہوں کا اشارہ سمجھ گیا۔ ''عمر میں تمہارے
پاس اپنے بیٹے اسجد کے رشتے کے لیے آیا ہوں۔ تم درکیتا کو ہماری بیٹی بنا دو۔ بس ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔'' وہ بات
کر کے اب عمر کا چہرا دیکھ رہے تھے۔ جس پہ اچانک پریشانی کے سائے پھیل گئے تھے۔ ''ابھی درکیتا پڑھ رہی ہے چھوٹی
ہے میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا ہے۔'' عمر بول تو رہے تھے مگر اُنہیں لگ رہا تھا جیسے اُن کی آواز کسی کنوئیں سے
نکل رہی ہو۔ اس موقعے پہ فوزیہ نوید کی مدد کے لیے آگے بڑھی۔ ''ابھی اسجد بھی پڑھ رہا ہے ہم کون سا کہہ رہے ہیں کہ
ابھی شادی کریں۔ کوئی رسم کر لیتے ہیں تاکہ سب کو پتہ چل جائے۔ جب درکیتا پڑھائی سے فارغ ہو جائے تو پھر شادی کر
لیں گے۔ میں تو کہتی ہوں کہ فی الحال اسجد اور درکیتا کا نکاح کر دیا جائے۔ رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی۔ اب مائرہ کو ہی
دیکھ لیں۔ درکیتا سے ڈھائی تین سال ہی بڑی ہو گی۔ اُس کی شادی بھی تو ہو رہی ہے۔ لڑکیاں جلدی سیانی ہوتی ہیں۔ عمر
بھائی میں درکیتا کو بیٹی بنا کے رکھوں گی۔ آپ بس ہاں کر دیں۔'' عمر پریشانی سے بھائی اور بھاوج کو دیکھ رہے تھے۔ اُنہیں
نکاح والی بات بھی چبھ رہی تھی۔ جانے کیوں پس منظر میں اُنہیں کسی منفی صورتحال کا احساس ہو رہا تھا۔
اُنہیں اس بات کا خدشہ پہلے سے تھا کہ درکیتا کا رشتہ اُن سے ضرور طلب کیا جائے گا۔ درکیتا کا رشتہ طلب کرنے
کے پیچھے اُن کی اپنی غرض پوشیدہ تھی اس لیے عمر زیب پریشان تھے۔ ''میں آپ کو کچھ دن بعد جواب دوں گا''۔ بالآخر
اُنہیں ایک جواب سوجھ ہی گیا۔ جانے کیوں وہ خود کو اتنا کمزور محسوس کرنے لگے تھے جو صاف انکار ہی نہیں کر پائے تھے۔
''ٹھیک ہے عمر بھائی آپ سوچ لیں پر جواب ہاں میں ہونا چاہیے۔ شاہ زیب کی شادی بھی قریب ہے۔
میرے دل میں بھی اسجد کے لیے بہت ارمان ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ شاہ زیب کی شادی کے موقعے پہ سینکڑوں مہمانوں
کی موجودگی میں درکیتا کو منگنی کی انگوٹھی پہناؤں۔ عمر بھائی یہ میری خواہش ہے۔ اُمید ہے آپ ہمارا خیال کریں گے۔''
آخر میں فوزیہ چچی کا لہجہ لجاجت سے بھر گیا۔
عمر بے بسی سے دیکھ کر رہ گے۔
انہیں پریشانی اور سوچوں کے سپرد کر کے فوزیہ بھابھی اور نوید بھائی چلے گے۔ رات عمر کو نیند ہی نہیں آئی۔
جانے کیوں دل بکل سا تھا۔

☆☆☆

سیل فون مسلسل سریلی آواز میں گنگنائے جا رہا تھا عمر نے نمبر دیکھا گھر سے کال تھی۔ اُنہوں نے آن کر کے
کان سے لگایا۔ دوسری طرف رحیم دار تھا اُن کا گھریلو ملازم۔ اُس نے بتایا کہ گاؤں سے ہارون صاحب اور اُن کی بیگم
آئے ہیں۔ آپ گھر تشریف لے آئیں۔ عمر نے فون بند کر کے رکھا تو چہرے پہ پسینے کے قطرے جگمگا رہے تھے۔ ''الٰہی
خیر'' ''پتہ نہیں اب ہارون بھائی کیوں آئے ہیں''۔ وہ آہستہ سے بڑبڑائے اور بیل بجا کر پیون کو بلایا۔ اُس نے ان کا
بریف کیس اُٹھا کر گاڑی میں رکھا۔ باوردی شوفر نے دروازہ کھولا۔ اُن کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ ہو کر جانے پہچانے
راستوں پہ دوڑنے لگی۔ فقط دو دن پہلے ہی تو نوید بھائی فوزیہ بھابھی کے ساتھ آئے تھے۔ پتہ نہیں کیا مسئلہ تھا۔ وہ اپنی

خیالات کی رو میں بہتے ہوئے گھر پہنچے۔ ہارون بھائی اور فرح بھابھی اُنہی کے انتظار میں تھے۔ سلام دعا سے فارغ ہوتے ہی اپنی آمد کا مدعا بیان کر دیا۔ ''عمر میں قاسم کے لیے دریکتا کا رشتہ مانگنے آیا ہوں۔ تم ہمارے چھوٹے بھائی ہو۔ میرے بیٹے پہ سب سے زیادہ حق تمہارا بنتا ہے۔ اور میں ناں نہیں سنوں گا بتا دوں کیونکہ دریکتا مجھے بہت پیاری ہے۔ بیٹیوں کی طرح''۔ عمر کو لگ رہا تھا جیسے ابھی صبر کھو دیں گے۔ کیا انداز تھا رشتہ مانگنے کا۔ جیسے رشتہ مانگنے نہ آئے ہوں دھمکی دیئے آئے ہوں۔ اُن کی مرضی وہ ہاں کریں یا ناں۔ ''عمر بھائی مجھے پتہ ہے آپ دریکتا سے بہت محبت کرتے ہیں آخر کار وہ آئلہ کی نشانی ہے۔ شاہ زیب کی شادی کریں گے مائرہ بہو بن کے آئے گی اور اسی طرح دریکتا کو بھی رخصت ہو کے جانا پڑے گا میں نے ہارون نے یہی سوچا ہے کہ شادی کے بعد قاسم آپ کے ساتھ اسی گھر میں رہے گا۔ اس طرح دریکتا بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے رہے گی۔ رخصت ہو کے بھی آپ کے ساتھ رہے گی۔ میں بھی بیٹی کی ماں ہوں نہیں چاہتی کہ دریکتا کی شادی کر کے آپ اکیلے ہو جائیں۔ یہ فیصلہ آپ کی تنہائی اور بیٹی سے آپ کی محبت دیکھ کر ہم دونوں نے کیا ہے، فرح یہ اس طرح بول رہی تھی جیسے اُسے عمر زیب کی بھلائی سب سے زیادہ عزیز ہو۔ ''ہاں عمر اب ہاں کر دو ایسا رشتہ اور کہاں ملے گا''۔ ہارون بھائی نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر خود قریب کر لیا۔ اُس نے بڑی آہستگی سے ہارون بھائی کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا۔ جانے اُنہوں نے اس کی خاموشی سے کیا نتیجہ اخذ کیا تھا۔ ''اچھا آرام سے سوچو پھر بتانا مگر شاہ زیب کی شادی کے موقعے پہ کوئی رسم ضرور ہونی چاہیے۔ کیوں فرح تم بھی تو بولو۔'' اُنہوں نے اپنا چہرا فرح کی طرف کر لیا تھا۔ جہاں خاموش سی تائید نظر آ رہی تھی۔ خوشی اُس کے چہرے سے چھلکی پڑ رہی تھی کیونکہ ہارون اُن کے مجازی خدا نے بہت اچھے طریقے سے بات کی تھی عمر زیب نے ایک لفظ تک نہیں بولا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ نیم رضا مند تھے۔ عمر بالکل خاموش بیٹھے تھے درمیان میں بھائی اور بھاوج کی کسی بات پہ محض سر ہلا رہے تھے۔

دریکتا کالج میں تھی۔ فی الحال وہ ان سرگرمیوں سے لاعلم ہی تھی۔ دوسرے عمر زیب نے بھی اُس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ شاہ زیب کی شادی کی تیاری میں لگی تھی۔ کالج سے آنے کے بعد سارا وقت اُدھر ہی خرچ ہوتا۔ اُسے نہیں پتہ تھا کہ اندر ہی اندر کیا فیصلے ہو رہے ہیں۔ جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے اُس کی خوشی بھی بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

طویل ڈرائیو وے میں وہ شاندار سی گاڑی آ کر رُکی۔ دریکتا نے کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ طاہر انکل کے ساتھ وہ لمبا چوڑا نوجوان جو اندر کی طرف آ رہا تھا اُس کے لیے مکمل طور پہ اجنبی تھا۔ آج طاہر لغاری اور اُن کے بیٹے کی اُن کے گھر دعوت تھی۔ وہ کچن میں موجود خود مختلف کھانوں کی تیاری کا جائزہ لے رہی تھی۔ کیونکہ پپا نے کہا تھا کہ کہیں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ طاہر لغاری کا بیٹا پہلی بار اُن کے گھر آ رہا تھا۔

اس لیے خانساماں کے سر پہ کھڑے ہو کر اُس نے سب کام کروایا تھا۔ پپا نے اُسے کہا تھا جب مہمان آ جائیں تو ڈرائنگ روم میں آ کے مل لینا۔ سو اُن کے حکم کی تعمیل میں وہ ڈرائنگ روم کی طرف جا رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے وقت وہ رُک سی گی۔ انکل طاہر کا بیٹا پہلی بار اُن کے گھر آیا تھا اس سے پہلے اُس کا سامنا نہیں ہوا تھا اس لیے وہ جھجک سی گی۔ طاہر انکل نے بڑی محبت سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اُن کا بیٹا کھڑا ہو گیا اور بڑے مہذبانہ طریقے سے اُس کے سلام کا جواب دیا۔ بمشکل وہ تین چار منٹ وہاں رکی۔ طاہر انکل آتے جاتے رہتے تھے پر اُن کا بیٹا پہلی بار آیا تھا اور اُسے اجنبیوں سے نامعلوم سی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ جیسی اس وقت طاہر انکل کے بیٹے سے ہو رہی تھی۔

اُس نے شکر کیا کہ ڈرائنگ روم سے باہر آئی۔ عمر، طاہر اور اشعر تینوں باتیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر میں شاہ زیب بھی آ گیا اور اُن کے ساتھ شامل ہو گیا۔

کھانا دریکتا نے ہی سرو کیا۔ عمر نے اُسے بھی کھانے میں شامل ہونے کو کہا پر اُس نے معذرت کر لی۔ کھانے کے بعد عمر نے طاہر سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائنگ روم میں اشعر اور شاہ زیب ہی تھے۔ طاہر عمر کے ساتھ ہو لیے۔ وہ اُسے لے کے قدر کھلی فضا میں آ گے۔ ''ہاں بھئی کیا بات ہے جو اس طرح مجھے یہاں لے آئے ہو؟'' طاہر لغاری اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں بولے۔ ''خاص بات ہی ہے تب ہی یہاں لایا ہوں''۔ اس بار انہوں نے اپنی پریشانی چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ طاہر اُس کے مزید بولنے کے انتظار میں تھے۔ ''میں پہلے ہی شاہ زیب کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے پریشان تھا اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ پہلے نوید بھائی اپنے بیٹے کے لیے دریکتا کا رشتہ مانگنے آئے اور اس کے دو دن بعد ہارون بھائی آ گئے۔ وہ مجھ پہ دباؤ ڈال رہے ہیں کہ میں فوراً ہاں کر دوں تو وہ کوئی چھوٹی موٹی رسم کر لیں بلکہ وہ نکاح کا بول رہے ہیں۔ عجیب سی دھونس اور دھمکی تھی اُن کے انداز میں۔ بلکہ فرح بھابھی کہہ رہی تھیں کہ میں قاسم کو گھر داماد بنا لوں اس طرح میری بیٹی میری آنکھوں کے سامنے رہے گی۔ اب دو بھائی ہیں دونوں کی ایک ہی خواہش ہے۔ میں سخت پریشان ہوں ایک کو ہاں کرتا ہوں تو دوسرا ناراض ہوتا ہے دوسرے کو ہاں کرتا ہوں تو پہلا ناراض ہو جائے گا۔ سوچ سوچ کے میرا دماغ تھک جائے گا۔ مجھے پرانے زخم بھی بھولے نہیں ہیں۔ میں اپنی بیٹی کو وہاں کیسے دے دوں۔ شاہ زیب کی ضد نے مجبور کیا ہے ورنہ اُس کا رشتہ بھی میں نے دل پہ پتھر رکھ کے طے کیا ہے۔ میرے اپنوں کو واقعی اگر مجھ سے محبت ہوتی تو میں یہ سب خوشی خوشی کرتا۔ لیکن اُن کو اپنے اپنے مفاد عزیز ہیں...........''

بولتے بولتے عمر کی آواز بھرا گی تو طاہر لغاری نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ جیسے تسلی دینا چاہ رہا ہو۔ ''اس مسئلے کا ایک حل ہے میرے پاس''۔ ''کیا'' عمر تیزی سے بولے۔ ''تم اشعر کو اپنا بیٹا بنانا پسند کرو گے''۔ عمر پہ تو شادی مرگ والی کیفیت طاری ہو گی۔ طاہر یہ کیا کہہ رہے تھے۔ کیا اُن کے کان دھوکا تو نہیں کھا رہے تھے۔ ''کیا کہا تم نے'' انہوں نے تصدیق چاہی۔ ''میں اگر اشعر کے لیے دریکتا کا رشتہ مانگوں تو دے دو گے''۔ اس بار اُنہوں نے ایک ایک لفظ پہ زور دے کر کہا۔ عمر طاہر سے لپٹ گے۔ ''ایسا ہو جائے تو میری پریشانی ختم ہو جائے''۔ ''میں آؤں گا ایک دو دن تک باقاعدہ رشتہ لے کر۔ تم مت فکر کرو''۔ انہوں نے عمر کا کندھا زور سے دبایا۔ اچانک ہی اُنہیں اپنا وجود ہلکا ہونے کا احساس ہوا۔ طاہر نے بہت بڑی پریشانی دور کر دی تھی۔ اشعر کو دیکھتے ہی اُن کے دل نے بے اختیار ایک خواہش کی تھی کہ دریکتا کو بھی کوئی ایسا ہی ہمسفر نصیب ہو۔ اُن کے دل کی خواہش رب نے جان لی تھی۔ سب کچھ بہت آسان ہو گیا تھا۔

☆☆☆

عمر زیب نے دریکتا کو کالج جانے سے منع کر دیا تھا کہ گھر میں کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ انہیں دریکتا سے اشعر کے رشتے کی بات کرتے ہوئے حجاب سا ہو رہا تھا۔ وہ اُسے بہت پیار کرتے تھے مگر اس موضوع پہ بات کرنا اُنہیں بہت مشکل لگ رہا تھا۔ کوئی عورت ہوتی تو آرام سے بات کر لیتی وہ خود کیا بات کرتے۔ بس کہا بھی اتنا کہ کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ اچھے طریقے سے ڈریس اَپ ہو جاؤ۔ اُنہیں شدت سے آئلہ کی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ دریکتا کو محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی خاص بات ہو۔ کیونکہ پپا بہت سنجیدہ لگ رہے تھے۔

طاہر لغاری کی طرف سے کچھ رشتہ دار مرد اور تین چار عورتیں تھیں۔ پپا نے چائے لے کر ڈرائنگ روم میں

آنے کو کہا۔ آج شاہ زیب بھی گھر پہ ہی تھا۔ خیر وہ سوچتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ چاروں عورتیں اُسے ملیں۔ مردوں نے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ سب اُسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ نروس سی ہو کر نگاہیں جھکا کر رہ گئی۔ اُسے کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ چائے کے برتن اُٹھانے کے بہانے وہ باہر آئی تو سکون کا سانس لیا۔ شاہ زیب رہ رہ کے اُسے شریر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی جو اتنا اسرار پھیلا ہوا تھا۔

وہ باہر آئی تو کچھ دیر بعد شاہ زیب بھی اُس کے پیچھے آ گیا۔ ''تمہیں پتہ ہے یہ مہمان کیوں آئے ہیں''۔ وہ اب بھی اُسے شرارت سے دیکھ رہا تھا۔ میکانکی انداز میں اُس کا سر نفی میں ہلا۔ ''طاہر انکل کی طرف سے یہ سب تمہارے رشتے کے لیے آئے ہیں۔ طاہر انکل بھی پہنچنے والے ہوں گے مٹھائی لینے رک گئے تھے۔ شاہ زیب نے ساری حقیقت اُس پہ عیاں کر دی۔ وہ خود میں عجیب سا محسوس کرنے لگی۔ واقعی تھوڑی دیر بعد طاہر انکل بھی آ گئے۔ شاہ زیب اُسے دوبارہ اندر مہمانوں کی طرف لے گیا۔ سب مہمانوں کا منہ میٹھا کرایا گیا۔ طاہر انکل نے خود اُسے اپنے ہاتھوں سے مٹھائی کھلائی۔ مزید درِ یکتا سے یہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ اُٹھ آئی۔

پیچھے عمر طاہر لغاری سے کہہ رہے تھے کہ میں کل گاؤں جاؤں گا شاہ زیب کی شادی کی تاریخ لینے ساتھ درِ یکتا کے رشتے کے بارے میں بھی بتا دوں گا کہ طے کر دیا ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ اس بات سے بہت مسئلے مسائل پیدا ہوں گے۔ ''وہ اب بھی پریشان ہی تھے''۔ تم اگر یہ تصور کرتے ہو کہ اس سے مسئلے پیدا ہوں گے تو ہم اشعر اور درِ یکتا کا نکاح کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی اشعر کی سیٹ کینسل ہو گی ہے تم جس طرح کہو'۔ طاہر لغاری نے کچھ دیر سوچنے کے بعد تجویز پیش کی۔ عمر کے دل کو یہ بات بھا گئی۔ ''ٹھیک ہے اس طرح کر لیتے ہیں'' وہ فوراً مان گئے۔ وہیں بیٹھ کے صلاح مشورہ ہوا۔ اشعر کی سیٹ کینسل ہو گئی تھی۔ اُس نے اگلے ہفتے کی دوبارہ بک کروائی تھی۔ اُس کی واپسی سے چار دن پہلے نکاح کی تقریب رکھی گی۔ اپنے خاص خاص ملنے جلنے والوں کو عمر نے دعوت دے دی تھی۔ اب گاؤں جانا تھا۔

☆☆☆

''کیا کہہ رہے ہو عمر تم نے درِ یکتا کا رشتہ طے بھی کر دیا اور اب نکاح کی دعوت دینے آئے ہو۔''

سب سے پہلے نوید بھائی اُس پہ چڑھ دوڑے۔ ''بس طاہر لغاری نہیں چھوڑ رہا تھا''۔ اُنہوں نے کمزور سے انداز میں صفائی دی۔ ''تمہیں سگے خونی رشتوں سے بڑھ کر دوست عزیز ہے۔ کیا بات کی ہے تم نے۔'' ہارون بھائی کا چہرہ غصے سے لال سرخ ہو رہا تھا''۔ بہر حال آپ سب نے آنا ہے''۔ عمر نے اُن کے غصے کو اہمیت نہیں دی۔ اورنگزیب کو بھی دل میں سخت غصہ تھا پر مائرہ عمر کی بہو بننے جا رہی تھی اُنہوں نے غصہ ظاہر کرنے کی حماقت نہیں کی۔ شاہ زیب کی شادی کی تاریخ وہ لے آئے تھے۔ دو ہفتے بعد مائرہ نے بہو بن کے اُن کے گھر آ جانا تھا۔

سب اُن سے ناراض تھے۔ ہارون، نوید بھائی اور دونوں بھابیوں نے کھل کے اپنا غصہ اُن پہ ظاہر کر دیا تھا۔

☆☆☆

اشعر کو طاہر لغاری نے جس طرح نکاح کے لیے رضامند کیا تھا وہی جانتے تھے۔ وہ ابھی نکاح جیسے بندھن کے حق میں نہیں تھا۔ ٹھیک ہے اُن کے کہنے پہ عمر انکل کی مشکلات جاننے کے بعد اُس نے اس رشتے پہ نیم آمادگی ظاہر کر دی مگر اب نکاح والی بات اُسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ عمر انکل کی بیٹی اُسے خاصی کم عمر اور امیچور نظر آئی تھی دیکھنے میں جب وہ دعوت پہ اُن کے گھر گیا تھا۔ کم سے کم بھی وہ اُس سے سات آٹھ سال چھوٹی تھی۔ درِ یکتا کے مقابلے میں وہ مضبوط سوچ کا مالک میچور نوجوان تھا۔

طاہر نے منتیں کر کے اُسے منا ہی لیا۔

☆☆☆

طاہر انکل کے بیٹے کے ساتھ کل شام اُس کا نکاح تھا۔ یہ بات شاہ زیب نے اُس تک پہنچائی تھی۔ پھر رات پپا بھی اُس کے پاس چلے آئے اور دھیرے دھیرے بتا ہی دیا کہ کل اُس کی زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ وہ سن کر خاموش سی ہو گی۔ عمر نے جانے اُس کی خاموشی سے کیا مطلب نکالا کہ اُس کے پاس بیٹھ گئے بلکہ اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا ''بیٹا میں زندگی کی سختیوں کے ساتھ مقابلہ کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ ایک دن تمہاری شادی ہونی ہے اس گھر سے تمہیں رخصت ہونا ہے تو میں نے ان حالات میں جو مناسب سمجھا ہے وہی کیا ہے میں اپنوں کے ساتھ مزید لڑ نہیں سکتا۔ تمہارے دونوں چچا ناراض ہو گئے ہیں کیونکہ میں اُن کی خواہش پوری نہیں کر سکتا۔ تمہیں اگر کوئی اعتراض ہے تو مجھے بتا دو۔ میں زبردستی نہیں کروں گا''۔ اُن کے اتنا کہنے کی دیر تھی درِ یکتا اُن سے لپٹ گی۔ وہ رو رہی تھی۔ ''نہیں پپا ایسی کوئی بات نہیں ہے''۔ عمر شانت سے ہو گئے۔ اُسے چپ کرانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی سسکیاں تھم گئیں تو عمر بھی اُٹھ گئے۔ اُن کے جانے کی دیر تھی وہ پھر سے رونے لگی۔ پر اس بار اُس کی کوشش تھی کہ اُس کے رونے کی آواز باہر نہ جائے۔

☆☆☆

اشعر تنا تنا سا اُن کے ساتھ عمر انکل کے گھر آیا تھا۔ اُنہوں نے تو اچھے خاصے لوگوں کو انوائیٹ کیا ہوا تھا۔ گاؤں سے دیگر رشتہ داروں کے ساتھ اورنگزیب بھائی اور اُن کی فیملی ہی آئی تھی۔ ہارون اور نوید بھائی کے گھر والے عمر کے تین چار بار جانے کے باوجود راضی کرنے کے باوجود نہیں آئے تھے۔ اس وجہ سے عمر زیب بہت دُکھی اور آزردہ نظر آ رہے تھے۔ اُن کی خوشی اُدھوری سی تھی۔ دل ہی دل میں اورنگزیب بھائی بھی ناخوش تھے پر مائرہ کی وجہ سے خاموش تھے۔ ورنہ باقی دونوں بھائیوں کی طرح وہ بھی نہ آتے۔ پر مصلحت کا تقاضا تھا کہ اپنی ناپسندیدگی کو عیاں نہ کیا جائے۔ عمر سے تعلقات بگاڑنے کا رسک وہ لے نہیں سکتے تھے۔

شریں درِ یکتا کے پاس بیٹھی تھی۔ مولوی نکاح کا رجسٹر اُٹھائے اندر داخل ہوا تو وہ سمٹ سی گی۔ ایجاب و قبول کے بعد درِ یکتا نے دستخط کیے۔ اس دوران اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر اُبل پڑا تھا۔ شریں دھیرے دھیرے اُس کی پیٹھ سہلا رہی تھی۔ بظاہر وہ بھی خوش تھی پر طاہر لغاری کے ساتھ آئے اُن کے دوست احباب اور اشعر کو دیکھنے کے بعد مارے حسد کے دل خاک ہوا جا رہا تھا۔ وہ بھی اسی حق میں تھیں کہ درِ یکتا کی شادی خاندان میں ہی ہو۔ پر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ تب ہی تو قدرت نے اُسے اشعر لغاری کی شریکِ سفر بنا دیا تھا۔

☆☆☆

نکاح اور کھانے کے بعد مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہو گئے تھے۔ صرف طاہر اشعر اور اُن کے کچھ رشتہ دار ہی رہ گئے تھے۔ اورنگزیب اور شریں نے رات اِدھر ہی گزارنی تھی۔ اشعر بار بار کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ طاہر لغاری اُس کی بیزاری بھانپ چکے تھے۔ لہٰذا عمر سے اجازت لی اور واپسی کا قصد کیا۔

اشعر خود ہی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ طاہر نے اُسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی نارمل ہو گیا۔ طاہر نے سکون کا سانس لیا۔ ورنہ اُس کے چہرے کے تاثرات سے گھبرا گئے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ اب تم پاکستان آ جاؤ''۔ ''ہاں ٹھیک ہے میں اب اکیلا نہیں رہ سکتا۔ نکاح ہو گیا ہے اب شادی کے لیے بھی تو سوچنا ہے ناں''۔ اشعر اُنہیں شکایتی نگاہوں سے دیکھ کر رہ گیا پر منہ سے بولا نہیں۔

☆☆☆

دریکتا نے کام والا بھاری سوٹ تبدیل کیا اور ایک ایک کر کے ساری جیولری بھی اُتاری۔ سب کہہ رہے تھے کہ وہ بہت خوبصورت لگ رہی ہے لیکن اُس نے خود کو ایک بار بھی آئینے میں نہیں دیکھا۔ اُس نے ماں کی کمی کو بہت بُری طرح محسوس کیا تھا۔ وہ ماں جو اُسے جنم دے کر خود اُسے ابدی جدائی دے گئی تھی۔ اُس نے ساری جیولری رکھی اور کپڑے بھی تہہ کر کے الماری میں رکھے۔ شریں تائی کب کی سو چکی تھی۔ وہ بھی کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گی تو آج کے دن کے تمام واقعات آنکھوں کے آگے پھرنے لگے۔ آج سے وہ صرف اپنے پپا کی بیٹی نہیں رہی تھی اشعر کی منکوحہ بھی بن گئی تھی۔ اب زندگی صرف اپنی نہیں رہی تھی کوئی اور بھی حق جتانے والا آ گیا تھا۔ اُس نے اشعر کی شکل وصورت اور سراپا یاد کرنے کی کوشش کی تو ذہن کی اسکرین پہ وہ لمبا چوڑا کسرتی جسم کا مالک مغرور آنکھوں والا نوجوان چھم سے اُتر آیا۔ اُس نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں تو وہ تصور بھی چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ وہ حواس کی دنیا میں واپس آئی۔ اور کروٹ بدل کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

اشعر نے تھکے تھکے انداز میں شوز کے تسمے کھولے پاؤں کو موزوں کی قید سے آزاد کیا۔ آج کا دن بڑا مصروف ہنگامہ خیزی لے کر آیا تھا۔ اُس نے شاور لے کر کپڑے تبدیل کیے۔ پپا پاکستان میں ہی رُکنے پہ اصرار کر رہے تھے وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا گومگو والی کیفیت میں تھا۔ اب تو ایک ذمہ داری بھی سر پہ آ گی تھی بیٹھے بٹھائے ہی ایک دم سے بات نکاح پہ ختم ہوئی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ شادی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن لائف پارٹنر کے بارے میں اُس کے ذہن میں جو تصور تھا اُس کے مقابلے میں دریکتا اُسے کافی چھوٹی لگی تھی۔ دیکھنے میں بھی سولہ سترہ سال کی نظر آ رہی تھی اُسے شاہ زیب کی اتنی جلدی شادی پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ اُس نے کالج کی شاید تعلیم بھی مکمل نہیں کی تھی۔ اور شادی کی ضد پہ اڑ گیا تھا۔ عمر انکل نے یہی بتایا تھا۔ اور اُس کی منکوحہ بھی کالج کی اسٹوڈنٹ تھی جانے کون سی خاندانی روایات اور مجبوریاں تھیں جو عمر انکل اتنی جلدی یہ فیصلہ کرنے پے مجبور ہوئے تھے۔ نکاح کی تقریب میں عمر زیب انکل کے دونوں بھائی بھی نہیں آئے تھے۔ اُنہیں پریشان دیکھ کر اشعر نے کافی تسلیاں دی تھیں۔ ایک بار پھر عمر زیب حسرتوں میں گھر گئے تھے۔ اُن کے اپنے سگے بیٹے کو اُن کی پریشانی کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اشعر شاہ زیب سے صرف چند سال ہی بڑا تھا مگر اُنہیں تسلی دلا سے دے رہا تھا جیسے اُن سے بھی بڑا ہو۔ اُس کے سمجھانے بجھانے پہ عمر نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔

دریکتا کی طرف سے اُنہیں پریشانی نہیں تھی مگر شاہ زیب کے معاملے میں اُن کے دل میں اندیشے وسوسے اپنی جگہ تھے۔ اشعر کو کچھ چیزیں سوچنے پہ مجبور کر رہی تھیں۔ جس طرح پپا بار بار عمر انکل کی پریشانیوں اور شاہ زیب کی نالائقیوں کا رونا رو رہے تھے اُسے خطرے کی گھنٹی کی آواز بہت قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ کہ مبادا پپا جلدی رخصتی کا تقاضا نہ شروع کر دیں۔ اشعر برٹش پولیس ڈیپارٹمنٹ میں تھا۔ پپا کے بار بار اصرار پہ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُسے مستقل طور پہ پاکستان جلد آنا ہوگا۔

☆☆☆

اُسے سی آف کرنے پپا کے ساتھ عمر انکل اور شاہ زیب بھی آئے تھے۔ اشعر کا خیال تھا کہ شاید اُن کے ساتھ دریکتا بھی ہو۔ پر گاڑی سے عمر انکل اور شاہ زیب کو اُترتے دیکھ کر اُسے مایوسی ہوئی۔ اُسے یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ اُسے مایوسی کیوں ہوئی تھی۔ نکاح کے بعد اُس کے دل میں ذرہ بھر بھی یہ خواہش نہیں تھی کہ اپنی منکوحہ کا چہرا دیکھے۔ اور اُس نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ ہاں نکاح کے دو دن بعد پپا نے اُسے تصویریں دی تھیں کہ تمہارے نکاح کی ہیں۔ اشعر نے اُنہیں سرسری سا دیکھ کر ایک طرف ڈال دیا تھا۔ لیکن ابھی ائیر پورٹ پہ عمر انکل اور شاہ زیب کے ساتھ دریکتا کو نہ پا کر دل نے کچھ محسوس ضرور کیا تھا۔ اور وہ محسوسات کیا تھے اشعر اُنہیں کوئی زبان یا نام دینے سے قاصر تھا۔

☆☆☆

دریکتا ایک ایک کر کے تمام تصویریں دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اتنی بار دیکھی تھیں کہ ایک ایک تصویر اُسے ازبر ہو گی تھی۔ اُس نے اشعر کی تصویر اُٹھائی جہاں وہ نکاح نامے پہ سائن کر رہا تھا۔ اس میں اُس کے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے میں یوں پیوست تھے جیسے زندگی بھر مسکراہٹ سے نا آشنا رہے ہوں۔ اُس نے ایک اور تصویر اُٹھا کر چہرے کے قریب کر کے دیکھی۔ اشعر کے کندھے اُوپر اُٹھے ہوئے تھے۔ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھا وہ بہت مغرور اور خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال نظر آ رہا تھا۔ دریکتا نے براہ راست تو اُسے ایک بار بھی اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا جس طرح ابھی دیکھ رہی تھی۔ پپا اور شاہ زیب اُسی کو سی آف کرنے ائیر پورٹ گے ہوئے تھے۔ اُن کی غیر موجودگی میں وہ بور ہو رہی تھی۔ سو تصویریں نکال کے دیکھنے بیٹھ گی۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا اگر وہ کبھی اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو وہ شاید اسے اتنی غور سے نہ دیکھ سکے جس طرح ابھی تصویروں میں دیکھ رہی تھی۔ اُس کی گہری گھور بادامی آنکھوں کی چمک ایک ایک تصویر میں عیاں تھی۔ اُسے لگ رہا تھا وہ ان آنکھوں کی چمک کا کبھی بھی سامنا نہیں کر پائے گی۔ اتنی مغرور سی آنکھیں تھیں۔

☆☆☆

وہ خوشیوں سے سرشار تھا۔ پپا نے شادی کے انتظامات بہت اعلیٰ پیمانے پہ کیے تھے۔ دریکتا نے مائرہ کو فون کر کے ایک ایک تفصیل بتائی تھی۔ سب جاننے کے بعد وہ مغرور سی ہو گی تھی۔ تنی گردن کچھ اور بھی تن گی تھی۔ ایک اعلیٰ خاندان کا ڈیشنگ لڑکا اُس کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنے باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ راضی کیا تھا جلدی شادی پہ اور اب اس شادی پہ پانی کی طرح پیسہ بہا دیا تھا مائرہ مغرور نہ ہوتی تو کیا کرتی۔

کسی اور نے اُس جیسی شاندار قسمت نہیں پائی تھی۔ شاہ زیب کے مقابلے میں وہ اتنی خوبصورت بھی نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اُس کا دیوانہ تھا اُس کی آنکھ کے اشارے پہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ دوسری طرف بینا خالہ تھی بڑی حسرت اور ارمانوں سے اُس کا رشتہ مانگا تھا۔ اس کے پیچھے باسط کی دلی خواہش بھی کار فرما تھی۔ مگر شریں کے ارادے کچھ اور تھے۔ باسط کے ارمان مٹی میں مل گے تھے۔ مگر دل سے مائرہ کو پا لینے کا جنون ختم نہیں ہو پا رہا تھا۔ اُس کی شادی کی اطلاع اُن کے گھر تک بھی پہنچ گی تھی۔ بینا جانے کی تیاری کر رہی تھی آخر کو شریں اُس کی بڑی بہن تھی نہ جاتی تو لوگوں نے یہی کہنا تھا کہ مائرہ کے نصیب سے جل گئی ہے۔ اُس نے دل پہ بھاری پتھر رکھ لیا تھا۔ پر باسط ایسا نہیں تھا اُس کے سینے میں پھانس گڑ گئی تھی کہ اُسے شاہ زیب کے مقابلے میں ٹھکرایا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اُس کی طرح دولت مند نہیں تھا نہ ورثے میں اُسے جائیداد ملی تھی لمبی چوڑی وہ خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا پر شاہ زیب کے مقابلے میں اُس کی حیثیت معمولی سی تھی۔ ساتھ باسط خود ابھی پڑھ رہا تھا۔ شاہ زیب کے سامنے وہ شریں خالہ کو کیسے نظر آتا۔

گھر والوں کو بغیر بتائے وہ ملک سے باہر جانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اُس کے ایک دوست نے ہی صلاح دی تھی کہ باہر جا کر قسمت آزمائی کرو یہاں کچھ نہیں رکھا ہے۔ وہ اپنی مثال دیتا کہ دیکھو دو ڈھائی سال میں مَیں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوں۔ باسط نے اُس سے مدد مانگی تھی وہ بخوشی راضی ہو گیا تھا۔ اُس کے ویزے و ٹکٹ اور سفر کے دیگر تمام انتظامات اُسی دوست ریحان نے ہی کرنے تھے۔ اُس نے باسط سے ایک پائی بھی طلب نہیں کی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اُس کا احسان مند تھا کہ ریحان اُس سے کچھ بھی نہیں لے رہا تھا۔ ایک طرح سے وہ اُس پہ احسان کر رہا تھا۔ باسط کے مالی حالات ایسے بھی دگرگوں نہیں تھے کہ باہر جانے کے اخراجات برداشت نہ کر سکتا بس ریحان نے ہی تمام ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور باسط نے بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اُس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ ملک سے باہر جا رہا تھا جہاں دولت اور تمام تر آسائش اُس کی منتظر تھیں۔

☆☆☆

مہمانوں کی آمد شروع ہو گی تھی۔ مائرہ کو مایوں بٹھا دیا گیا تھا۔ بینا سوائے باسط کے تمام فیملی کے ساتھ مایوں سے ایک دن پہلے گاؤں پہنچی تھی۔ اُدھر ہارون زیب اور نوید زیب نے عمر کا مکمل طور پہ بائیکاٹ کا اعلان کیا تھا اُن دونوں میں سے کوئی بھی عمر کے ہاں شاہ زیب کی شادی میں شریک نہیں ہو رہا تھا۔ ہاں اورنگزیب بھائی کی ساری خوشیوں میں وہ شریک تھے۔ اُن کی کدورت عمر کی حد تک تھی۔ اورنگزیب بھائی سے اُنہیں گلہ نہیں تھا۔

☆☆☆

بہت دھوم دھام سے شاہ زیب کی طرف سے مائرہ کی مہندی آئی تھی۔ آج تو عمر زیب بھی بہت خوش اور مسرور تھے۔ بات بات پہ مسکرا رہے تھے۔ تقریب میں موجود دونوں بھائیوں نے اُن سے بات نہیں کی تھی پر وہ اس تلخی کو پی گئے تھے کیونکہ آج بہت عرصے بعد اُنہوں نے شاہ زیب اور دریکتا کے چہرے خوشی سے منور دیکھے تھے۔ مکمل طور پہ بجی بنی دریکتا میں آج اُنہیں آملہ کی مشابہت محسوس ہو رہی تھی۔ اور آج گاؤں مہندی لے کے آنے سے قبل شاہ زیب نے اُن کے گلے لگ کہ اپنی تمام کوتاہیوں کی معافی مانگی تھی۔ عمر کا دل شانت تھا۔ اس کی جھلک اُن کے چہرے پہ بھی تھی۔

مائرہ کو مہندی لگانے کے لیے بڑھتی ہوئی بینا کے قدم وہیں ساکت ہو گے تھے۔ عمر اور دریکتا مائرہ کے پاس ہی موجود تھے۔ پرانے زخموں سے کھرنڈ اُترنے لگا تھا۔ کوئی اُس کے اندر پوری قوت سے چیخا تھا۔ اتنے برس بعد بھی اُسے ٹھکرائے جانے کی اذیت بھولی نہیں تھی۔ عمر کو دیکھ کر ایک ایک تلخی اور کڑواہٹ نوک زبان پہ رکھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے دوبارا پیچھے آ کر بیٹھ گی۔

☆☆☆

شاہ زیب دُولہا بن کے بہت اچھا لگ رہا تھا مردانہ وجاہت اُسے ورثے میں باپ کی طرف سے ملی تھی۔ اورنگزیب تایا کے گھر بارات کا استقبال پھولوں کی پتیوں سے ہوا۔ مائرہ کو شہر کے سب سے مہنگے بیوٹی پارلر کی بیوٹیشن حویلی میں خود تیار کرنے آئی تھی۔ اُس کی خدمات شاہ زیب نے بھاری معاوضے پہ حاصل کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مائرہ کے دل میں کوئی حسرت باقی رہے۔ جب وہ شہر میں اُن کے گھر تھی تو مستقبل کے خوابوں کی اپنی خواہشوں کی باتیں اُس سے کرتی تھی۔ اُسے بہت شوق تھا کہ اپنی شادی کے دن وہ سب سے بہترین پارلر سے تیار ہو۔ سو شاہ زیب نے اُس کی یہ خواہش پوری کر دی تھی۔

نہیں جا رہی تھی۔ ویسے بھی اپنی شادی سے دو ماہ پہلے اُس نے بیوٹیشن کی ہدایات پہ عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب اُس کی دو ماہ کی خود پہ کی گئی محنت کا پھل سب کے سامنے تھا۔ ہر نگاہ اُسی پہ فوکس تھی اُس کے حسن کو سراہ رہی تھی۔ جب اسے شاہ زیب کے برابر لا کر بٹھایا گیا تو سب دیکھنے کے لیے جمع ہو گے۔

فوٹو سیشن ہو رہا تھا۔ دریکتا، عمر زیب، مائرہ اور شاہ زیب کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ بینا کی نظر اسٹیج پہ ہی فوکس تھی۔ شاہ زیب ہو بہو عمر کی جوانی کی تصویر لگ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وقت ایک دم بہت پیچھے چلا گیا ہو۔ بینا کو یوں لگ رہا تھا جیسے شاہ زیب کی جگہ عمر زیب ہو اور مائرہ کی جگہ آملہ ہو۔ مگر نہیں اسٹیج پہ شاہ زیب اپنی دولہن مائرہ کے ساتھ موجود تھا۔ قسمت نے ایک بار پھر اُنہیں شکست دے دی تھی۔ پہلے اُنہیں شکست ہوئی ٹھکرائے جانے کی اذیت جھیلنی پڑی۔ اب یہی اذیت اُن کے لاڈلے بیٹے باسط کے حصے میں آئی تھی۔ پہلے اس کا ذمہ دار عمر تھا اور اب اُسی عمر زیب کا بیٹا تھا جس نے اُن کے باسط کی ساری خوشیاں چھین کر اپنی جھولی میں بھر لی تھیں۔ کتنا خوش اور پُرسکون لگ رہا تھا وہ کاش اس وقت مائرہ کے ساتھ زندہ حقیقت بنا باسط ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ اپنے سارے دکھ بھول جاتی۔ بینا کے دل میں ہوک سی اُٹھی۔ ''کاش باسط کا نصیب مائرہ ہی بنتی''۔ اُن کے دل نے یوں شدت سے انہونی کی خواہش کی تھی۔

شریں سے جب انہوں نے باسط کے رشتے کی بات کی تو اُس نے کہا کہ اورنگزیب تم سے پہلے ہی عمر بھائی کو ہاں کر چکے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہیں بھی خالی ہاتھ نہ لوٹاتی مجبور ہوں اپنے مجازی خدا کے سامنے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ شاہ زیب اور اُس سے وابستہ دولت و جائیداد کو دیکھتے ہوئے اُن کی رال ٹپک پڑی تھی۔ خون کے رشتے اپنی جگہ مگر دولت و جائیداد روپے پیسے کی اپنی ایک الگ اہمیت تھی۔ شریں نے خون پہ اسی چیز کو اہمیت دی تھی۔ جس کی بدولت آج مائرہ شاہ زیب کے پہلو میں دولہن بنی بیٹھی تھی۔ شاہ زیب کے ساتھ اُس کے شاندار مستقبل کا آغاز ہو چکا تھا۔ عمر زیب کی دولت کا وہی تو وارث تھا۔ شادی کے بعد اُس نے تو مائرہ کا بے دام غلام بن کے رہنا تھا ابھی سے وہ اُس کی جنبش ابرو کے اشارے کا منتظر ہوتا تھا۔ بعد میں جو ہونا تھا وہ شریں جیسی ماں کے لیے باعث سکون تھا۔ اپنے انمول گر انہوں نے رخصتی سے قبل مائرہ کو اچھی طرح ازبر کروا دیئے تھے۔ ویسے بھی وہ بہت ہوشیار تھی اور سمجھداری میں شریں سے کچھ بڑھ کر ہی تھی۔ جس طرح شریں نے ساری عمر اورنگزیب جیسے خود سر اور اکھڑ شوہر کو اپنے اشاروں پہ چلایا تھا اسی طرح وہ مائرہ سے بھی یہی توقع کر رہی تھی۔ شاہ زیب تو پہلے سے ہی مائرہ کے ٹرانس میں تھا۔ اُسے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو اُس کی ایک مسکراہٹ اور ناز و انداز سے گھائل ہو جاتا تھا۔

رخصتی کے وقت مائرہ سب گھر والوں سے ملی۔ بیوٹیشن نے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ تمہاری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں نکلنا چاہیے۔ اُس نے پوری ایمانداری سے اس پہ عمل کیا تھا۔ شریں، اورنگزیب، مائرہ کے دیگر بہن بھائی یہاں تک کہ دریکتا کے بھی اس موقعے پہ آنسو نکل آئے تھے۔ پر مائرہ کی آنکھیں خشک صحراؤں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

عمر زیب نے نوید بھائی سمیت اُسے پکڑ کر سجی سنوری گاڑی میں لا کر بٹھایا۔ بارات کی واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ مگر یہ شاہ زیب کے سنہرے خوابوں کے آغاز کا سفر تھا۔ وہ آج کس قدر خوش تھا اُسے اپنی اس خوشی کے اظہار کے لیے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ بات بات پہ اُس کے لب مسکرا رہے تھے اور مسکراتے ہوئے اُس کی آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ گی تھی۔ بالآخر اُس نے پیا کی تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود مائرہ کو پا ہی لیا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اب اُسے مائرہ کی

صرف اور صرف اُس کی تھی۔

مرے ہمسفر! تری نذر ہیں مری عمر بھر کی یہ دولتیں
مرے شعر و میری صداقتیں، مری دھڑکنیں، مری چاہتیں
تجھے جذب کر لوں لہو میں میں کہ فراق کا نہ رہے خطر
تری دھڑکنوں میں اُتار دوں میں یہ خواب خواب رفاقتیں
یہ ردائے جاں تجھے سونپ دوں کہ نہ دھوپ تجھ کو کڑی لگے
تجھے دکھ نہ دیں مرے جیتے جی سر دشت غم کی تمازتیں!!
مری صبح تیری صدا سے ہو مری شام تیری ضیا سے ہو
یہی طرز پرستش دل رکھیں تری خوشبو کی سفارشیں
کوئی ایسی نرم بہار ہو میں جہاں یقین دلا سکوں!!
کہ ترا ہی نام ہے فصل گل، کہ تجھی سے ہی یہ کرامتیں
ترا قرض ہیں مرے روز و شب مرے پاس اپنا تو کچھ نہیں
مری روح مری متاع فن، مرے سانس، تیری امانتیں

شاہ زیب کی دھیمی خوابناک کی آواز مائرہ کی سماعتوں میں قطرہ قطرہ بہار کی پہلی بارش کی طرح برس رہی تھی۔

اُس کا بیڈروم تاحد نظر گلاب کے پھولوں سے بھرا ہوا شام جاں تک کو معطر کر رہا تھا۔ مائرہ کا استقبال اُس نے پھولوں سے کیا تھا۔ کانچ کی نازک گڑیا کی طرح اُسے تھاما تھا۔ کتنی دیر اُس کے چہرے سے زرتار دوپٹہ ہٹا کے وہ اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا جیسے اپنی آنکھوں کو یقین دلانا چاہتا ہو کہ واقعی اُس کے سامنے مائرہ ہی ہے۔ اُس کا خواب، اُس کی آرزو اُس کی پہلی خواہش، جلتے بلتے صحرا میں مانگی ہوئی دعا کی طرح واقعی وہ مائرہ ہی تھی اُس کی ہم سفر اُس کی خلوتوں کی ہم نشین اُس کی قربتوں اور تنہائی کی ساتھی اُس کی محبت مائرہ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُس کی بن چکی تھی۔ وہ آنکھوں کے راستے اُس کا سراپا پور پور جذب کر رہا تھا دل میں اتار رہا تھا۔ خاصی دیر بعد اُسے رونمائی کا گفٹ دینے کا ہوش آیا۔ پلاٹینم کا بہت نازک اور اسٹائلش سا سیٹ تھا۔ مائرہ نے ایک نظر دیکھ کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔ شاہ زیب اُسے دیکھ رہا تھا۔ ان نگاہوں کی زبان مائرہ کے لیے اجنبی نہیں تھی۔

شاہ زیب کی وارفتگی، بے تابی اور بے قراری سب کچھ خود ہی بتا رہی تھی۔ اور جب مائرہ نے اُس کے ہاتھ میں اپنا نازک سا ہاتھ دیا تو وہ مارے خوشی کے بے قابو سا ہوگیا۔ مائرہ نے بالآخر اُسے پذیرائی بخش ہی دی تھی۔

☆☆☆

کھڑکی کے راستے سورج کی کرنیں کمرے میں جھانک رہی تھیں۔ شاہ زیب کی آنکھ خود بہ خود ہی کھلی تھی۔ فوراً نظر دیوار گیر گھڑی پہ پڑی جو ساڑھے گیارہ کا وقت بتا رہی تھی۔ وہ فوراً بیڈ سے نیچے اُترا۔ ولیمہ شام کو تھا پر مائرہ نے تیار ہونے پارلر جانا تھا۔ وہ تکیے میں سر چھپائے بے خبر سو رہی تھی۔ رات کے حسین لمحوں کا سوچ کر شاہ زیب کے لبوں پہ مسکراہٹ آ گئی اُس نے دھیرے سے مائرہ کے چہرے پہ آئے بال پیچھے کیے ''مائرہ اُٹھ جاؤ بہت ٹائم ہوگیا ہے''۔ وہ جھک کے بالکل اُس کے کان میں بولا۔ تین چار بار یہی کہہ دہرانے پہ مائرہ اٹھ ہی گئی۔ اُف اتنا ٹائم ہوگیا ہے۔ اُس کی نگاہ سب سے پہلے گھڑی پہ ہی پڑی۔ پھر باقی کے کام اُس نے بڑی تیزی سے نمٹائے۔ الماری سے خود ہی کپڑے منتخب کر کے پہنے۔

دریکتا اُنہیں جگانے اور تیار ہونے کا کہنے آئی تو مائرہ جیولری پہنے ہلکا ہلکا میک اَپ کر کے بالکل تیار بیٹھی تھی۔

دریکتا محبت سے اُس کے گلے لگ گی اور اُس کا ماتھا چوما ''بھابھی آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں'' اب اُس کے انداز میں پہلے سے بڑھ کر احترام شامل ہوگیا تھا۔ جواباً وہ مسکرا دی۔ وہ تینوں اکٹھے آگے پیچھے چلتے ہوئے ڈائننگ ہال میں پہنچے تو عمر اپنی کرسی سے کھڑے ہوگئے۔ خود مائرہ کو تھام کے اپنے برابر بٹھایا۔ ''اپنے گھر میں زندگی کی نئی صبح مبارک ہو''۔ اُنہوں نے بڑی محبت سے اُس کے ماتھے پہ بوسہ دیا۔ وہ بھاری دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اُن کے پاس بیٹھ گی۔ شاہ زیب نے بھی اپنی کرسی گھسیٹ کے اُس کے قریب کر لی۔ عمر زیب نے ایک ایک چیز اصرار سے مائرہ کو کھلائی۔ ناشتے کے بعد دریکتا نے اُس کے ولیمے کا سوٹ، سینڈل اور جیولری وغیرہ نکال کے رکھی۔ اُسے پارلر بھی جانا تھا۔

مائرہ کے پارلر جانے سے پہلے ہی شریں، اور دیگر فیملی آ گئی۔ وہ اُن کے ساتھ باتوں میں لگ گی۔ دریکتا مائرہ کے ساتھ پارلر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ وہ تیار ہو کر اُسے بتانے آئی تو مائرہ اپنی چھوٹی بہن اور شریں تائی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ اُس کے سامنے ہی گاڑی گیٹ سے نکلی۔ وہ حیرت سے اُدھر ہی دیکھ رہی تھی۔ مائرہ بھابھی کو اچھی طرح پتہ تھا کہ وہ اُن کے ساتھ جائے گی پھر وہ بغیر بتائے اس طرح چلی گئیں۔ پہلی بار اُسے دکھ سا ہوا کیونکہ پاپا نے بھی کہا تھا کہ تم اپنی بھابھی کے ساتھ چلی جانا۔ خیر اُس کے پاس اس وقت اتنا ٹائم نہیں تھا کہ وہ سوچ کے پھر کڑھتی۔ شادی والا گھر تھا سو کام تھے اُسے سب کچھ دیکھنا تھا۔ گھر میں ددھیال کی طرف سے صرف ابھی تک شریں تائی اور اُن کی فیملی ہی آئی تھی۔ باقی مہمانوں نے شام تک ہی آنا تھا۔ ہارون اور نوید چچا اور اُن کے گھر والے ناراض تھے سوائے اکیلے ہی کچھ کرنا تھا۔ شریں تائی اور مائرہ کی بہن بھی پارلر جا چکی تھیں۔

گھر میں نوکرانیاں لگی ہوئی تھیں اور کل کا پھیلاوا سمیٹ رہی تھیں۔ دریکتا بھی اُنہیں کام بتانے میں لگ گئی۔

مائرہ کل سے بھی بڑھ کر آج حسین لگ رہی تھی۔ اُس کے برابر بیٹھا شاہ زیب بار بار اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اُس کا نقش نقش ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دل میں اُتار لے۔

ایسا ہی پاگل اور دیوانہ تھا وہ۔ پوری تقریب کے دوران وہ ایک بار بھی اُس کے پاس سے نہیں ہٹا۔ دوست احباب ملنے جلنے والے خود ہی آ کر مبارکباد دیتے رہے۔ جنہیں وہ مسکرا مسکرا کر خوشی سے وصول کرتا رہا۔ شریں بڑی مسرور تھی۔ اُنہیں اب یقین ہوگیا تھا کہ مائرہ ساری زندگی اپنے شوہر کے دل و دماغ پہ حکمرانی کرے گی۔ اُسے ناز و انداز کے ایسے جال میں جکڑ کے رکھے گی کہ وہ کاٹھ کا اُلو بن کے ہر بات پہ ہاں ہاں ہی کرے گا۔

☆☆☆

''مائرہ اُٹھ بھی جاؤ ناں جان، کافی ٹائم ہوگیا ہے۔ اب تو پاپا بھی آفس کے لیے جا چکے ہوں گے''۔ میں نے بات کرنی تھی اُن سے۔ ''تم نے جگایا ہی نہیں مجھے''۔ اُس نے جھک کے مائرہ کے ساتھ خوبصورت سی شرارت کر دی۔ وہ زلفیں سنبھالتی ایک جھٹکے سے اُٹھی اور اُس سے قدرے دور ہوگی۔ اپنی خوشی میں وہ محسوس ہی نہ کر سکا کہ مائرہ کے چہرے پہ بیزاری سی ہے۔ ''کیسے جگاتی میں آپ کو؟ روز لیٹ سوتی ہوں۔ سکون کی نیند کو ترس گی ہوں۔ آپ مجھے سونے ہی نہیں دیتے ہو''۔ اب کی بار اُس نے غصہ نہیں چھپایا۔ پورا دن ہوتا ہے تمہارے پاس آرام سے سویا کرو۔ وہ مزے سے بولا تو

مائرہ چپل پہن کے باتھ روم میں چلی گئی دروازہ زور سے بند کیا جو اُس کے واضح غصے کا اظہار تھا۔

مائرہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ شاہ زیب نے اُس کی صورت میں نئی دنیا دریافت کی تھی اپنے جذبات کے اظہار میں وہ کسی قسم کی کنجوسی نہیں کرتا تھا۔ دل یہی کرتا تھا کہ مائرہ ہر وقت اُس کے پاس رہے۔ دریکتا کالج اور عمر آفس چلے جاتے۔ وہ دونوں بہت لیٹ جاگتے ناشتہ کرتے۔ تھوڑا وقت گزرتے ہی شاہ زیب کی بے قراری عروج پہ پہنچ جاتی بس ایک بار پھر مائرہ ہوتی اور شاہ زیب کی وارفتگیاں۔

☆☆☆

مائرہ شاہ زیب کے ساتھ میکے آئی ہوئی تھی۔ دو دن وہ اُس کے ساتھ گاؤں میں ہی رہا۔ عمر زیب کی کال آئی تو واپس گیا۔ اُنہیں کوئی کام تھا ورنہ وہ مائرہ کے ساتھ ہی واپس آتا۔ باسط کے باہر جانے کے انتظامات مکمل ہو گئے تھے۔ وہ گاؤں شیریں خالہ سے ملنے آیا ہوا تھا مائرہ بھی اِدھر ہی موجود تھی۔ وہ اُس کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔ پر ہونی ہو کے رہی وہ اس وقت اُس کے سامنے بیٹھی تھی۔ ڈیزائنر کے ڈائزین کردہ مہنگے سوٹ میں ملبوس جیولری سے آراستہ ہلکا ہلکا میک اپ کیے وہ روز اول کی طرح ہی اُسے اپنی رسائی سے بہت دور لگ رہی تھی۔ باسط کو کسی بہت زیاں کا شدید احساس ہوا تھا۔ وہ اُس سے تفصیلات پوچھ رہی تھی کس طرح جا رہے ہو۔ وہاں کون سی جاب ملی ہے تمہاری تعلیم کا کیا ہوگا۔ باسط ہوں ہاں کرتا رہا۔

''باسط تم ٹھیک طرح بات کیوں نہیں کر رہے۔'' ''کیوں کیا ہوا ہے۔ اور کیسے بات کروں۔'' اُلٹا اُس نے مائرہ سے سوال کر دیا۔ ''تم کھوئے کھوئے سے ہو جیسے تمہارا ذہن کہیں اور ہو۔''

''جو شخص اپنی محبت کو کھو دے وہ کھویا کھویا سا نہ ہو تو کیا ہو۔'' باسط کا لہجہ بہت کاٹ دار تھا، تمہارا شوہر بہت خوش قسمت ہے۔ لیکن مجھے بتاؤ مجھ میں کیا کمی تھی۔ جو شیریں خالہ نے شاہ زیب کو فوقیت دی۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق ہے۔ پڑھ لکھ کے اپنا مستقبل بنا سکتا ہوں۔ صحت مند ہوں۔ اچھی شکل و صورت ہے۔ میں مانتا ہوں تم سے تھوڑا ہی بڑا ہوں مگر میری صحت اور قد کاٹھ کو دیکھو تمہارے شوہر سے بھی بڑا اور میچور نظر آتا ہوں۔ اصل عمر وہی ہوتی ہے جو نظر آتی ہے۔ میری عمر تم سے زیادہ ہے اور ہاں تمہیں سنبھال سکتا تھا میں ذہنی جذباتی ہر طرح سے۔ آخر میں باسط کا لہجہ بہت عجیب سا ہو گیا تھا۔ مائرہ اُس کی بات کی تہہ میں چھپے مفہوم تک پہنچ گئی تھی اور اُس کے چہرے پہ سرخی آ گئی تھی۔ باسط ایک مکمل مرد نظر آ رہا تھا اور اُس کی سوچ بھی مردوں والی تھی۔ ایک شاہ زیب تھا جسے موج مستی اور ہلے گلے سے ہی فرصت نہیں تھی رومانس کے سوا اُسے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ بیٹھے بٹھائے سب مل رہا تھا اُسے ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

باسط کی نگاہوں میں کیسی حسرت اور پیاس تھی۔ جانے کیوں مائرہ کو وہ حسرت اور پیاس سے بھری نظر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کہیں اندر تک پنجے گاڑ رہی تھی۔ شیریں خالہ نے باسط کو بصد اصرار رات اپنے پاس ہی ٹھہرا لیا۔

سونے سے پہلے مائرہ اُس کے پاس پوچھنے آئی کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے وہ چینج کر کے لیٹا ہوا تھا۔ ایک ہلکی سی بنیان اور ٹراؤزر شب خوابی کے لباس کے نام پہ اُس کے جسم پہ موجود تھا۔ مائرہ کو دیکھ کے وہ اُٹھ بیٹھا۔ ''ابھی تک سوئے نہیں ہو۔'' وہ بھی اُس کے سامنے تک گئی۔ ''کسی کے خواب سونے دیں تو تب ناں۔'' وہ برجستہ بولا تو مائرہ خاموش ہو گی۔ کافی دیر اُس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ ''اچھا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے اگر۔ ہے تو بتاؤ۔'' ''واقعی مجھے جس کی ضرورت ہے وہ دے سکتی ہو۔'' وہ جانچتی نگاہوں سے اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر خاموشی طاری رہی اُسے باسط نے ہی توڑا۔

مجھے پتہ ہے بہت نامراد شے ہے جنوں
اُسے کہو کہ مجھے بہت جنوں ہے اس کا

باسط کا لہجہ اُسے دہکتا محسوس ہوا۔ یوں لگ رہا تھا۔ یہ آنچ اُس کے دامن کو جلا دے گی۔ وہ کن راستوں پہ چل پڑا تھا۔ جانے یہ راستہ فنا کا تھا کہ بقا کا۔

☆☆☆

رات کے پُرسحر سناٹے میں وہ پوری طرح مائرہ کی طرف متوجہ تھا۔ پر اُس کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ مائرہ کی چوڑیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا جب اُس نے اپنی کلائی پیچھے کی۔

''شاہ زیب آپ چچا کے ساتھ آفس جانا شروع کر دیں وہ اب بوڑھے ہو رہے ہیں آپ کا بھی فرض بنتا ہے کہ اُن کے ساتھ بوجھ بانٹیں۔ شادی شدہ ہیں آپ۔ کب تک اخراجات کے لیے اُن سے مانگتے رہیں گے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا جب وہ ہر ماہ آپ کو چیک دیتے ہیں کہ کیش کرا لو۔ کاروبار اور ہر چیز میں آپ بھی حصہ دار ہیں حق بنتا ہے آپ کا ہر چیز پہ۔ اور آپ ہیں کہ بھیک منگوں کی طرح ہر چیز اُن سے مانگتے ہیں۔'' مائرہ جانے کیا باور کروانا چاہ رہی تھی پر اُس کا آخری جملہ سن کر شاہ زیب کو غصہ آ گیا۔ ''میں بھیک منگا نہیں عمر زیب کا بیٹا ہوں۔'' ''آپ بھیک منگے ہیں اگر مالک ہوتے تو اُن کے محتاج نہ ہوتے۔ عمر چچا پوری جائیداد کاروبار اور بینک بیلنس کے مالک ہیں۔ اُنہوں نے ہر چیز کا اختیار اپنے پاس رکھا ہے۔ آپ کے پاس کیا ہے مجھے بتا سکتے ہیں؟ وہ طنزیہ ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گی۔ شاہ زیب کا رومانوی موڈ غارت ہو چکا تھا۔ ''میں مالک ہوں ہر چیز کا۔'' ''کیسے؟'' جواباً وہ بے بسی سے اُسے دیکھ کر رہ گیا۔ ''ہاں ہاں بولیں ناں آپ کہ کس طرح مالک ہیں آپ''۔ مائرہ کی نگاہیں اُسے برمے کی طرح چھید رہی تھیں۔ ''بس میں مالک کا بیٹا ہوں پپا کا'' جھنجھلا سا گیا وہ۔ مائرہ ہنسنے لگی۔ کاٹ دار ہنسی۔ ''آپ بیٹے ہیں مالک نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے چچا نے آپ کو ہر قسم کی سہولت دی ہے شادی پہ جی بھر کے فضول خرچی کی ہے پر مالک چچا ہیں سب جائیداد کے کیونکہ وہ بااختیار ہیں آپ کو دیتے ہیں آپ سے لیتے نہیں ہیں۔'' ''میں پھر بھلا کیا کروں مائرہ'' وہ مدد طلب نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مائرہ کے لبوں پہ پُراسرار مسکراہٹ آ گئی۔ اتنے عرصے میں پہلی بار اُس نے عقل مندی کی بات کی تھی۔ ''آپ اس طرح کریں کہ صبح سے آفس جانا شروع کر دیں۔ چچا کو دیکھیں، سمجھیں کہ وہ کس طرح کام کرتے ہیں۔ جب آپ نے آفس ورک اور اسٹاف کے مزاج کو جان لیا تو باقی پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ آپ سو جائیں کیونکہ آفس بھی جانا ہے'' سچ مچ شاہ زیب بڑی سعادت مندی سے تکیہ سیدھا کر کے سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔

مائرہ نے اُس کے سونے کے بعد اُس کی طرف سے کروٹ بدل لی۔ شیریں نے ہی کہا تھا کہ شاہ زیب کو آفس جوائن کرنے کے لیے کہو۔ اُنہوں نے اُسے آنے والے وقت سے ڈرایا۔ سب کچھ عمر کے ہاتھ میں ہے۔ شاہ زیب کو بھی با اختیار ہونا چاہیے۔ ایسا ممکن تھا اگر وہ آفس جانا شروع کر دیتا کام کو سمجھتا۔ پھر باقی کے مراحل بھی آسان ہو جانے تھے۔

مائرہ بھی آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن خیالوں کی رو بہک کر باسط کی طرف چلی گی۔ وہ پاکستان سے جا چکا تھا پر اُس کے خیالوں سے نہیں جا پا رہا تھا۔ اُسے باسط سے آخری ملاقات اور وہ پیاس بھری نگاہ، ایک شدید سی طلب اچھی طرح یاد تھی کچھ بھی تو نہیں بھولا تھا۔ کیسا چھا جانے والا اور اپنی منوانے والا شخص تھا وہ۔ اور ایک یہ شاہ زیب۔ اُس نے اپنے پہلو میں بے سدھ سوئے ہوئے شاہ زیب کو دیکھا۔ اُس کی اُنگلی پکڑ کے چلنے والوں میں سے تھا۔

کوئی آنا۔ کوئی خودداری۔ کوئی عزت نفس ہی نہیں تھی جس میں۔ بس بیوی کی جوتیاں سیدھی کرنے میں سکون ملتا تھا اُسے۔ شاہ زیب کا بس چلتا تو ساری عمر مائرہ کے گھٹنے سے لگ کے بیٹھا رہتا۔ ''ہونہہ''۔ مائرہ نے سر جھٹکتے ہوئے اُس کی طرف سے نظر گھمائی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

طاہر لغاری کی طبیعت معمولی سی بگڑی تھی ہلکا سا سینے میں درد اُٹھا انہوں نے نظرانداز کر دیا آئندہ آنے والے دنوں میں اُن کی طبیعت زیادہ خراب ہوگی۔ ہنگامی حالت میں ہاسپٹل لے جایا گیا اُن کو ڈاکٹرز نے ہارٹ اٹیک بتایا۔ اشعر لغاری تک فوراً یہ اطلاع پہنچی تھی۔ اُس نے اسی میں عافیت تصور کی کہ پپا کے پاس لوٹ آئے۔

ہفتہ دس دن میں طاہر لغاری صحت یاب ہو کر گھر آ گئے۔ اُن کے ڈسچارج ہونے کے کچھ دن بعد اشعر بھی پاکستان پہنچ گیا۔ جب اُس نے یہ بتایا کہ وہ پکا پکا اُن کے پاس آ گیا ہے تو انہوں نے نئی توانائی رگ و پے میں دوڑتی محسوس کی۔ یوں لگتا تھا وہ کبھی بیمار ہوئے ہی نہیں تھے۔ اشعر نے واپس آ کر مستقبل کی منصوبہ بندی کا آغاز کر دیا تھا۔

کرمنالوجی کی اعلیٰ ڈگری اور اس فیلڈ میں کچھ تجربہ بھی اُس کے پاس موجود تھا۔ سو ''اسپیشل کرائم برانچ'' میں جاب ملنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ وہ جوائن کر چکا تھا۔ طاہر لغاری نے کہا کہ کسی دن ٹائم ملے تو عمر انکل سے مل آؤ۔ اُس نے غائب دماغی سے سر ہلایا تھا۔

☆☆☆

شاہ زیب نے عمر کے ساتھ آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ انہیں بہت اچھا لگا تھا کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہو رہا تھا وہ اُسے پاس بٹھا کے کاروباری اسرار و رموز کی بابت بتاتے۔ اسی طرح کرتے کراتے اُس نے پہلا ماہ بڑے آرام سے گزار لیا تھا۔ آفس آ تو جاتا پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد مائرہ کو فون کرتا کیا کر رہی ہو۔ کیا سوچ رہی ہو۔ کچھ کھایا ہے کہ نہیں۔ مجھے مس کیا کہ نہیں۔ اور اپنا خیال رکھنا میں شام کو جلدی آؤں گا پھر باہر چلیں گے۔ اُس کی گفتگو روزانہ اسی قسم کی ہوتی۔ گھر واپسی پہ تو وہ جیسے پھر مائرہ کا سایہ ہی بن جاتا۔ اُسے ایک پل کے لیے بھی دور نہ ہونے دیتا وہ روٹھتی نخرے کرتی اور وہ ہاتھ جوڑ کے مناتا۔

☆☆☆

باسط اپنی منزل پہ پہنچ چکا تھا۔ اُس کے دوست نے روانگی سے قبل ایک بند پیکٹ میں کچھ سامان اُس کے سپرد کیا تھا کہ یہ ایئرپورٹ اُترتے ہی تم نے ایک شخص کے حوالے کرنا ہے۔ اُس شخص کا حلیہ عمر، نام وغیرہ اور اس طرح کی دیگر معلومات اُسے مل گئی تھیں۔ وہ شخص اُسے ایئرپورٹ سے باہر نکلتے ہی مل گیا تھا۔ وہی شخص باسط کو اُس کی رہائش گاہ تک اپنی گاڑی میں بٹھا کے لایا تھا۔ وہاں باسط جیسے تین اور نوجوان بھی تھے۔ باسط کو اب اُن کے ساتھ ہی رہنا تھا۔

ایئرپورٹ پہ جو شخص باسط کو ملا تھا اُس کا نام اسد گردیزی تھا۔ اُسے رہائش گاہ تک پہنچا کے جانے سے قبل اُس نے پھولا ہوا ایک خاکی لفافہ باسط کے سپرد کیا ''پھر جب کام ہوگا تمہارے پاس آؤں گا۔ فی الحال لائف انجوائے کرو۔'' اُس نے باسط کے کندھے پہ دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔ باسط کی نگاہ پھولے ہوئے خاکی لفافے پہ تھی۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا جانے اس خالی لفافے میں کیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں لکھا سوال اسد گردیزی نے بھی پڑھ لیا۔ ''یہ تمہاری خدمت کا معاوضہ ہے جو تم نے ہمارے لیے سرانجام دی ہے''۔ ''مگر میں نے تو کوئی کام نہیں کیا''۔ وہ اُلجھن بھرے انداز میں اُسے اب بھی دیکھ رہا تھا۔ ''کام تو تم نے کیا ہے اور اپنی خوبی سے کیا ہے کہ میں بھی داد دینے پہ مجبور ہو گیا ہوں۔ جو پیکٹ تم نے مجھے دیا ہے وہی تو تمہاری خدمت ہے اور جو میں نے اس کے عوض تمہیں دیا وہ تمہارا حق۔ اب چلتا ہوں پریشان مت ہو۔ باقی باتیں تمہیں تمہارے ساتھ رہائش پذیر لڑکے بتا دیں گے۔ پھر بھی کوئی مشکل یا پریشانی ہو تو مجھے کال کر لینا یہ میرا نمبر ہے۔ اب میں چلتا ہوں''۔ حیران پریشان کھڑے باسط کے ہاتھ پہ اسد نے ایک کارڈ رکھا اور پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ باسط نے ہاتھ میں پکڑا کارڈ غور سے دیکھا۔ اس میں اسد کا نام اور دو سیل نمبر درج تھے۔ اُس نے کارڈ اپنی پینٹ کی جیب میں ٹھونس دیا۔ اُسے خاکی لفافے کو دیکھنے کی جلدی تھی۔ مگر کمرے میں موجود تینوں لڑکے اُس کے تعارف کے منتظر تھے۔ وہ بادل نخواستہ اُن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اُس نے شکر کیا جب وہ سب ایک ایک کر کے وہاں سے اُٹھے اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ اُس کی تو آنکھیں ایسے خیرہ ہوئیں جیسے چالیس چوروں کا خزانہ دیکھ لیا ہو۔ اُس نے ایک ایک کر کے تمام نوٹ گنے۔ از سر نو اُس نے یہی عمل پھر دہرایا۔ یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ اُس نے پاکستانی روپوں میں لفافے میں موجود ڈالرز کا حساب لگایا۔ خوشی سے چہرا چمک اُٹھا۔

اُس کے خوابوں کے پہلے پڑاؤ میں ہی اُسے ناقابل یقین آسانی ملی تھی۔ اس طرح تو محض چند ماہ میں ہی اُس نے خوشحال ہو جانا تھا۔ دنیا کی ہر آسائش اُس کے قدموں تلے ہونی تھی۔

☆☆☆

باسط نے اے ٹی ایم کے ذریعے پیسے بھیجے تھے۔ بینا کے ہاتھ میں جب پیسے آئے تو اُس نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے مجازی خدا حمزہ احمد کی طرف دیکھا ''اپنے باسط نے بھیجے ہیں پورے ایک لاکھ بیس ہزار ہیں گن لو۔ رات اُس کا فون آیا تھا کہہ رہا تھا۔ اگلی بار اس سے بھی زیادہ بھجواؤں گا''۔ ''کیا اتنے زیادہ پیسے''۔ بینا کے ہاتھ لرزنے لگے۔ ''ہاں اُسے اچھی نوکری مل گئی ہے۔ ہمارے تو نصیب کھل گئے ہیں۔ ہمارا بیٹا ہے تو چھوٹی عمر کا پر بہت عقل مند ہے۔ دیکھ لو ایسی نوکری قسمت والوں کو ملتی ہے جس کی اتنی تنخواہ ہو۔ ہمارے حالات اللہ کے فضل و کرم سے پہلے بھی بہت اچھے ہیں۔ اب باسط کی کمائی کی وجہ سے اور بھی اچھے ہو جائیں گے۔ ذرا پیسے ہاتھ میں آنے دو یہ کرولا فروخت کر کے میں کوئی زیرو میٹر گاڑی لوں گا۔ اور اچھا سا بنگلہ بنواؤں گا اپنے باسط کے لیے۔ اس بار اُس نے سالگرہ بھی ہمارے بغیر منائی ہوگی وطن سے دور''۔ حمزہ احمد بولتے بولتے افسردہ ہو گئے۔ بینا کی بھی ایسی ہی حالت تھی۔ ''میرا بیٹا چھوٹی عمر سے ہی روزگار اور نوکری کے چکر میں پڑ گیا ہے اُس کی عمر کے باقی لڑکے بے فکری سے گھومتے پھرتے ہیں۔ ایک میرا باسط ہے پردیس کی خاک چھان رہا ہے''۔ بینا کے آنسو نکل آئے۔ ان آنسوؤں میں ممتا اور پیار تھا باسط کی جدائی کا غم شامل تھا۔ ''ارے نیک بخت کیوں روتی ہو۔ شکر کرو کہ بیٹا کماؤ پوت ہو گیا ہے۔ ہمارا بھی خاندان میں نام ہوگا عزت ہوگی۔ جس کے پاس ڈھیروں روپیہ ہو۔ اُسی کی ڈھیروں عزت ہوتی ہے۔ تم ان باتوں کو کیوں نہیں دیکھتی ہو''۔ حمزہ احمد نے کچھ باور کروایا تو اُس نے آنسوؤں کی نمی دوپٹے میں ہی جذب کر لی۔

☆☆☆

''جان'' مائرہ کا لہجہ مخصوص لگاوٹ میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاہ زیب ہزار جان سے فدا ہو گیا اور بڑے پیار سے اُسے تکنے لگا۔ ''کیا بات ہے سوئیٹ ہارٹ''۔ ''میں کچھ سوچ رہی تھی''۔ ''کیا؟''۔ ''میں آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کتنی محنت کر رہے ہیں میرے لیے''۔ مائرہ نے اپنا سر اُس کے سینے پہ رکھ دیا۔ اُس کی انگلیاں شاہ زیب کے سر کے بالوں

میں سرسرا رہی تھیں''۔ وہ اُس کے پیار کے نشے میں سرشار ہو رہا تھا۔ سکون و طمانیت انگ انگ میں دوڑ رہی تھی۔ اپنی محبوب بیوی کی ذرا سی توجہ، محبت اور خیال اُسے نہال کر دیتا تھا۔ ''لو میں کون سی ایسی خاص محنت کر رہا ہوں تمہارے لیے''۔ ''محنت ہی تو کر رہے ہیں۔ آپ نے آرام و آسائش میں زندگی گزاری ہے اور میں نے آپ کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے آپ نے آفس جانا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ آپ کے مزاج میں نہیں تھا''۔ مائرہ کا لہجہ محبت میں شرابور تھا۔ ''تو اچھا ہوا ناں مجھے بھی زندگی کی مشکلات کا احساس ہوا ہے اور تم میری ذمہ داری ہو۔ سوئیٹ ہارٹ تمہارے لیے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں یہ تو عام سا کام ہے''۔

''شاہ زیب میں آپ کو تارے توڑ کے لانے کے لیے نہیں کہوں گی مگر آپ فیوچر کی فکر بھی کریں ساری زندگی ہم نے دو تو نہیں رہنا ہمارے بچے بھی ہوں گے اُن کی سو ضروریات ہوں گی''۔ اب وہ محبوبہ کی جگہ ناصح لگ رہی تھی۔ ''جب بچے ہوئے تو دیکھا جائے گا اُن کی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں گی۔ تم فکر مت کرو''۔ اُس نے پیار سے مائرہ کے ماتھے پہ آئے بال پیچھے کیے۔ جس کی پُرسوچ نگاہیں شاہ زیب کی طرف ہی مرکوز تھیں۔

شاہ زیب میں اپنے ہونے والے بچوں کو دنیا کی ہر سہولت و آسائش دینا چاہتی ہوں...... وہ بولتے رُک گئی اور ذرا دیر بعد پھر گویا ہوئی۔ ''ان کے آرام و آسائش کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے پاس بھی کچھ ہو میرا مطلب ہے کوئی پراپرٹی بینک بیلنس تاکہ ہم اپنی مرضی سے سب کچھ استعمال کر سکیں نا کہ کسی اور سے مانگیں''۔ ''سب کچھ میرا ہی تو ہے اور جو چیز میری ہے وہ ظاہر ہے میرے بچوں کی بھی ہے''۔ شاہ زیب نے اُس کی بات درمیان سے کاٹ دی مگر وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھی۔ ''شاہ زیب آپ جائیداد میں سے اپنا حصہ طلب کریں''۔ اُس نے بہت نارمل انداز میں یہ بات کہی تھی جیسے اس کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو۔ مگر شاہ زیب اپنے آپ میں بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ وہ لیٹے سے اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ ''ایک دن سب میرا ہی ہوگا''۔ اُس نے کمزور سے لہجے میں ہلکا سا سنبھالا لینے کی کوشش کی تھی۔

''اب آپ شادی شدہ ہیں۔ عمر چچا کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ آپ کی ایک بیوی ہے ایک لائف ہے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میرا شوہر مالک و اختیار ہو اس جائیداد کا۔ آپ اپنا حصہ مانگیں اور جب مل جائے تو الگ سے اپنا کاروبار شروع کریں کیونکہ ابو کہتے ہیں کہ عمر چچا وقت کے ساتھ بالکل بھی نہیں بدلے وہ ابھی تک فرسودہ طریقے سے کاروبار کر رہے ہیں لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں پر اُن کا انداز نہیں بدلا ہے۔ آپ جوان ہیں آپ کے پاس نئی سوچ اور نئے آئیڈیاز ہیں۔ دیکھیے گا آپ جب اپنا بزنس شروع کریں گے تو کیسے کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ میرے سب خواب ایک ایک کر کے حقیقت بن جائیں گے۔'' بس آپ ذرا ہمت کریں۔

وہ اُسے جوش دلا رہی تھی، خوابوں کی وادی کی سیر پہ مجبور کر رہی تھی۔ سچ مچ شاہ زیب کو اپنے آپ میں تازگی و سرمستی محسوس ہونے لگی۔ اُس کے الفاظ کی اُنگلی پکڑے پکڑے وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکا تھا۔ اپنا بزنس، اپنا آفس، اپنا اسٹاف، اپنی مرضی اپنا حکم، ہر چیز پہ اپنا اختیار، اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا گولڈن چانس۔ کتنا خوبصورت ہوتا سب کچھ۔ اپنی مرضی اور اپنے اختیار کا نشہ ہی کتنا سرور آگیں تھا۔ جو بات وہ پہلے سوچ بھی نہیں سکتا تھا اب بڑے آرام سے پلان کر رہا تھا۔ در پردہ مائرہ کا بڑھاوا اور مدد بھی شامل تھی۔ اُس نے پپا سے بات کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا۔

مائرہ نے اُس کے دماغ میں ڈال دیا تھا کہ سب کچھ تمہارا ہے جو چیز تمہاری ہے اُس کا مطالبہ کرنے میں کوئی

شرم کی بات نہیں ہے۔ اب تو اُس کے ذہن نے کچھ عجیب عجیب سی باتیں بھی سوچنا شروع کر دی تھیں۔ جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ تک نہ تھا۔

☆☆☆

مائرہ نے سوئے ہوئے شاہ زیب کے چہرے سے نگاہ ہٹالی۔ درحقیقت وہ دل میں بہت مسرور تھی۔ جو بات وہ شاہ زیب کے دماغ میں ڈالنا چاہ رہی تھی۔ وہ اُس نے ڈال لی تھی۔ اب اُس نے اپنا کام بخوبی کر لینا تھا۔ بس وقت اور سامنے آنے والے نتائج کا انتظار کرنا تھا۔ اور یہ انتظار زیادہ طویل نہیں تھا۔ شاہ زیب تو اُس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح تھا۔ وہ جب چاہتی ڈور ہلاتی اور وہ اشارے پہ حرکت شروع کر دیتا۔ یہ خوشی ہی کتنی بڑی تھی کہ اُس کا شوہر اُس کی ہر بات مانتا تھا اُس کی جی حضوری اور خوشنودی ہی اس کے لیے اہم تھی۔ پر جانے کیوں پھر بھی وہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی تھی۔ یوں جیسے وہ اُس کا شوہر نہیں بلکہ غلام ہے۔ بے دام کا غلام۔ اُسے شاہ زیب کی شخصیت میں عجیب سے خلا کا احساس ہوتا تھا۔ جیسے خود اُس کی اپنی کوئی بھی انفرادی شخصیت و کردار یا مرضی نہ ہو۔ مائرہ جو کہتی وہ وہی کرتا۔ اُس کی کہی بات سے وہ انحراف کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ کتنی غلط باتیں بعض اوقات اُسے ماننے پہ مجبور کرتی اور وہ بلا چوں و چراں مان لیتا ایسے جیسے یہ اُس کا فرض ہو۔ وہ اگر کسی بھی فضول اور بے معنی بات پہ ناراض ہو جاتی تو وہ منتیں کر کر کے اُسے مناتا۔ ہاتھ تک جوڑ دیتا بچوں کی طرح کان پکڑتا۔ یہ سب دیکھ کر مائرہ کو اور بھی آگ لگتی۔ تن من جھلسنے لگتا۔ دور دور تک پچھتاؤں کی خاک اُڑتی اور اس گرد و غبار میں سے رفتہ رفتہ ایک چہرا نمایاں ہو کے سامنے آتا۔ یہ چہرا یہ نقش اس کے جانے پہچانے تھے۔ یہ چہرا یہ نقش باسط کے تھے۔ جس کے چہرے کے تاثرات میں ایک ایک نقش میں مردانگی و کرختگی تھی۔ اپنی منوا لینے کا عزم تھا جنون تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ میچورڈ اور باشعور تھا۔ اُس کی شخصیت میں ایک مکمل و بھرپور مرد کی شکل نظر آتی تھی۔ مائرہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے بارے میں سوچتی، اُس کی باتوں کو یاد کرتی۔ اُس کی نگاہوں میں بھری پیاس من آنگن سے چپکے چپکے کوئی سرگوشی کرتی۔ کچھ اسرار تو تھا باسط میں جو وہ اُس کے بارے میں سوچتی تھی۔

شاہ زیب اُس کا شوہر وہ روٹھ جاتی تو سو سو طریقے سے مناتا چاہے اُس کی کوئی غلطی نہ ہوتی پھر بھی اُسے مناتا اور جب تک وہ بول نہ پڑتی وہ پاس سے نہ اُٹھتا۔

شاہ زیب کبھی کبھی اُسے خوفزدہ بچے کی مانند لگتا جو بھرے میلے میں اپنوں سے بچھڑ گیا ہو۔ اور اب تلاش کرتا پھر رہا ہو۔ اس تلاش میں ہر نظر آنے والے چہرے میں سہارا اور تحفظ ڈھونڈ رہا ہو۔ پناہ مانگ رہا ہو۔ شاہ زیب کی شخصیت کے اس پُراسرار رخ پہ مائرہ کو کبھی کبھی بہت حیرت ہوتی تھی۔ اس کی ایک وجہ شاید آئلہ چچی کی وفات ہو۔ کیونکہ اُس نے بڑوں سے سنا تھا کہ شاہ زیب چھوٹا تھا جب آئلہ چچی فوت ہوئیں۔ اس محرومی اور اُس خلا کو وہ شاید ابھی تک پُر نہیں کر پایا تھا۔ حالانکہ مائرہ نے یہ بھی سنا تھا کہ عمر چچا کی دوسری بیوی بھی بہت اچھی تھی۔ خیر اس نے سر جھٹک کر ان سوچوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ اس بارے میں جتنا سوچتی اُسے غصہ آتا۔ اور اس غصے کا مرکز شاہ زیب کی ذات ہوتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُسے فی الحال کوئی لڑائی جھگڑا کرے۔ کیونکہ اُس نے خود ہی شاہ زیب کو مطلوبہ نتائج کے لیے طاقت اور ہمت فراہم کی تھی۔ اگر وہ لڑائی کرتی غصہ کرتی تو اُس نے منہ لٹکا کے بیٹھ جانا تھا۔ کم سے کم وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے نظر انداز کرنا اچھا تھا۔

☆☆☆

سب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ شاہ زیب نے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ خود برائے نام کھا رہا تھا۔ اُس نے پپا سے بات کرنی تھی۔ آفس میں تو بات کرنا نا مناسب تھا۔ اُس نے یہی سوچا تھا کہ گھر میں آرام سے پپا سے بات ہوگی۔ وہ گھر آتے کھانا کھاتے تھوڑی دیر مطالعہ کرتے اور پھر سونے کے لیے چلے جاتے۔ اتنا وقت ہوتا ہی نہیں تھا ان کے پاس۔ سو شاہ زیب سے صبر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جلد از جلد کھانا ختم ہونے کے انتظار میں تھا۔ تاکہ بات کر سکے۔ عمر نے جونہی پانی کا گلاس لبوں سے ہٹا کے رکھا شاہ زیب نے اپنی پوری طاقت جمع کی اور اُن کی طرف دیکھا۔

''پپا آپ سے ایک بات کرنی ہے''۔ وہ چونک سے گئے۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات یاد آ گئی جب وہ اسی طرح اسی ٹون میں اُن کے پاس آیا تھا۔ کہ پپا آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ اُن کی چھٹی حس نے اُنہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ شاہ زیب کا لہجہ، انداز اور چہرے پہ بکھرا اضطراب کسی خاص بات کی گواہی دے رہا تھا۔ عمر زیب نے اپنے تاثرات کمال مہارت سے چھپا لیے اور بظاہر بڑے ہشاش بشاش لہجے میں بولے۔

''کیا بات ہے جو اس طرح ڈر ڈر کے بول رہے ہو''۔ انہوں نے شاید اس کے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔ مائرہ تو اُسی وقت برتن اُٹھانے کے بہانے منظر سے ہٹ گئی اب وہاں صرف دریکتا تھی شاہ زیب اور عمر زیب کے علاوہ۔ اُسے بھی کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا کیونکہ شاہ زیب کا چہر پریشانیوں کی آماہ جگا لگ رہا تھا۔ وہ اُٹھتے اُٹھتے وہیں بیٹھ گی۔

''پپا بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنا کاروبار کرنا چاہتا ہوں الگ سے''۔ بالآخر اُس نے دل کی بات گوش گزار کر ہی دی۔ عمر زیب کے چہرے پہ معنی خیز سی مسکراہٹ آ گئی۔ جسے شاہ زیب کوئی معنی پہنانے سے قاصد تھا۔ ''الگ کاروبار کرنے کے لیے تجربہ اور مہارت درکار ہوتی ہے وہ تمہارے پاس ہے''۔ ''پپا تجربہ اور مہارت بھی وقت کے ساتھ آ جاتی ہے۔ آپ کا بیٹا ہوں اس لیے تو آفس جاتا ہوں کہ آپ کے کام کرنے کے طریقہ کار سے واقف ہو جاؤں''۔ وہ مائرہ کے یاد کرائے گئے سبق کو بخوبی دہرا رہا تھا۔ ''مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ابھی تم اس قابل نہیں ہو کہ الگ سے کاروبار کر سکو۔ ابھی تمہیں سمجھنے کی سیکھنے کی کافی سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ ٹائم لگے گا۔ اُس کے بعد میں نے مناسب تصور کیا تو تم بے شک اپنا بزنس کا سیٹ اَپ بنا لینا۔ مگر ابھی نہیں۔'' عمر زیب نے بڑے سکون سے اپنی بات مکمل کی تھی۔ پر شاہ زیب کا فطری غصہ عود آیا۔ ''پپا میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ شادی شدہ ہوں، خود مختار ہوں، مجھے میرا حق ملنا چاہیے۔ اتنی بڑی دولت و جائیداد کا وارث ہوں اور آپ ہیں کہ مجھے اس قابل ہی تصور نہیں کرتے۔ کل کو میرے بچے ہوں گے اُنہیں میں دنیا کی ہر سہولت و آرام دینا چاہتا ہوں۔ اس لیے پلیز پپا مجھے میرا حق دے دیں جو بھی بنتا ہے''۔ شاہ زیب نے اپنی بات کر دی تھی۔ عمر ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔ وہ تو اور ہی سوچ رہے تھے۔ اور شاہ زیب نے کتنے ناقابل یقین جملے ابھی بولے تھے۔ اُن کی سماعتوں نے یقیناً دھوکا نہیں کھایا تھا لفظ بہ لفظ ٹھیک سنا تھا اپنے سیاق و سباق کے ساتھ۔ وہ دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔

''تمہیں معلوم ہے کہ کیا کہہ رہے ہو''۔ عمر کا لہجہ فی الحال ٹھنڈا ٹھار ہی تھا۔ ''جی مجھے پتہ ہے''۔ دریکتا اُن دونوں کو پریشانی سے دیکھ رہی تھی۔ اُسے کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔

مائرہ بظاہر یہاں سے اُٹھ گی تھی پر ڈائننگ روم سے باہر دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اندر سے آتی آوازیں بخوبی اُس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ رگ و پے میں ہیجان سا برپا تھا۔

''پپا میں نے اپنا حق مانگا ہے۔ آخر کب تک چھوٹی سی چھوٹی ضرورت کے لیے بھی مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑتی رہی گی اور میں آپ کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہوں گا۔ پپا اب میری ایک فیملی لائف ہے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔

میری بیوی ہے اُس کی بھی سو ضروریات ہیں۔ جن کا پورا کرنا میری ذمہ داری ہے اور میں نہ صرف اپنے بلکہ اُس کے لیے بھی آپ کا محتاج ہوں۔ پپا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ذرا ذرا سی ضرورت کے لیے آپ کی طرف دیکھنا۔ اس لیے مجھے میرا حصہ دے دیں''۔ وہ بڑے سکون سے بولا۔ عمر زیب چند ثانیے آنکھیں بند کیے ٹیک لگائے کرسی کے ساتھ وہیں بیٹھے رہے۔ پھر کچھ کہے بغیر اُٹھے اور اپنے تلے قدم اُٹھاتے باہر نکل گے۔

اُن کے قدموں کی مخصوص چاپ پہچانتے ہی مائرہ نے وہاں سے ہٹنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ جب تک وہ باہر آتے تب تک وہ راہداری سے غائب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

مائرہ شاہ زیب کی کارکردگی سے خوش تھی۔ اُس نے جس طرح بات کی تھی عمر چچا یقیناً اُس کے سرکش تیوروں سے واقف تھے۔ تب ہی تو ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ دل ہی دل میں ہار مان چکے تھے۔ جوان اولاد کے سامنے کوئی منہ زوری نہیں دکھا سکتا۔ یہ مائرہ کا اپنا نظریہ تھا۔

☆☆☆

عمر زیب کے سامنے گھٹنوں پہ فوٹو البم کھلا پڑا تھا۔ یہ بہت پرانی تصاویر تھیں۔ عمر کی۔ آئلہ کی۔ شاہ زیب اور دریکتا کے بچپن کی۔ ایک فوٹو میں آئلہ شاہ زیب کو گود میں اُٹھائے بیٹھی تھی۔ ننھا شاہ زیب بمشکل ایک سال کا تھا۔ آئلہ کی گود میں لیٹا انگوٹھا چوستا کیمرے کی طرف حیران نگاہوں سے تکتا۔ جب عمر نے وہ لمحہ تصویر میں قید کیا تھا۔ عمر ایک ایک تصویر کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں اپنا سنہرا ماضی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُنہیں خبر ہی نہیں ہوئی کہ اُن کی آنکھوں کی گوشے نم ہوئے جا رہے ہیں۔ آئلہ کی گود میں بیٹھے شاہ زیب کے نقش دھندلا رہے تھے۔ آئلہ کے بعد اُنہوں نے اُس کی چھوڑی گئی نشانیوں کی...... کتنے پیار سے پرورش کی تھی۔ شاہ زیب کی ہر جائز ناجائز ضد پوری کی وہ مائرہ کے معاملے میں اُن سے مقابلے پہ اُترا تو انہوں نے شکست مان لی۔ اُس کی ضد پوری کر دی۔ مائرہ کو عزت و مان سے بہو بنا کر لے آئے۔ شاہ زیب نے اُن کے ساتھ آفس جانا شروع کیا تو وہ خوش ہو گے کہ جوان بیٹے کو اپنے فرائض کا احساس ہو گیا ہے۔ ہا یہ فرائض کا احساس تو نہیں تھا۔ خود غرضی کی مفاد کی جنگ تھی۔ اختیار و طاقت کے تاج کے حصول کی جنگ تھی۔ طاقت اور اختیار کی جنگ کا یہ تاج جس کے سر پہ سجتا وہی فاتح قرار پاتا۔ ان سب کے پس منظر میں کس کی سوچ کارفرما تھی۔ یہ شاہ زیب کی اپنی سوچ اور فیصلہ نہیں تھا۔ شادی سے پہلے تک اُس کا ذہن کبھی کاروبار، دولت کی ملکیت کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔ اب یکایک اپنے حصے کا مطالبہ، مالک بنائے جانے کی ضد۔ اُن کی ساری عمر کی کمائی کے زیاں کے درپے تھی۔

دریکتا اُس کے مقابلے میں خاصی کم گو اور اپنے آپ میں مگن رہنے والی حساس اور خوددار بچی تھی جو اُن کی ذرا ذرا سی تکلیف پہ پریشان ہو اُٹھتی۔ اُس نے کبھی بھی اُنہیں پریشان نہیں کیا تھا۔ جانے شاہ زیب کو خود غرضی کی ہوا کیوں لگ گی تھی۔

اُنہوں نے البم بند کیا اور آرام سے کھڑے ہوئے۔ اُسے پہلے والی جگہ پہ رکھا اور دوبارہ صوفے پہ آ بیٹھے۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اُٹھے اور دیوار میں نصب سیف کا لاک کھولا۔ اندر بہت سے کاغذات اور کچھ ضروری فائلز پڑی تھیں۔

عمر نے ایک ایک کر کے سب کاغذات باہر نکال لیے۔ وہ انہیں غور سے دیکھ رہے تھے۔ یہ اُن کی زمینوں جائیدادوں کے کاغذات تھے۔ شاہ زیب نے اُنہیں دوراہے پہ لا کھڑا کیا تھا۔ اس مشکل سے نکلنا اُن کے اختیار میں تھا۔

تجرباتی طور پہ اُس نے کروڑوں کا مال باسط کو دیا۔ باسط کو اُس شخص کی پہچان اور حلیہ اچھی طرح بتایا گیا بلکہ تصویر بھی دکھائی گی۔ ڈھیروں ہدایات پلو میں باندھے اپنے مشن پہ روانہ ہوا۔ اُسے بالکل بھی پتہ نہیں تھا کہ جو سامان وہ ساتھ لے کر جا رہا ہے اُس کی قیمت اتنی زیادہ ہے۔ بغیر کسی مشکل یا خطرے میں پڑے اُس نے اپنا کام کر لیا اور رپورٹ باس کو دی۔ کچھ دیر تک کامیابی کی اطلاع باس تک بھی پہنچ گی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اس بار باسط کو بونس بھی ملا اور یہ بونس بھی لاکھوں میں تھا۔ دل ہی دل میں اُس نے حساب لگایا کہ ان پیسوں کیا کچھ خریدا جا سکتا ہے۔

باس نے امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس شروع کیا ہوا تھا یہ اُس کا نیا پراجیکٹ تھا جو اس نے صرف چھ ماہ پہلے ہی شروع کیا تھا۔ اس کمپنی کے لیے اُس نے لیبر پاکستان سے بھی بھرتی کی تھی جن میں سے ایک باسط بھی تھا۔

کمپنی کا دفتر دوبئی کے مہنگے ترین علاقے میں تھا۔ باسط بھی اُسی آفس میں تھا۔ آفس میں اُس کی جاب کچھ ایسی بھی خاص نوعیت کی نہیں تھی ہاں جب سامان کہیں لے جانا ہوتا تو پھر باس کی توجہ اُسی پہ فوکس ہوتی۔ اُس کے ساتھ کے باقی تین چار لڑکے اُس کی طرح اتنے ہوشیار نہیں تھے۔ اُن میں سے دو تو اس وقت دوبئی کی ایک جیل میں سڑ رہے تھے۔ باسط اپنے ساتھ اس قسم کے حادثے سے بچنا چاہتا تھا وہ بالکل ہی اپنے ہاتھ پاؤں کٹوا کے نہیں بیٹھا تھا۔ باس کی غیر موجودگی میں اُس کا ایک نائب تھا جو سارے معاملات کا نگران تھا۔ باسط نے اُسے کافی قربت پیدا کر لی تھی۔ وہ باسط کو پسند کرنے لگا تھا۔ کسی بھی قسم کی پریشانی کی صورت میں اُس نے باسط کو مکمل مدد کی یقین دہانی کرائی تھی۔ ویسے بھی باسط اُس کا خاص منظورِ نظر تھا۔ اُسی نے باسط کو باس کے مختلف قسم کے بزنس کے بارے میں بتایا تھا۔ پر کچھ عرصے بعد باس کوئی نہ کوئی نیا بزنس اسٹارٹ کر دیتا۔ اس بزنس کی آڑ میں اُس کا اصل بزنس پوشیدہ تھا اور یہی اُس کی کامیابی کا نکتہ تھا۔

چھ ماہ کے دوران باسط کی وجہ سے باس کو بہت کامیابی ملی تھی سو کامیابی کے تناسب سے اُس کا معاوضہ بھی دیگر کارکنوں کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ باسط نے اپنی ذاتی صلاحیت سے انگلش فر فر بولنا سیکھ لی تھی اور عربی زبان کی کچھ نہ کچھ شدھ بدھ اُسے ہو ہی گی تھی۔ یہ اس کاروبار کے لیے بہت ضروری تھی۔

☆☆☆

بینا گھر کے ایک ایک حصے کو حسرت آمیز حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ حمزہ احمد نے باسط کے بھیجے گئے پیسوں سے یہ گھر کل ہی خریدا تھا اور آج وہ سب اس گھر کو دیکھنے آئے تھے۔ گھر اُن کے پاس پہلے سے بھی موجود تھا اور کافی کشادہ، ہوا دار اور خوبصورت بھی تھا۔ پر پوش علاقے میں بنے اس بنگلے کی کیا ہی شان تھی۔ فل فرنشڈ بنگلہ تھا۔ وال ٹو وال کارپٹ، وسیع وعریض لان، جدید فرنیچر سے آراستہ ایسا گھر ہی بینا کا خواب تھا۔

''میں سب کو بلا کے قرآن خوانی کرواؤں گی خاص طور پہ شریں آپا کو تو ضرور بلاؤں گی اُنہیں پتہ چلنا چاہیے کہ میرا باسط کتنا قابل ہے۔ اُن کے داماد اور مائرہ کے شوہر کو تو ورثے میں سب کچھ ملا ہے پر میرے بیٹے نے سب کچھ اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔ میرا باسط اُن کے داماد سے کئی گنا زیادہ اچھا ہے۔'' وہ دل ہی دل میں خود سے بول رہی تھی۔ حمزہ احمد اُن سب کو گھر کا چپہ چپہ دکھا رہے تھے۔

☆☆☆

باسط نے چھ ماہ بعد پہلی بار پاکستان کا چکر لگایا تو رشتہ داروں کے لیے تحائف بھی لایا۔ وہ سامان سے لدا پھندا تھا۔ بینا بطور خاص اُسے اپنے ساتھ گاؤں لے کے گئی۔ کیونکہ باسط شریں خالہ اور اپنے کزنز کے لیے بہت کچھ لایا تھا۔

اُن سب کو تحائف بھی دینے تھے اور کچھ جتانا بھی تھا۔ اتفاق سے مائرہ بھی میکے آئی ہوئی تھی۔ باسط کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ موٹا اور پہلے سے بڑھ کر میچور لگ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا ان چھ ماہ میں اُس کی عمر جیسے چھ سال بڑھ چکی ہو۔ وہ حد سے زیادہ پختہ کار لگ رہا تھا۔

''لگ رہا ہے کہ تمہاری جاب اور کام بہت اچھا ہے۔'' وہ برسبیل تذکرہ بولی تھی۔ ''ہاں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ اچھا ہے میرا کام اور ہاں میں نے گھر بھی لے لیا ہے فل فرنشڈ ہے۔ کبھی آؤ ناں ہمارے غریب خانے پہ''۔ بولتے وقت وہ مائرہ کے سراپے کو بھی تولتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہنوز پہلے کی طرح اسمارٹ اور دلکش لگ رہی تھی۔ شاہ زیب کی قربت نے اُس پہ کوئی اثر اور نشان نہیں چھوڑا تھا۔ باسط کو جانے کیوں خوشی سی ہوئی۔ ایک کمینی اور گھٹیا سی خوشی۔ ''ہاں خالہ نے بتایا ہے کہ تم نے گھر لیا ہے۔ آؤں گی کبھی۔ تمہارے گھر بھی'' وہ خاص ادا سے بولی تو باسط دیکھنے لگ گیا۔

رات وہ گاؤں میں ہی رُکا۔ مائرہ رات گئے اُس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ ان باتوں کے دوران ایک بار بھی شاہ زیب کا ذکر نہیں آیا۔

☆☆☆

باسط نے پاکستان میں اپنا کام مکمل کر لیا تھا اُس نے واپسی کی سیٹ بک کروا لی تھی۔ پہلے کی طرح اُسے پھر کوئی سامان کسی مخصوص شخص کے سپرد کرنا تھا۔ اس بار مال کی مالیت زیادہ تھی سو وہ کچھ نروس اور پریشان بھی تھا۔ لیکن کوشش کر رہا تھا کہ اندرونی اضطراب اور کرب اُس کے چہرے سے ظاہر نہ ہونے پائے۔ سو چیکنگ کے مرحلے سے وہ بخوبی گزر گیا۔ اب دیکھنا تھا دوبئی ایئرپورٹ پہ کیسے حالات سے واسطہ پڑتا تھا۔ یہاں سے تو سب آرام سے ہو گیا تھا۔

وہ جتنا ڈر رہا تھا کام اُتنی ہی آسانی سے ہو گیا۔ اُس پہ خاص توجہ نہیں دی گی۔ اور خیریت سے ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ ایک اور مشکل ٹاسک جو اُس کے سپرد کیا گیا تھا اُس نے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ اب راوی نے چین ہی چین لکھا تھا۔

وہ اپنے فلیٹ میں جا کے سو گیا۔ رات کو باس کو رپورٹ دینی تھی۔

☆☆☆

شاہ زیب بھی اپنے کاروبار کی پلاننگ کر رہا تھا۔ تایا اورنگزیب نے اُسے مکمل تعاون کی یقین دہانی کروائی تھی حالانکہ عمر نے اپنی مدد کی پیش کش بھی کی تھی۔ پر وہ اُن کی کسی بات کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ اب تایا اورنگزیب نے امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس کی بات کی تو اُس کے ذہن میں وہی بیٹھ گی۔ مائرہ نے اپنی خالہ کے بیٹے باسط کا بتایا تھا کہ وہ دوبئی میں ایک کمپنی میں کام کرتا ہے جس کا بزنس امپورٹ ایکسپورٹ سے متعلق ہے اور وہ اچھے خاصے پیسے کما رہا ہے۔ مائرہ نے اُسے ایک آئیڈیا دیا تھا اور اُنے عمل کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اندھے کو دو آنکھیں چاہئیں تھیں۔ تایا اورنگزیب اور اپنے بڑے سالے کے توسط سے اُس نے آفس کے لیے جگہ بھی ڈھونڈ لی۔ اب وہ بڑی لگن اور شوق سے اپنے آفس کی آرائش کروا رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اُس نے ملک کے مہنگے انٹیریئر ڈیکوریٹر کی خدمات حاصل کی تھی۔ دفتر کی آرائش پہ اُس نے بے دریغ پیسہ خرچ کیا۔ پپا کی وجہ سے اُسے اپنے کاروبار کے لیے اجازت نامہ آسانی سے مل گیا۔ آفس کی تزئین و آرائش مکمل ہوتے ہی اُس نے دو لگژری گاڑیاں خریدی ایک اپنے اور ایک مائرہ کے استعمال کے لیے۔ فی الحال وہ عمر زیب کے ساتھ ہی مقیم تھے۔ اُنہوں نے اُس کے لیے نیا گھر تعمیر کروایا تھا۔ مائرہ نے ضد شروع کر دی کہ ہمیں اب اپنے

گھر میں شفٹ ہو جانا چاہیے۔ عمر زیب کو اس پہ کوئی اعتراض نہیں تھا اگر وہ اپنے گھر چلے جاتے۔ پر اُنہیں موہوم سی اُمید تھی کہ شاید شاہ زیب اُنہیں چھوڑ کے نہ جائے۔ یہ گھر ویسے بھی بہت بڑا تھا۔ کتنے کمرے خالی پڑے ہوئے تھے۔ مگر مائرہ کو دھن سما گئی تھی اپنے گھر میں جانے کی۔ ویسے بھی وہ گھر شاہ زیب کے نام پہ تھا۔ اُس نے دل میں ٹھانی ہوئی تھی کہ اپنی شادی کی سالگرہ کے موقعے پہ گھر اپنی محبوب بیوی مائرہ کو گفٹ کر دے گا۔ اُس کی اس خواہش سے مائرہ لاعلم تھی۔ ویسے بھی وہ اُسے سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

مائرہ کی ضد کے آگے ایک بار پھر شاہ زیب کو ہار ماننا پڑی اور وہ اُس کے ساتھ عمر اور دریکتا کو چھوڑ کر نئے گھر میں شفٹ ہو گیا۔ جو پپا نے اُس کے لیے بہت شوق اور چاؤ سے بنوایا تھا۔ اُنہوں نے دل پہ پتھر رکھ کر بہت سی دعاؤں سمیت اُسے اس گھر سے رخصت کیا بلکہ اپنی آنکھوں سے اُسے خود سے دور جاتے دیکھا۔ بہت سے آنسو اُنہوں نے دل میں اُتار لیے تھے کہ مبادا شاہ زیب کا ارادہ کمزور نہ پڑ جائے۔

شاہ زیب اپنا کاروبار شروع کر چکا تھا۔ اس میدان میں خاص مہارت اور تجربہ نہ ہوتے ہوئے بھی قسمت اُس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اپنے ملک کی بہت ہی اچھی ساکھ والی کمپنی نے کافی بڑا آرڈر اُنہیں دیا تھا۔ ابھی اُس کے کاروبار کا آغاز تھا اس لیے بہت سے ادارے آرڈر دیتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ ابتدائی مرحلے میں کام بھی محدود تھا۔ شاہ زیب صرف لیدر گڈز اور ریڈی میڈ ملبوسات پہ فوکس کیے ہوئے تھا۔ اورنگزیب تایا آفس میں اُس کے ساتھ بیٹھتے تھے روز روز گاؤں سے آنا اور پھر جانا بہت دشوار تھا سو شاہ زیب نے اُنہیں اپنے گھر رہنے کی آفر کر دی۔ شروع میں اُنہوں نے انکار کیا کہا کہ آفس میں ہی رہ لوں گا بیٹی کے گھر نہیں رہوں گا مگر شاہ زیب کی ضد اور اصرار کے آگے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ اُن کے ساتھ اُن کا بڑا بیٹا بھی آ گیا۔ وہ بھی آفس میں شاہ زیب کے ساتھ ہوتا۔ شاہ زیب نے اُسے اسٹاف کی کارکردگی جانچنے پہ لگا دیا تھا۔ وہ اس کام میں بہت خوش تھا۔ بیٹھے بٹھائے اچھی تنخواہ مل رہی تھی۔

باقی ٹھاٹ اس کے علاوہ تھے۔ عمر زیب کبھی کبھار شاہ زیب کے آفس کا چکر لگاتے تو اورنگزیب بھائی اُدھر ہی مل جاتے۔ پر اُن کے رویے میں بڑا فرق آ گیا تھا زمین آسمان کا فرق۔ وہ بڑے غرور اور سرد مہری سے ملتے جیسے اس کاروبار اور آفس کے وہی مالک ہوں۔ شاہ زیب کی بیرونی اور گھریلو زندگی میں ان کا عمل دخل بڑھتا جا رہا تھا۔ عمر زیب دیکھتے پر منہ سے بول نہ پاتے۔ شاہ زیب کی ضد ماننے کا یہی انجام ہونا تھا۔ اُن کی دولت اور ترقی سے اُن کے سگے خونی رشتے حسد کرتے تھے۔ جو کام کوئی نہ کر سکا تھا وہ ایک کمزور سی لڑکی نے اُن کی بہو بن کے کر دکھایا تھا۔ پہلے اُن کے گھر آئی پھر اُن کے بیٹے کے دل میں اُتری پھر اُس کی زندگی پہ چھا گئی۔ شاہ زیب اُس کے پیچھے دم ہلاتا بندر تھا۔ مائرہ ڈگڈگی بجاتی اور وہ ناچنا شروع کر دیتا۔ وہ پوری طرح اُس کے سحر میں جکڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

شاہ زیب بہت خوش تھا۔ عمر زیب کے توسط سے پہلی بار اُسے بیرون ملک سے آرڈر ملا تھا۔ اُس کی خوشی دیدنی تھی۔ اُسے اس بات کا چنداں احساس نہیں تھا کہ اس آرڈر کا کامیابی سے تکمیل پہ اُس کے لیے ترقی و کامرانی کے نئے دروازے کھل جانے تھے۔ وہ تو بس آرڈر ملنے پہ ہی خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ کاروباری حلقوں میں اُسے ملنے والے اس آرڈر پہ تبصرے ہو رہے تھے۔ کئی ملکی کمپنیوں کے چھوٹے موٹے آرڈر اس کے علاوہ تھے۔

مائرہ نے اپنی دلچسپی کی نئی راہیں تلاش کر لی تھیں۔ اُس نے بہت جلد ڈرائیونگ سیکھی تھی۔ اور وہ شاہ زیب کی بیوی ہونے کے ناطے ایک لیڈیز کلب کی مستقل ممبر بن گئی تھی۔ وہ دن بھر گاڑی اُڑائے اُڑائے پھرتی۔ اُدھر شاہ زیب کے ذہن پہ آفس کے معاملات بُری طرح سوار تھے اتنے سارے آرڈرز نے اُس کی مت ہی مار دی تھی۔ تایا اورنگزیب کو ان معاملات کی کوئی خاص سوجھ بوجھ نہیں تھی اپنی عقل سے کام کرتے جا رہے تھے۔ عمر زیب کے ساتھ اُن کا رویہ لیے دیئے والا تھا سو انہوں نے شاہ زیب کے آفس کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اُن کا یہ رویہ مستقبل قریب میں شاہ زیب کے لیے نقصان لانے والا ہے اگر اُنہیں علم ہوتا تو وہ شاید کبھی بھی ایسا نہ کرتے۔

☆☆☆

آرڈر کی بروقت تکمیل کے لیے شاہ زیب نے میٹریل کی خریداری تایا اورنگزیب اور اپنے سالے کے سپرد کی تھی۔ حالانکہ منیجر نے دبے الفاظ میں کہا بھی کہ اُنہیں اس کا تجربہ نہیں ہے نہ ہی وہ کوالٹی کے معیار کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جواباً اُس نے منیجر کو بُری طرح جھاڑا اور اپنی اوقات میں رہنے کو کہا۔ وہ بے چارا اپنا سا منہ لے کے رہ گیا۔ اس فیلڈ میں اس کا تجربہ کافی زیادہ تھا پر شاہ زیب کے رویے کو دیکھتے ہوئے سائیڈ پہ ہو گیا۔ اورنگزیب نے ایک فیکٹری سے کپڑا اور دیگر میٹریل خرید لیا۔ وہ اپنے اس کارنامے پہ خوش تھے کہ اُنہوں نے یہ سب بہت سستا خریدا ہے۔ شاہ زیب کو بڑھا چڑھا کر اُنہوں نے یہ بتایا۔ وہ پُرسکون ہو گیا۔ پر کوالٹی کنٹرول منیجر نے سامان دیکھتے ہی کوالٹی اور معیار کا اندازہ لگا لیا۔ وہ شاہ زیب سے شکایت کرنا چاہتا تھا۔ پر منیجر نے اُسے اپنا واقعہ سنا کر خوفزدہ کر دیا۔ ویسے بھی ٹائم گزرتا جا رہا تھا اور اُنہیں آرڈر مکمل کرنا تھا۔ اگر ٹائم گزر جاتا تو اُن کی کاروباری ساکھ کو شدید دھچکہ لگتا۔ میٹریل ملتے ہی کام شروع کر دیا گیا۔ وقت بہت کم تھا۔ ساری لیبر اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں لگی ہوئی تھی۔ ہونی ہو کر رہی۔ مقررہ میعاد کے اندر کام مکمل نہیں ہو سکا۔ جتنا کام مکمل ہو سکا وہ کمپنی کو بھجوا دیا گیا۔ کچھ ہی دن کے اندر اندر تمام سامان شکایات کے ساتھ واپس بھجوا دیا گیا۔ شاہ زیب سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ وہ تمام سرمایہ اس کاروبار میں جھونک چکا تھا۔ دوسری کمپنیوں سے بھی یاد دہانی کروائی جا رہی تھی کہ سامان وقت تک پہنچانا ہے۔ اورنگزیب تایا نے بغیر سوچے سمجھے ہر چھوٹی بڑی کمپنی سے جو آرڈر لیے تھے وہ اب شاہ زیب کے گلے کا پھندا بنتے جا رہے تھے۔ وہ کچھ دن کے لیے خود کو کاروباری معاملات سے الگ کرنا چاہ رہا تھا۔ تایا اورنگزیب نے کہا کہ کچھ دن کے لیے گھوم پھر آؤ۔ پیچھے میں تمام کام دیکھ لوں گا۔ وہ خوش ہو گیا۔ بوجھ سر سے اُترتا محسوس ہوا۔ اتنے دن بعد وہ کھل کے خوش ہوا تھا۔ گھر آیا تو مائرہ غائب تھی وہ کلب گئی ہوئی تھی۔ اُسے غصہ سا آ گیا۔ بڑے سکون سے اُس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

باہر پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تو شاہ زیب نے بیڈروم کی کھڑکی سے پردہ اُٹھا کے دیکھا۔ مائرہ چابی جھلاتی گاڑی سے اُترتی اور ہیل سے ٹک ٹک کرتی قدم اُٹھانے لگی۔ شاہ زیب آ کر بیٹھ گیا۔ مائرہ نے دروازہ کھولا اور اُسے دیکھ کر چونک گئی۔ ''آج آپ جلدی آ گئے ہیں''۔ وہ پرس صوفے پہ پھینک کے گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ ''ہاں آج ریلکس کرنے کا موڈ تھا سو آ گیا گھر۔ کچھ گھومنے پھرنے کا دل کر رہا ہے تم سے وعدہ کیا تھا کہ پہلے تمہیں پورے پاکستان کے قابل دید مقامات دکھاؤں گا۔ شمالی علاقہ جات لے جاؤں گا اس کے بعد ملائیشیا اور اٹلی چلیں گے۔ میں نے تایا سے کہہ دیا ہے''۔ ''ہائے سچ شاہ زیب'' مائرہ اُٹھ کے اُس کے گلے لگ گئی۔ ''ہاں تم کل سے تیاری شروع کر دو ہم

☆☆☆

مائرہ کپڑے اور دیگر تمام چیزیں رکھ چکی تھی۔ شاہ زیب پپا کی طرف گیا تھا یہ بتانے کہ ہم گھومنے پھرنے جا رہے ہیں۔ مائرہ نے پیکنگ کا کہہ کر اُس کے ساتھ آنے سے معذرت کر لی۔ وہ اکیلا ہی چلا آیا۔ پپا آفس جانے کی تیاری میں تھے اور دریکتا کالج کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ وہ صبح صبح اُسے دیکھ کر پہلے حیران اور پھر مسرور سے ہوئے۔ بڑی محبت سے گلے ملے۔ وہ دو دفعہ جانے کے لیے کھڑا ہوا اور انہوں نے دونوں بار ہی اُسے تھوڑی دیر تو بیٹھو کہہ کر اپنے پاس سے اُٹھنے ہی نہیں دیا۔ جب وہ آنے لگا تو اُسے چھوڑنے گیٹ تک آئے۔ آخر میں اُسے گلے لگایا اُن کی گرفت میں بہت محبت بھری سختی تھی۔ بے اختیار شاہ زیب نے کسی بچے کی مانند اُن کی گردن میں بانہیں حمائل کر کے اُن کے ماتھے پہ اپنے لب رکھ دیئے۔ عمر زیب کے اندر شفقت پدری کا طوفان ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ جانے کیا بات تھی اُن کا دل چاہ رہا تھا کہ شاہ زیب اسی طرح اُن کے گلے سے لپٹا رہے۔ پر اُسے جانا تو تھا۔ دو بار مائرہ کی کال آ چکی تھی۔ کہ کب آئیں گے ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔ ناچار شاہ زیب اُن سے مل کر واپس آ گیا۔ جب تک اُس کی گاڑی نے موڑ نہیں کاٹا عمر وہیں کھڑے دیکھتے رہے۔

☆☆☆

شاہ زیب گھر پہنچا تو شریں تائی بیٹھی تھیں۔ وہ ابھی ابھی پہنچی تھیں۔ مائرہ نے ہی اُنہیں بلوایا تھا حفاظت کے نکتہ نگاہ سے۔ گھر قیمتی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ دونوں چلے جاتے تو دن میں گھر میں کون ہوتا۔ کیونکہ اورنگزیب اور مائرہ کا بھائی آفس میں ہوتے۔ کہیں شام ڈھلنے کے بعد لوٹتے۔ چوری کی وارداتیں عام تھیں کوئی بھی گھر میں کسی کونہ پا کر نقب لگا سکتا تھا اس لیے مائرہ نے اپنی والدہ محترمہ سے گزارش کی تھی کہ اُن کی غیر موجودگی میں گھر کی دیکھ بھال کریں۔ اُنہوں نے کل ہی آ جانا تھا لیکن ہنگامی طور پر ایک فوتگی میں جانے کی وجہ سے نہ آ سکیں۔ صبح پو پھٹتے ہی وہ ڈرائیور کے ساتھ چل پڑیں۔ اُن کے ہمراہ سائرہ بھی تھی یہ مائرہ سے چھوٹی تھی۔ مائرہ اُن دونوں کی خاطر مدارت میں لگ گی تو بارہ گھر ہی بج گئے۔ وہ کافی لیٹ گھر سے نکلے۔ اُنہیں سب سے پہلے براستہ ایبٹ آباد وادی نیلم کشمیر جانا تھا۔ شاہ زیب پہلے بھی کافی بار یہاں آ چکا تھا دوستوں کے ساتھ مگر اس بار مائرہ کے ساتھ وہ پرانی خوشگوار یادیں تازہ کرنے آیا تھا۔ اُن کا پہلا پڑاؤ ایبٹ آباد تھا مگر وہاں اُنہوں نے قیام زیادہ طویل نہیں کرنا تھا۔ ایبٹ آباد وہ کافی لیٹ پہنچے تھے۔ شاہ زیب نے ابھی بھی تازہ دم تھا مگر مائرہ تھک گی تھی۔ سو شاہ زیب اُس کے ساتھ ہوٹل آ گیا۔

اگلے دن چڑھے سو کے اُٹھنے کے بعد شاہ زیب نے ناشتہ کمرے میں ہی منگوایا۔ ڈٹ کے ناشتہ کرنے کے بعد اُس نے پارکنگ سے گاڑی نکالی اور اپنا سامان ڈگی میں رکھا۔ موسم ابر آلود سا لگ رہا تھا۔ پر خوشگوار تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سورج بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ شاہ زیب ڈرائیونگ کرتے ہوئے بہت ترنگ میں تھا۔ ایبٹ آباد کو وہ کافی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ سڑک بہت خراب تھی ”آٹھ مقام“ سے لے کر وادی نیلم تک سڑک کا یہی حال تھا ورنہ ٹوٹل تین گھنٹے کا سفر تھا جو چھ سات گھنٹے میں جا کے ختم ہوتا تھا۔ سڑک کے ایک طرف متوازی سمت میں دریائے نیلم اپنی آب و تاب کے ساتھ بہہ رہا تھا اور دوسری طرف گہری کھائیاں منہ کھولے کھڑی تھیں۔ بہت خطرناک راستہ تھا۔ مائرہ کو جتنی قرآنی آیات زبانی یاد تھیں اُس نے اُن کا ورد شروع کر دیا۔ شاہ زیب اطمینان سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ چھ گھنٹے بعد وہ آخر کار وادی نیلم پہنچ ہی گئے۔ یہاں بڑے شہروں جیسی گہما گہمی نہیں تھی۔ ایک خاموشی اور پراسرار سا سکون تھا۔ شاہ زیب یہاں آتا جاتا رہتا تھا اس لیے اُسے رہائش کے معاملے میں قطعی پریشانی نہیں ہوئی۔ اُس نے ایک ہوٹل ڈھونڈ ہی لیا۔ یہاں آ کے اُن کے موبائل فون نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مائرہ اور اُس کے سیل فون کے سگنلز ڈیڈ تھے۔ شاہ زیب کو تو اس صورتحال کا پتہ تھا پر مائرہ پریشان ہو گئی۔ ”نہ پریشان ہو یہاں سے پینتالیس منٹ کی ڈرائیو پہ پی سی او ہے آؤ وہاں چلتے ہیں۔ اور گھر والوں کو اپنی خیریت کی اطلاع دیتے ہیں۔ میں جب بھی یہاں آتا ہوں اُسی پی سی او سے گھر کال کرتا ہوں۔ پپا بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔ جلدی آؤ۔ رات زیادہ ہو گئی تو ہمیں ناکام لوٹنا ہوگا۔ پی۔ سی۔ او۔ زیادہ سے زیادہ دس بجے تک کھلا رہتا ہے اُس کے بعد بند ہو جاتا ہے۔“ شاہ زیب نے اُسے یہاں کی صورت حال سے آگاہ کیا تو مائرہ بجلی کی تیزی سے گاڑی میں بیٹھی۔ ”شاہ زیب جلدی کریں۔ گھر فون کر کے واپس آئیں گے۔ اُس کی پھرتی قابل دید تھی۔ کہاں تو وہ تھکن سے چور تھی اور اب اُس میں بجلی سی بھر گئی وہ بے اختیار مسکرانے لگا۔

آسمان پہ موجود لاتعداد بادلوں کی وجہ سے اندھیرا بہت تیزی سے پھیلا تھا۔ سردی کی شدت بھی کافی زیادہ تھی۔ مائرہ بار بار گرم شال کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ رہی تھی۔ پی۔ سی۔ او۔ کھلا تھا۔ پہلے مائرہ نے اپنی والدہ محترمہ اور بہن سے بات کی اُس کے بعد شاہ زیب نے پپا کو کال کی اور اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔ دریکتا سے بھی بات ہوئی۔ اُس نے بھائی کو اپنا ڈھیروں خیال رکھنے کی تاکید کے بعد فون بند کیا۔ وہ مڑی پپا بھی پاس ہی کرسی پہ بیٹھے تھے۔ وہ اُسے اس سے بہت اداس سے لگے۔ اُسے پپا پہ پیار سا آ گیا۔ وہ قالین پہ نیچے بیٹھ گی۔ ”پپا اداس کیوں ہو گئے ہیں بھائی سے بات کرنے کے بعد حالانکہ وہ خیریت سے پہنچ گے ہیں“۔ دریکتا نے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیا۔ ”وہ خیرت سے پہنچ گیا ہے مگر میں باپ ہوں ناں کیا کروں پریشانی سی ہے“۔ ”پپا آپ ایسے ہی پریشان ہوتے ہیں۔ بھائی پہلے بھی تو گھومنے پھرنے کی غرض سے جاتا رہا ہے“۔ دریکتا نے اُنہیں تسلی دی تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیئے۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو“۔ اُنہوں نے فوراً ہار مان لی۔

☆☆☆

بہو اور بیٹے کی غیر موجودگی میں شریں نے پورے گھر کا ناقدانہ جائزہ لیا اور پھر رازدارانہ انداز میں اپنے شوہر اورنگزیب سے اس گھر کی مالیت کی بابت پوچھا۔ ”مجھے تو نہیں پتہ کہ اس کی درست مالیت کتنی ہے مگر ایک کروڑ سے زیادہ کا ہوگا۔ اُنہوں نے اندازے سے بتایا تو شریں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”عمر بھائی نے شاہ زیب کا حصہ تو اُسے دے دیا ہے مگر بیٹی کے معاملے میں پُراسرار خاموشی اختیار کر رکھی ہے اس کا کیا مطلب ہے“۔ ”مجھے کیا پتہ۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بتانا نہ چاہ رہا ہو“۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ عمر بھائی نے بیٹی کو بیٹے سے زیادہ حصہ دیا ہو اس لیے خاموش ہو“۔ شریں دور کی کوڑی لائی تھی۔ واقعی بات قابل غور تھی۔ وہ اس طرف سوچنے پہ مجبور ہو گئے۔ ”اگر ایسی بات ہوئی تو اچھا نہ ہوگا“۔ شریں جانے کیوں اس قدر اُچھل رہی تھی۔ اورنگزیب بھی اس معاملے پہ سوچ رہے تھے کہ عمر نے بیٹے کو جو دینا دلانا تھا دے دیا مگر دریکتا کا حصہ کتنا تھا اس بارے میں اُن کی خاموشی معنی خیز تھی۔ اس کے پیچھے جانے کیا مصلحت اور راز تھا۔ جس کا جاننا اب اورنگزیب کے لیے ازحد ضروری تھا۔ عمر زیب سے مل کے پوچھا جا سکتا تھا کیونکہ وہ اب اس پوزیشن میں تھے کہ یہ سوال کر سکتے تھے۔ شاہ زیب نے اپنے کاروبار کے کلی معاملات اُن کے حوالے کر دیئے تھے اور اپنی اس کامیابی پہ وہ پھولے نہیں سما رہے تھے۔ برسوں پہلے جب عمر اپنے دونوں بچوں کے ساتھ شہر شفٹ ہونے کی تیاری کر رہا تھا تو آئلہ کے چھوڑے گئے اثاثوں کی تفصیل جان کے اُن کے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش اس میں ان کا حصہ بھی ہو۔ اُس

مائرہ اُن کی بیٹی عمر زیب کی بہو بی اور اُس نے اپنے بیٹے کو اُس کا حصہ خوشی خوشی جیتے جی دے دیا۔ اب یہ مائرہ کے نام کیسے کروانا تھا اُنہیں سوچنا تھا۔ شاہ زیب ویسے بھی اُن کی نگاہ میں جذباتی اور قدرے نان پریکٹیکل نوجوان تھا۔ ایسے نوجون پہ مالی معاملات میں زیادہ اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا وہ سادہ دل تھا ہر ایک پہ اندھا اعتبار کرنے والا۔ میٹریل کی خریداری کی ذمہ داری اُن کے حوالے کر کے اُس نے روپے پیسے کی کوئی تفصیل اُن سے نہیں مانگی تھی۔ یہ رویہ مستقبل میں بہت خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ اُن کی بیٹی کے حق میں۔ اس طرح تو کوئی بھی اُسے مالی خسارے سے دوچار کرسکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مائرہ کو کل کلاں اس وجہ سے کوئی پریشانی ہو اس لیے شاہ زیب اپنی جائیداد میں سے کچھ اُس کے نام کردیتا تو اُس کا مستقبل محفوظ رہ سکتا تھا۔ اپنے تیئں وہ بہت دور کی کوڑی لائے تھے۔

دوسرے دن وادی میں موسم بہت ابر آلود تھا۔ وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی اس وجہ سے شاہ زیب اور مائرہ زیادہ گھوم پھر نہیں سکے۔ ہوٹل تک ہی محدود رہے۔ سردی کی شدت بارش کی وجہ سے بڑھ گئی تھی۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں ویسے بھی سارا سال موسم بہت اچھا ہی رہتا اور زیادہ تر ٹھنڈ ہوتی۔ اسی وجہ سے شاہ زیب کو یہ جگہ بہت پسند تھی۔ وہ کتنی بار یہاں آچکا تھا۔ مائرہ کے ساتھ پہلی بار یہاں آیا تھا تو یہ وادی اس کے دل فریب نظارے گنگناتا شور مچاتا دریائے نیلم کی آنکھوں کو تازگی بخشتا سبزہ فلک بوس پہاڑ سب کچھ ہی تو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس جگہ کا اپنا حسن اور خوبصورتی تھی اُس کی رومانوی حس جاگ پڑی تھی پر مائرہ جانے کیوں جھنجلائی ہوئی سی تھی۔ اس وقت بھی اُس کے چہرے پہ بیزاری ہی بیزاری تھی۔ شاہ زیب آتش دان کے پاس بیٹھا تھا۔ مائرہ کمبل اوڑھے بیڈ پہ نیم دراز تھی۔ باہر پانچ بجتے ہی رات اُتر آئی تھی اور بارش تواتر سے ہو رہی تھی۔ شاہ زیب کی نگاہوں میں خمار اور مستی اُتر آئی۔ وہ آتش دان کے پاس سے اُٹھ کے مائرہ کے پاس آیا تو اُس نے شاہ زیب کا بازو رجھٹک دیا۔ وہ اسے محبوب بیوی کی ادا سمجھا اور پیار سے اُس پہ جھکا تو اُس نے اس بار شاہ زیب کو پیچھے کی طرف ہٹا دیا ''سویٹ ہارٹ کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری۔'' شاہ زیب کے لہجے میں محبت کی ساری نرماہٹیں بول رہی تھیں مائرہ کو اور بھی غصہ آگیا۔ شاہ زیب میں تو جیسے مردانہ حس اور اَنا موجود نہیں تھی کیسے وہ اُس کی اَنا کو اپنے پاؤں تلے روندتی اور وہ ہنستا چلا جاتا اُس کی منتیں کرتا مناتا بچوں کی طرح راضی کرتا۔ میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے مجھے کیا ہونا ہے۔ میں اس وقت اکیلے رہنا چاہتی ہوں''۔ جانے کیوں آج کل اُس پہ سستی اور بیزاری طاری تھی۔

تھک بھی جلدی جاتی۔ شاہ زیب کی جرأتوں کا سامنا کرنا اُس کے لیے آسان نہیں رہا تھا تب ہی اس وقت اُسے غصہ آگیا تھا۔ جواباً شاہ زیب اُسے منانے لگا۔ اُسی حساب سے مائرہ کا غصہ بڑھنے لگا۔ پلیز شاہ زیب مجھے عورتوں کی عادات لیے مرد اچھے نہیں لگتے پلیز اپنے اندر مردانگی پیدا کریں۔ جیسے اور عورتوں کے شوہروں میں یہ وصف پایا جاتا ہے۔'' مائرہ کے لہجے میں از حد سختی اور درشتگی تھی''۔ تو تمہارے خیال میں مجھ میں مردانگی نہیں ہے۔ شاہ زیب کا لہجہ عجیب سا ہوگیا۔ ''نہیں ہے نہیں ہے مردانگی تب ہی تو کہا ہے کہ خود میں پیدا کریں۔ مرد میں ایک اَنا اور عزت نفس ہونی چاہیے''۔ ''تو مجھ میں مردانگی اور اَنا کے ساتھ ساتھ عزت نفس بھی نہیں ہے''۔ ''ہاں نہیں ہے''۔ وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی تھی۔ ''تو کس طرح کے مردوں میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں۔'' شاہ زیب کی آنکھوں میں اس وقت اتنا ملال تھا جسے مائرہ پڑھ ہی نہیں پائی۔ ''باسط کو دیکھ لیں وہ ایک مکمل مرد ہے۔ مردانگی میں بھی بڑھ کر ہے۔ خالہ میرا رشتہ مانگ رہی تھیں پر امی ابو عمر چچا کو زبان دے چکے تھے ورنہ آج حالات کچھ اور ہوتے ......'' مائرہ اُس کی حالت سے بے خبر جانے کیا کیا بول رہی تھی۔ شاہ زیب پیچھے ہٹا بیڈ کے پاس پڑے اپنے شوز اُٹھائے پہلے جرابیں پاؤں میں چڑھائیں پھر شوز پہنے۔ سائیڈ ٹیبل پہ پڑی گاڑی کی چابی اُٹھائی۔ صرف ایک ثانیے کے لیے مائرہ کی طرف دیکھا۔ اُس کا ایک ہاتھ دروازے کے ہینڈل پہ تھا۔ اگلے ہی پل وہ نرم گرم کمرے کی پناہ سے باہر تھا۔ ٹھٹھرا دینے والی لہو کو سرد کردینے والی ٹھنڈک تھی۔ ہوٹل کے ساتھ ہی ایک خالی قطعہ زمین کو پارکنگ کی شکل دی گئی تھی۔ اُس کی گاڑی اُدھر ہی پارک تھی۔

شاہ زیب کے ذہن میں اس وقت کچھ نہیں تھا۔ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ گاڑی نکال کے ڈھلوان سڑک پر لایا اتنے میں پیچھے سے ہوٹل کے اسٹاف میں سے ایک شخص نے دیکھا تو اُس کے پیچھے بھاگا کہ صاحب اس وقت اس موسم میں ڈرائیونگ کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ وہ تیزی سے بھاگا تھا اپنی جھونک میں گرا تو درد سے کراہ کے رہ گیا۔ اب اُسے اپنی فکر تھی شاہ زیب کا خیال بھول گیا تھا۔ اتنی دیر میں وہ کافی آگے آگیا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ گھپ اندھیرا تھا گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی بھی اس موسم میں ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ شاہ زیب کی نگاہیں غیر مرئی نقطے پہ مرکوز تھیں اور کانوں میں مائرہ کی آواز گونج رہی تھی۔ ''پلیز اپنے اندر مردانگی پیدا کریں۔ باسط کو دیکھ لیں وہ ایک مکمل مرد ہے۔ مردانگی میں بھی بڑھ کر ہے۔ خالہ میرا رشتہ مانگ رہی تھیں پر امی، ابو عمر چچا کو زبان دے چکے تھے ورنہ آج حالات کچھ اور ہوتے ......'' اُف۔ شاہ زیب کے لیے ان آوازوں سے پیچھا چھڑانا ناممکن تھا۔'' مائرہ باسط کو مکمل مرد قرار دے رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ وہ مردانگی میں بھی بڑھ کر ہے۔ تو یہ بات یہ خوبی یا وصف جو بھی ہے مائرہ کے علم میں کیسے آیا ہے۔ اُسے کیسے یہ بات پتہ چلی ہے کہ باسط مردانگی میں بھی بڑھ کر ہے۔ کیا وہ باسط کے ساتھ اُس کا موازنہ کر رہی تھی جو کہہ رہی تھی باسط میں بھی۔ تو کیا مجھ میں مردانگی کم ہے جو مائرہ کہہ رہی تھی کہ باسط مردانگی میں بھی بڑھ کر ہے۔ گویا باسط مردانگی میں شاہ زیب سے بازی لے گیا تھا جو اُس کی محبوب بیوی جسے شاہ زیب نے شادی کے بعد بھی محبوبہ کے رتبے پہ فائز رکھا تھا اُس باسط کی اپنے کزن کی اُس کے سامنے اپنے شوہر کے سامنے مردانہ اوصاف گنوا رہی تھی۔

ایسا کیوں تھا کیا مائرہ اُس سے ناخوش تھی؟ یہ ایسا روح فرسا سوال تھا کہ شاہ زیب کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ وہ خود سے ایک ہی سوال کر رہا تھا کیا مجھ میں کوئی کمی ہے؟ مائرہ جس طرح لڑائی کے موڈ میں بھری بیٹھی تھی شاہ زیب اُس سے بچنے اور دل و دماغ میں لگی آگ سرد کرنے کے لیے منظر سے ہٹا تھا۔ کیونکہ مائرہ لڑائی کے موڈ میں ہوتی تو بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی تھی۔ ہمیشہ وہ خاموش ہوتا۔ اس بار بھی اُس نے ہار مان لی۔ اور وہاں سے اُٹھ آیا۔ مائرہ تب بھی اُونچا اُونچا بول رہی تھی۔ اُس نے ایک بار بھی شاہ زیب سے نہیں پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو مت جاؤ۔ موسم خراب ہے۔ ایسے موسم میں یہاں خطرناک حادثے رونما ہونا عام سی بات تھی۔ پر مائرہ کو شاہ زیب کی پرواہ ہوتی تو ناں۔ اُس نے تو اپنی ساری نفرت اور کڑواہٹ اُس پہ انڈیل دی تھی۔ یہ خیال کیے بغیر کہ شاہ زیب پہ کیا گزر رہی ہے۔ یا اُس پہ آئندہ آنے والے وقت میں کیا گزرے گی۔

بارش تیز ہوگی تھی۔ شاہ زیب بغیر سوچ سمجھے گاڑی دوڑا رہا تھا۔ اُسے اس وقت کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے کیوں جا رہا ہے کس طرف جا رہا ہے۔

اُس کا سارا وجود گویا سماعت بنا ہوا تھا اور ایک ایک عضو مائرہ کی آواز جیسے سن رہا تھا۔ اب تو بارش، پہاڑ اور ان پہ چھایا اندھیرا، شور مچاتا دریائے نیلم بھی اُسے یہی سرگوشیاں کر رہا تھا کہ پلیز خود میں مردانگی پیدا کرو۔ باسط تم سے مردانگی

میں بڑھ کر ہے۔تم میں مردانگی اور عزت نفس کی کمی ہے...... ہاہاہاہا۔شاہ زیب تم میں مردانگی کی کمی ہے۔مردانگی کی کمی ہے اور ساتھ غیرت کی بھی کمی ہے اگر تم میں غیرت کی کمی نہ ہوئی تو آج تمہاری محبوب بیوی تمہارے سامنے اپنے شوہر کے سامنے ایک غیر مرد کی تعریف نہ کرتی اور تعریف کی بھی تو مردانگی کی......'' شاہ زیب کو یوں لگ رہا تھا اس وادی کی ہر چیز اُس کا مذاق اُڑا رہی ہے اُس پہ طنز کر رہی ہے۔اُسے بے غیرتی کا طعنہ دے رہی ہے۔''میں بے غیرت نہیں ہوں میں مکمل ہوں''۔اُس نے بہت اونچی آواز میں خود کلامی کی تھی مگر دریائے نیلم اور اُس کے متوازی چلتی سڑک بھی اُس پہ ہنس پڑی تم میں مردانگی نہیں ہے تم میں غیرت بھی نہیں ہے''۔''ہے ہے مجھ میں غیرت''۔اُس کے ہاتھ سے اسٹیرنگ ویل پھسل گیا۔اُس کی ہاتھوں میں نمی آ گئی تھی۔سخت سردی میں شاہ زیب کا سارا وجود پسینہ اُگل رہا تھا۔نمی تو اُس کی آنکھوں میں بھی تھی۔''میں بے غیرت نہیں ہوں نہیں ہوں بے غیرت مکمل مرد ہوں''۔اُس نے پاگلوں کی طرح چیخ کر پوری قوت سے کہا۔غصے کے عالم میں انٹرنگ ویل اُس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔آنکھوں میں اچانک آنے والی نمی نے اُسے عارضی طور پہ سامنے کا منظر دیکھنے سے محروم کر دیا تھا کیونکہ آنکھیں دُھندلا رہی تھی۔

یہ عارضی دھندلاہٹ موت کا خاموش پیغام ثابت ہوئی۔پہاڑی علاقوں میں ذرا سی غلطی زندگی سے ہمیشہ کے لیے دور کر دیتی ہے۔گاڑی اچانک اُچھل کر اُس کے قابو سے باہر ہوئی اُس کے اگلے ویل چند ثانیے کے لیے ہوا میں معلق ہوئے۔پھر سب کچھ شاہ زیب کے ہاتھ سے نکل گیا۔سڑک کی اُس سمت گہری کھائی تھی۔یہاں قدم قدم پہ ایسی بے شمار سینکڑوں فٹ گہری کھائیاں تھیں۔جو ذرا سی بھول چوک پہ جان لینے میں دیر نہیں لگاتی تھیں۔گاڑی کا اگلا حصہ نیچے کی طرف جھکا۔شاہ زیب نے دیوانہ وار گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر کی طرف نکلنے کی کوشش کی۔یہ اُس کی بیوقوفی تھی سامنے خلا تھا۔پل بھر میں گاڑی کا پچھلا حصہ نیچے کی طرف جھکا۔اُس نے ایک زبردست سا ہچکولا لیا۔تب تک شاہ زیب بھی دروازہ کھول چکا تھا۔پر اُس وقت تک زندگی موت سے ہار چکی تھی۔گاڑی بہت تیزی سے نیچے کھائی کی طرف جا رہی تھی۔اب شاہ زیب کی سماعتوں میں کوئی آواز نہیں تھی۔سب کچھ خاموش ہو چکا تھا۔گہرا سناٹا تھا۔نیچے کھائی میں بہت گہرا اندھیرا تھا۔اس سے بھی گہرا اندھیرا شاہ زیب کے وجود پہ اُترا ہوا تھا۔اُس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی ٹانگوں کا تو قیمہ بن گیا تھا۔اُسے کسی قسم کی طبی امداد کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔موت نے ہر ضرورت سے اُسے بے نیاز کر دیا تھا۔اندھیرے میں کسی نے بھی یہ حادثہ رونما ہوتا نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

مائرہ کمبل اوڑھے مزے سے لیٹی ہوئی تھی۔شاہ زیب کو گئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو رہا تھا۔اُس کی واپسی کے آثار ہی نہیں تھے۔اُس نے کمبل پرے پھینکا، جوتے پہنے اور کمرے سے باہر نکلی۔پتہ نہیں وہ کہاں تھا۔مائرہ کا خیال تھا شاید ہوٹل میں ہی کہیں بیٹھا ہو۔چھوٹا سا ہوٹل تھا۔اُس نے ممکنہ جگہوں پہ دیکھ لیا۔وہ کہیں نہیں تھا۔وہ ریسپشن کی طرف آ گی کہ شائد وہاں سے کچھ معلومات مل جائے۔''پریشانی اب اُس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ریسپشن پہ موجود لڑکا فوراً بھانپ گیا کہ کوئی بات ہے''۔''میرے ہزبینڈ ایک گھنٹے سے غائب ہیں اُن کا کچھ پتہ نہیں ہے۔میں نے ہوٹل میں بھی دیکھ لیا ہے وہ نہیں ہیں''۔''وہ کہاں گے ہیں کچھ بتایا نہیں''؟''نہیں اصل میں وہ کچھ غصے میں تھے اس لیے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔میں نے یہی سوچا کہ جب اُن کا غصہ ختم ہوگا تو آ جائیں گے مگر......'' مائرہ بولتے بولتے چپ ہو گی۔اتنے میں کچھ اور لوگ بھی اُس کے گرد جمع ہو گے تھے۔اُن میں ہوٹل کے اسٹاف کا وہ لڑکا بھی تھا جس نے شاہ زیب کو گاڑی لے جاتے دیکھا تھا۔وہ یہاں ٹھہرنے والے مسافروں کو جانتا تھا کیونکہ چھوٹا سا ہوٹل تھا۔''میڈم آپ کے شوہر نے براؤن کلر کی جیکٹ تو نہیں پہنی تھی۔''ہاں ہاں یہی کلر تھا''۔مائرہ بے قراری سے بولی۔''میں نے اُنہیں پارکنگ سے گاڑی نکال کر سڑک پہ لے جاتا دیکھا تھا اور اُن کے پیچھے بھاگا بھی کہ صاحب اس موسم میں ڈرائیونگ مت کریں۔مجھے پتھر سے چوٹ لگی میں وہیں گر گیا اتنے میں گاڑی دور جا چکی تھی''۔اُس لڑکے نے تفصیل سے بتایا اور جا کے ہوٹل کے منیجر کو بھی بلا لایا۔وہ خود مائرہ کے ساتھ پارکنگ لاٹ تک گیا کہ دیکھے آیا اُن کی گاڑی یہاں موجود ہے کہ نہیں۔گاڑی یہاں ہوتی تو ملتی ناں۔وہ اس وقت سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں مڑی تڑی حالت میں پڑی تھی۔گاڑی کو یہاں نہ پا کر مائرہ کی پریشانی حد سے سوا ہو گی۔اب وہ کرے تو کیا کرے۔''میڈم آپ کچھ دیر اور دیکھ لیں ہو سکتا ہے آپ کے شوہر واپس آ جائیں''۔ہوٹل کے ادھیڑ عمر منیجر نے اُسے تسلی دی۔پر وسوسے مائرہ کے دل و دماغ میں پنجے گاڑ کے بیٹھ چکے تھے۔

وہ جا کے ہوٹل کی لابی میں بیٹھ گئی۔تھوڑی تھوڑی دیر بعد ریسٹ واچ پہ ٹائم دیکھتی۔کچھ اور لوگ بھی اُس سے شاہ زیب کے بارے میں معلوم کر رہے تھے کہ آپ کے شوہر واپس آئے ہیں کہ نہیں۔ہوٹل میں مقیم اکثر مسافروں کو معلوم ہو چکا تھا۔منیجر خود اُسے کتنی بار تسلی دے چکا تھا۔جوں جوں گھڑی کی سوئیاں آگے کی طرف جا رہی تھیں۔مائرہ کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔آج تک شاہ زیب اس طرح ناراض نہیں ہوا تھا۔بلکہ وہ تو اُس سے ناراض ہوتا ہی نہیں تھا۔اپنی غلطی ہوتی یا نہ ہوتی ہمیشہ مائرہ کو وہی راضی کرتا۔لڑائی کی ابتداء ہمیشہ مائرہ کی طرف سے ہوتی۔وہ ہنس ہنس کے اُس کی کڑوی کسیلی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا۔اور اس طرح ناراض ہو کر وہ کہیں جاتا بھی نہیں تھا۔اور یہاں وہ گھر سے دور ایک اجنبی جگہ پہ اُسے اکیلا چھوڑ کر غائب تھا۔اس لیے وہ بہت پریشان تھی۔دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ہوٹل والے رات کا کھانا سرو کر چکے تھے۔مائرہ سے مزید انتظار برداشت نہیں ہو رہا تھا۔وہ پھر ریسپشن کی طرف چلی آئی۔

''میرے ہزبینڈ ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں۔منیجر سے کہیں کچھ کریں''۔وہ روہانسی ہو رہی تھی۔کچھ مرد اُسے ترس آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔سب کو پتہ تھا کہ اس لڑکی کا شوہر دو گھنٹے سے گاڑی لے کر غائب ہے۔وقتاً فوقتاً سب نے ہی ہمدردی جتائی تھی۔منیجر بہ نفس نفیس اُس کے پاس خود چل کر آیا۔

''میڈم مجھے لگتا ہے کہ خدانخواستہ آپ کے شوہر کسی حادثے کا شکار نہ ہو گئے ہوں۔ہم کچھ لوگوں کو اُن کی تلاش میں روانہ کر رہے ہیں آپ فکر مت کریں۔انشاءاللہ وہ واپس آ جائیں گے۔''

منیجر نے اُسے کھوکھلی تسلی دی۔اپنی کہی بات کا اُسے خود بھی یقین نہیں تھا۔کیونکہ ہوٹل کے جس لڑکے نے شاہ زیب کو گاڑی لے جاتے دیکھا تھا اُس نے کہا تھا کہ صاحب لوگ بہت تیز اور غیر ذمہ داری سے گاڑی لے کر گیا ہے۔

کچھ تجربہ کار لوگ جو ان علاقوں سے اچھی طرح واقف تھے وہ شاہ زیب کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔مائرہ دعا کر رہی تھی کہ شاہ زیب ٹھیک ٹھاک اور خیریت سے ہو۔گھر سے دور اس اجنبی جگہ سے اُسے اپنے اکیلے پن سے ڈر لگ رہا تھا۔شاہ زیب کے ساتھ اُسے ڈر نہیں لگتا تھا۔کچھ عورتیں بھی جو اُس کی طرح گھومنے پھرنے کی غرض سے آئی ہوئی تھیں۔اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔اُسے تسلی دینے لگیں۔

شاہ زیب کی تلاش میں گئے لوگ ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔کافی دیر ہو گی تھی۔اب تو منیجر خود بھی پریشان ہو رہا تھا۔آہستہ آہستہ کمروں کے دروازے بند ہونے لگے۔ہوٹل میں مقیم لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔مائرہ کے ساتھ اب صرف ایک ہی عورت تھی باقی اُٹھ کے چلی گی تھی۔

امدادی پارٹی واپس آ گئی تھی۔ شاہ زیب کی تلاش میں اُنہیں ناکامی ہوئی تھی۔ ایک تو رات تھی اُوپر سے بارش پھر خراب راستہ۔ گاڑی تو گاڑی پیدل چلنے والوں کے لیے بھی اس وقت باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ جو لوگ شاہ زیب کو ڈھونڈنے گئے تھے وہ برسوں سے ان علاقوں میں آباد تھے۔ یہاں کے چپے چپے کے بارے میں جانتے تھے۔ اُنہوں نے ممکنہ جگہوں پہ دیکھا تھا۔ نہ تو شاہ زیب اور نہ اُس کی گاڑی کی جھلک نظر آئی تھی۔ سب کے ذہن میں ایک ہی بات آ رہی تھی کہ شاہ زیب یقیناً کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔

اُنہوں نے واپس آ کر ہوٹل کے منیجر کو اپنی ناکامی کی اطلاع دی۔

مایوسی اُن سب کے چہرے پہ صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ وہ مائرہ کے پاس آیا جو پریشانی سے کسی اچھی خبر کے انتظار میں تھی۔ منیجر کو دیکھتے ہی وہ کھڑی ہو گی۔ ''کچھ پتہ چلا''۔ ''نہیں ہمیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ لگتا ہے کہ شاہ زیب صاحب کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں''۔ صاف جواب سن کے مائرہ کے چہرے کے تاثرات رونے والے ہو گئے۔ ''لیکن فکر نہ کریں ہم صبح ہوتے ہی پھر سے تلاش کا کام شروع کریں گے۔ ابھی یہ کام ناممکن ہیں''۔ مائرہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔

☆☆☆

عمر زیب بار بار دیوار گیر گھڑیال کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاہ زیب روزانہ ایک مخصوص وقت میں اُنہیں پی۔سی۔او سے فون کرتا تھا۔ نمبر اُس نے نوٹ کروا دیا تھا۔ اُنہوں نے دو بار خود کال کر کے شاہ زیب کا پوچھا مگر پی۔سی۔او کے مالک نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اُس کے پاس روزانہ فون کرنے بہت سے لوگ آتے تھے۔ وہ کس کس کو یاد رکھتا۔

ڈھلتی شام کے سائے اپنے پَر پھیلا رہے تھے۔ شاہ زیب اُٹھ کے باہر کی طرف بڑھے تو اُن کے سینے میں درد سا اُٹھا۔ ایک عجیب سا کرب اور اضطراب اُن کے پورے وجود پہ طاری ہو چکا تھا۔ اپنی اس حالت کی سمجھ اُنہیں خود بھی نہیں آ رہی تھی۔ اُنہیں خود بہ خود ہی جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے کسی انہونی کا احساس دلایا تھا۔ درد و کرب میں ڈوبی آواز میں اُنہوں نے دریکتا کو آواز دی۔ وہ دہل سی گئی۔ پپا نے کبھی اُسے اس طرح نہیں پکارا تھا۔ فوراً بھاگی بھاگی آئی ''جی پپا''۔ عمر زیب کا چہرا تکلیف کی وجہ سے زرد سا ہو رہا تھا۔ جانے کیا بات تھی۔

''پپا کیا ہوا ہے'' دریکتا نے اُنہیں دونوں کندھوں سے تھام کے پاس پڑی کرسی پہ بٹھایا اور پانی گلاس میں ڈال کے لے آئی۔ چند گھونٹ پی کے اُنہوں نے گلاس منہ سے ہٹا دیا۔ ''پپا ڈاکٹر عظیم کو فون کروں آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے''۔ اُنہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔ مجھے شاہ زیب کی طرف سے پریشانی لگی ہوئی ہے ابھی تک اُس نے کال نہیں کی ہے۔ میں کس سے رابطہ کر کے پوچھوں کیونکہ وادی نیلم میں میرا دور دور تک کوئی جاننے والا نہیں ہے''۔ وہ بے بسی سے سر پکڑے بیٹھے تھے۔ ''پپا ہو سکتا ہے کہ بھائی بھول گیا ہو''۔ ''نہیں نہیں وہ بھول نہیں سکتا۔ اس بار جب وہ جانے سے پہلے مجھ سے ملنے آیا تو اُس کے تیور بھولنے والے نہیں لگ رہے تھے''۔ اُنہوں نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ ''پپا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بھائی کو کوئی پرابلم نہ ہو گئی ہو''۔ دریکتا اُن کے بدترین خدشے کو الفاظ کی صورت میں ڈھال چکی تھی۔ اُنہوں نے وحشت بھری نگاہوں سے اُس کی سمت دیکھا۔ وہ اب کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ اس کا امکان بھی تو بہرحال موجود تھا۔ ''ارے مائرہ ہی کال کر دیتی ان لوگوں نے مجھے ہوٹل کا نمبر ہی نہیں دیا میں وہاں سے پتہ کر لیتا''۔ اب وہ غصے میں تھے۔ اُن کا حال بہت بے قراری لیے ہوئے تھا۔ ''پپا دیکھ لیں ابھی بہت ٹائم ہے بھائی یا بھابی میں سے کوئی نہ کوئی کال کر دے گا''۔ وہ پورے یقین سے بولی تھی۔ وہ فقط سر ہلا کے رہ گئے۔ کبھی کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ کبھی وال کلاک پہ وقت دیکھ رہے تھے کبھی بیٹھ جاتے کبھی کھڑے ہو جاتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اُن کے اضطراب اور کرب میں بجائے کمی ہونے کے اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ ''اے میرے مولا میرے بچے کے بارے میں مجھے جلد از جلد آگاہ کر دے''۔ اُن کے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی تھی اور فوراً قبولیت کے زینے پہ فائز ہوئی کیونکہ یہ ایک مضطرب باپ کے دل سے نکلی دعا تھی۔

عمر زیب کا سیل فون بجنا شروع ہو گیا۔ دریکتا نے اُٹھا کے دیکھا کوئی اجنبی سا لینڈ لائن نمبر تھا۔ عمر نے اشارے سے فون مانگا۔ دریکتا نے آن کرنے سے پہلے اُن کی طرف بڑھا دیا۔ اُنہیں پوری امید تھی کہ یہ فون کال شاہ زیب کے حال چال کے بارے میں اُنہیں کوئی آگاہی دینے والی ہے۔ اُنہوں نے بے تابی سے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف مائرہ تھی۔ اُن کے دل کو جیسے کسی نے اچانک تیز دھار آلے سے چیر ڈالا تھا۔ مائرہ رو رہی تھی۔ ''عمر چچا شاہ زیب کافی دیر سے گاڑی لے کے نکلے ہوئے ہیں ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں۔ ہوٹل کے منیجر نے اپنے کچھ لوگ شاہ زیب کی تلاش میں روانہ کیے وہ ابھی ابھی واپس آئے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ کچھ پتہ نہیں چلا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ شاہ زیب کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں اب وہ صبح ہونے پہ ہی دوبارا تلاشی کا کام شروع کریں گے''۔ اُس نے روتے روتے بتایا تھا۔ عمر زیب کے ہاتھ سے سیل فون چھوٹ کے نیچے کارپٹ پہ گر گیا۔ وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت و صامت بیٹھے تھے۔ مائرہ نے اتنا کچھ بتایا تھا وہ ایک لفظ تک نہیں بولے تھے۔ دریکتا نے ایک نظر پپا کی طرف اور دوسری نظر سیل فون پہ ڈالی۔ گرنے کے باوجود رابطہ بحال تھا۔ اُس نے فون کان سے لگا لیا''۔

اُس کی سماعتوں سے مائرہ بھابھی کی جانی پہچانی آواز ٹکرائی۔ ''بھابھی مجھے بھی تو بتائیں کیا ہوا ہے''۔ وہ گاہے بگاہے پپا کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ جو فون سننے کے بعد بالکل خاموش تھے۔ مائرہ بھابھی نے جو کچھ بتایا اُسے سننے کے بعد دریکتا کو بھی پپا کی طرح چپ لگ گی۔ وہ اُن کے پاس آ کے بیٹھ گی۔ ''پپا آئیں اپنے کمرے میں چلیں''۔ نہیں میں اِدھر ہی ٹھیک ہوں۔ دریکتا کو یوں لگا جیسے یہ آواز پپا کے منہ سے نہیں نکلی ہے۔ وہ بہت سرد اور بے حس سے لگ رہے تھے۔ جیسے یہ اُس کے پپا نہ ہوں اُن کے بھیس میں کوئی اور ہو۔

مائرہ اپنے والدین کو بھی کال کر کے بتا چکی تھی۔ کیونکہ پندرہ منٹ گزرنے کے بعد تایا اورنگزیب شریں تائی، مائرہ کی چھوٹی بہن اور بھائی اُن کے گھر چلے آئے۔ شریں بےحد پریشان تھی۔ مائرہ اُنہیں بتانے کے دوران مسلسل روتی رہی تھی۔ اورنگزیب کا بھی یہ حال تھا۔ وہ رات اُن سب نے جاگ کے اکٹھے اُدھر ہی گزاری۔ کسی نے ایک پل بھی آنکھ نہیں جھپکی تھی۔ ایسے عالم میں نیند آتی بھی کس کو تھی۔ عجیب تکلیف اور اذیت سے بھری رات تھی۔ اُن سب کا دکھ مشترکہ تھا اس لیے دلوں کے فاصلے جو کچھ عرصہ قبل اچانک در آئے تھے خود سے ہی ختم ہو گئے تھے۔

☆☆☆

مائرہ کی آنکھ تھوڑی دیر کے لیے لگی تھی اور پھر خود ہی کھل گئی تھی۔ اُس نے بہت بُرا خواب دیکھا تھا۔ نیند کے مختصر سے وقفے کے دوران اُس نے خواب بھی دیکھ لیا تھا۔ اُس کے بعد اُس سے سویا ہی نہیں گیا۔ رات گزر ہی نہیں رہی تھی۔ بڑی مشکل سے انتظار کے بعد صبح ہوئی۔

شاہ زیب کی تلاش میں ایک تجربے کار امدادی پارٹی روانہ ہو گئی تھی۔ مائرہ اپنے کمرے سے اُٹھ کے باہر ہوٹل

کی بالکونی میں کھڑی ہوگی تھی۔

☆☆☆

سڑک کے بائیں جانب امدادی پارٹی کے طارق کو شیشے کے ٹوٹے ہوئے بہت سارے ٹکڑے نظر آئے۔ اُس نے چیخ کے اپنے دوسرے ساتھی کو بھی آواز دی۔ سڑک کے بائیں جانب گہری کھائی تھی اُس کے کنارے پہ جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اُنہیں جھاڑیوں میں اُسے پھنسی ہوئی گاڑی کی لائیٹ نظر آئی۔ اُس نے سڑک کے کنارے بیٹھ کے وہ ٹوٹی ہوئی لائیٹ کا ٹکڑا باہر نکالا اتنے میں اُس کا دوسرا ساتھی بھی اُس کے قریب پہنچ گیا۔

''کیا بات ہے طارق۔'' اُس نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ دیکھو گاڑی کی ہیڈ لائٹس کے ٹکڑے ملے ہیں میرا خیال ہے کہ گاڑی اسی کھائی میں گری ہے یہ بہت گہری ہے۔ تم باقی ساتھیوں کو بھی فوراً بلاؤ اور کھائی میں اُترنے کا انتظام کرو میں اتنے میں ہوٹل جا کے اطلاع کرتا ہوں نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ بدقسمت نوجوان اسی جگہ کسی حادثے کا شکار ہوا ہوگا''۔ وہ اپنے دوسرے ساتھی سے بات کر رہا تھا۔ طارق ہوٹل آگیا اور منیجر کو مطلع کیا ساتھ وہ ٹوٹی ہوئی ہیڈ لائٹس کے ٹکڑے بھی دکھائے۔ منیجر خود اُس کے ساتھ وہاں پہنچ گیا جہاں سے وہ گاڑی کی لائٹس کے ٹکڑے ملے تھے۔ اُسے تاسف سا ہوا، اُس نے سڑک سے آگے گہری کھائی میں جھانک کے دیکھا مگر گہرے لامتناہی اندھیروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ طارق کی طرح اُس کا دل بھی کہہ رہا تھا کہ شاہ زیب نامی نوجوان مردہ حالت میں اسی کھائی کی تہہ میں موجود ہے۔ طارق کے ساتھی اپنے کام کا آغاز کر چکے تھے۔

شدید جاں توڑ محنت کے بعد اُنہیں کامیابی نصیب ہو ہی گی مگر اُنہیں اس کامیابی کی خوشی نہیں ہوئی۔ کیونکہ شاہ زیب کا مردہ وجود کھائی کی تہہ میں موجود تھا۔ بہت مشکل سے باہر نکالا گیا۔ لاش کی حالت خراب تھی۔ اُس کے چہرے پہ اذیت اور حسرت رقم تھی۔ اُن لوگوں نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیے خاص طور پہ منیجر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیسا بانکا سجیلا نوجوان تھا۔ جسے موت کے بے رحم ہاتھ مٹی میں ملا گئے تھے۔

☆☆☆

اب تمہیں کیا بتائیں ہم کیسے تمہیں دکھائیں
سینے میں کیا اُتر گیا
آنکھ پہ کیا گزر گی
اور یہ کہ
اب کیسے جاری رکھوں سفر کہ وہ کھو گیا ہے
مجھے چلتے رہنے کا حوصلہ دے کر
مزید یہ کہ
رات باقی تھی جب وہ بچھڑا تھا
عمر بیتی ہے رات باقی ہے

عمر زیب ٹکر ٹکر ایک ایک کے منہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صبح سے سب ایک ہی بات کر رہے تھے کہ شاہ زیب چلا گیا ہے شاہ زیب چلا گیا ہے اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اُن کا پورا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اُن کا اپنا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ شاہ زیب کے دوست، ملنے جلنے والے اور نگزیب کے توسط سے آئے ہوئے لوگ۔ غرضیکہ ایک ہجوم تھا لوگوں کا۔ اور اس ہجوم کے بیچ عمر زیب ایک واحد ایسے شخص تھے جن کی آنکھوں سے ایک آنسو تک نہیں ٹپکا تھا۔ وہ سب کے چہروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اورنگزیب بھائی کا چہرا، شریں بھابھی کا چہرا، مائرہ کا چہرا اور تو اور ان چہروں کے درمیان ہارون اور نوید بھائی کا چہرا بھی تھا۔ اُن کی آنکھیں شدت گریہ سے لال تھیں۔

طاہر لغاری بھیڑ سے بچتے بچاتے عمر زیب تک پہنچے جواب بھی غائب دماغی کی حالت میں لوگوں کو دیکھے جا رہے تھے۔ ''میرے دوست رو لے۔ ایک بار جی بھر کے رو لے۔ ورنہ یہ رُکے ہوئے آنسو تیرے اندر آگ لگا دیں گے۔ اس زہر کو آنکھوں کے راستے باہر نکال دو۔ دیکھو تھوڑی دیر میں شاہ زیب کو قبرستان لے جانے والے ہیں سب لوگ۔ اُٹھو اپنے لاڈلے کا دیدار کر لو۔ آخری بار۔ پھر اُسے کبھی نہیں دیکھ پاؤ گے تم۔ وہ بچھڑ گیا ہے ہم سب سے۔ عمر تم نے سنا وہ بچھڑ گیا ہے ہم سب سے''۔ طاہر لغاری نے اُس کے کندھے بُری طرح جھنجھوڑ ڈالے۔ اُس کی حالت میں سر مو کوئی تبدیلی بھی واقع نہیں ہوئی۔ اپنی خالی ویران آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ شاہ زیب کا بے جان لاشہ اُس کی نگاہوں کے سامنے ہی تو گاڑی سے اُتارا گیا تھا۔ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے کہ شاہ زیب کی گاڑی وادی نیلم میں ایک کھائی میں گر گی تھی اور وہ زندہ نہیں بچا۔ لاش کی حالت بہت بُری ہے اس طرح کی اور کتنی باتیں تھیں جو لوگ عمر زیب کے سامنے کر رہے تھے مگر اُن پہ کوئی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ نہ چیخے نہ چلائے نہ روئے نہ فریادیں کیں بس خاموشی سے سارا منظر دیکھتے رہے۔ شاہ زیب اُجلی چادر والی چارپائی پہ اُن کے سامنے ہی تو سویا ہوا تھا۔ باقی جسم کے مقابلے میں اُس کے چہرے کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس لیے چہرا کفن نے باہر تھا فی الحال۔

عمر زیب کو اتنا یاد تھا کہ شاہ زیب گھومنے پھرنے کے لیے وادی نیلم گیا ہوا ہے۔ بس اُنہیں ایک بات کی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ جب وہ گھومنے پھرنے کے لیے گیا تھا تو ابھی اُن کے سامنے کیونکر لیٹا ہوا تھا۔ نہ بول رہا تھا نہ ہل رہا تھا نہ آنکھیں کھول رہا تھا۔ ایک جگہ پہ ساکت تھا۔ انہوں نے جی ہی جی میں اُسے کتنی بار پوچھا تھا کہ تم کیوں لیٹے ہوئے ہو۔ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہے۔ تمہارے لب خاموش کیوں ہیں۔ میں نے پوری رات تمہاری فون کال کا انتظار کیا ہے سویا نہیں ہوں۔ تم ناراض ہو مجھ سے کس بات پہ۔ بتاتے کیوں نہیں۔ میں نے تمہاری ساری ضدیں پوری کی ہیں اگر تم نے اپنی کوئی اور ضد منوانے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے تو بتاؤ میں تمہاری اور ضد بھی پوری کر دوں گا۔ تم اُٹھو اور چپکے سے میرے کان میں کہہ دو۔ ہاں ہاں شاباش بول دو ناں اپنے پپا سے بول دو......

پر شاہ زیب نہیں بولا نہ اُس کے ساکت لب ہلے۔ اُنہوں نے اب چیخ چیخ کے بلند آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ ''شاہ زیب بولو جواب دو میں تم سے پوچھ رہا ہوں ناں کیوں نہیں بولتے''۔ اُنہوں نے اجلی چادر والی چارپائی پہ سوئے ہوئے شاہ زیب کو اچانک دونوں کندھوں سے پکڑ لیا۔ طاہر لغاری اور اورنگزیب دونوں بیک وقت اُن کی طرف بڑھے اور بمشکل تمام شاہ زیب کے کندھے اُن کی گرفت سے آزاد کرائے۔ ''دیکھو نہیں بولتا نہیں جواب دے رہا میری بات کا نافرمان ہو گیا ہے تم لوگ اسے بات کرو ناں کہ میری بات کا میرے سوالوں کا جواب دے''۔ طاہر لغاری کا کلیجہ اپنے عزیز دوست کو اس حال میں دیکھ کے جیسے منہ کو آنے لگا۔ شاہ زیب کی جوان حسرت ناک موت نے عمر زیب سے اُس کے حواس چھین لیے تھے۔ وہ اب حواس اور ہوش سے عاری ایک شخص تھا جنہیں یہ پتہ تک نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں کیوں کر رہے ہیں۔ عمر زیب پاگل ہو گیا تھا۔ شاہ زیب کا جنازہ اُٹھایا جانے لگا تو تین مردوں نے عمر کو اپنی گرفت میں

جلڑ لیا وہ بار بار شاہ زیب کے بے جان جسم کی طرف بھاگ رہا تھا۔ "اسے پوچھو ناں کیوں نہیں بولتا جواب کیوں نہیں دیتا میری بات کا......" وہ بار بار یہی سوال کر رہے تھے شاہ زیب اس قابل ہوتا تو بولتا ناں۔ وہ اپنے ابدی سفر پہ روانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

شاہ زیب کو اُس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا کے سب مرد گھر لوٹ آئے تھے۔

طاہر لغاری اور اشعر بھی عمر زیب کے گھر ہی تھے۔ عمر کی ذہنی و جسمانی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اشعر ڈاکٹر کو گھر لے آیا۔ اُس نے عارضی طور پہ عمر زیب کو انجکشن لگایا اور سیپلنگ پلز دیں۔ فی الحال نیند اُن کے لیے اچھی تھی۔ ڈاکٹر نے جاتے جاتے گھر والوں سے کہا کہ عمر زیب کو فوراً کسی دماغی معالج کو دکھائیں ورنہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی ذہنی حالت ابتر ہوتی جائے گی۔ دریکتا، مائرہ کو تو اپنا ہوش ہی نہیں تھا باقی عورتیں اندر پرسہ دینے والوں کے پاس بیٹھی تھیں۔ اشعر نے زبردستی عمر زیب کو دودھ کے ساتھ نیند کی گولی دی۔ اُس نے سارا دن اِدھر ہی گزارا تھا۔ خاصی بھاگ دوڑ کی تھی۔ اب تھکا ہوا تھا اپنے گھر جا کے آرام کرنا چاہ رہا تھا۔ پپا اِدھر ہی تھے وہ اپنی گاڑی لے کے واپس آ گیا۔

بیڈ پہ سونے کے لیے لیٹا تو آج کے دن کے سارے واقعات نگاہوں میں پھرنے لگے۔ شاہ زیب کی موت کا اُسے بھی بہت زیادہ دکھ تھا۔ دریکتا کو اُس نے پھوٹ پھوٹ کے روتے دیکھا تھا وہ لڑکی سارا دن روتی رہی تھی۔ اشعر نے سوچا پتہ نہیں ان لڑکیوں کی آنکھوں میں اتنے آنسو کہاں سے آ جاتے ہیں جو تھکتی ہی نہیں ہیں۔ دریکتا کو پھوٹ پھوٹ کے روتے دیکھ کے ایک بار اُس کے جی میں آئی تھی کہ اُسے چپ کروا دے۔ پر وہ اس پہ عمل نہیں کر پایا تھا۔ وہ اس کے بعد عورتوں کے ہجوم میں کہیں گم ہی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

شریں نے مائرہ کو زبردستی تھوڑا کھانا کھلایا۔ وہ کل سے بھوکے پیٹ تھی۔ ایک کھیل تک اُس کے منہ میں نہیں گئی تھی۔ ساتھ اُس کی طبیعت بھی عجیب گری گری سی ہو رہی تھی۔ کچھ کھانے کے دل چاہتا بھی نہیں تھا اور دو دن سے بھوک ویسے بھی مری ہوئی تھی۔ شریں کی ساری توجہ مائرہ پہ مرکوز تھی۔ دریکتا کی طرف اُس کا دھیان ہی نہیں گیا۔ غم کا پہاڑ تو اُس پہ بھی ٹوٹا تھا۔ جوان بھائی کی جدائی کا صدمہ اُس نے بھی جھیلا تھا۔ شریں مائرہ کی ماں تھی اُس کی تو نہیں تھی جو اُس کے لیے فکرمند ہوتی۔ فوزیہ چچی نے ایک بار اُسے کھانے کا پوچھا اُس کے نفی میں سر ہلانے پہ دوبارہ نہیں کہا۔ اُس کا بی پی کمزوری کی وجہ سے لو ہو رہا تھا۔ چکر آ رہے تھے جہاں بیٹھی تھی ٹیک لگا کے وہیں سو گئی۔ دنیا کے ہنگامے اپنی جگہ تھے۔ سب اپنے معمول کے کام کرنے لگے کب تک شاہ زیب کا غم مناتے یا اُسے روتے۔

شریں نے جوس بنا کے زبردستی مائرہ کو پلایا پینے کے فوراً بعد اُس کا جی متلانے لگا اور وہ واش بیسن کی طرف بھاگ گی۔ سب جوس معدے سے باہر آ گیا تھا۔ شریں اُس کے پاس موجود نہیں تھی۔ مائرہ نے منہ ہاتھ دھویا اور آ کے بیڈ پہ لیٹ گی۔ اُس میں تو جیسے کوئی طاقت اور توانائی ہی نہیں رہی تھی۔ دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

عمر زیب کو طاہر لغاری باقاعدگی سے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے تھے۔ یہ بات اورنگزیب اور نوید کے ساتھ ہارون کو بھی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ طاہر لغاری کو ناپسند کرنے والوں میں شریں بھی تھی۔ وہ روز عمر زیب کا پتہ کرنے آتے اُس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتے۔ کیونکہ گھر میں کسی اور کو اس کا چنداں

احساس نہیں تھا کہ عمر زیب کی ذہنی حالت کے پیش نظر مکمل علاج اور سکون کی ضرورت۔

☆☆☆

شاہ زیب کے انتقال کو چالیس دن گزر چکے تھے۔ عمر زیب کے سارے بھائی بھابیاں ابھی تک شہر میں ان کے گھر میں تھے۔ سب اس طرح رہ رہے تھے کہ برسوں سے اس گھر کے رہائشی ہوں۔ دریکتا خود کو اپنے ہی گھر میں اجنبی اور اوپرا اُوپرا سا محسوس کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

مائرہ کی طبیعت آج بہت خراب تھی صبح سے دل بیزار سا تھا اور متلی والی کیفیت تھی۔ شریں نے اُسے کہا کہ تیار ہو جاؤ ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ جواباً مائرہ نے کہا کہ ڈاکٹر عظیم کو کال کر دیں وہ خود گھر آ جائیں گے۔ ڈاکٹر عظیم نہ صرف عمر زیب کے بہت اچھے دوست تھے بلکہ ایک طرح سے اُن کے فیملی ڈاکٹر بھی تھے۔ شریں کو کچھ اور شک تھا پر مائرہ کے کہنے پہ اُس نے ڈاکٹر عظیم کو کال کر دی۔

وہ آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ گے۔ مائرہ کو چیک کرنے کے بعد اُنہوں نے شریں سے کہا کہ مائرہ کو کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ وہ اپنے میڈیکل باکس سمیت روانہ ہوئے تو شریں مائرہ کے سر پہ آ کھڑی ہوئی "تم تیار ہو جاؤ میں تمہیں لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں۔ مائرہ چون وچراں کیے بغیر اُن کے ساتھ ہو لی۔

لیڈی ڈاکٹر نے چیک اَپ کیا اور مائرہ کے کچھ ٹیسٹ کرنے کے بعد خوشخبری سنائی کہ آپ کی بیٹی اُمید سے ہے۔ شریں بظاہر خوش مگر اندر سے پریشان تھی۔ "مائرہ بات سنو گھر جا کے کسی سے اس بات کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو ڈاکٹر نے کہا۔ اس مصیبت کی کسر رہ گئی تھی۔ جو پوری ہو گئی ہے۔ مجھے تمہاری حالت دیکھ کے پہلے ہی اس بات کا شک تھا۔ حیرت ہے تمہیں پتہ ہی نہیں چلا"۔ اُنہوں نے لگے ہاتھوں مائرہ کو بھی جھاڑ ڈالا۔ وہ ڈاکٹر کی سنائی گئی خوشخبری کو مصیبت کہہ رہی تھی اور پریشان سی تھی۔ مائرہ خاموشی سے ماں کی بات سنتی رہی۔ "شاہ زیب خود تو مر گیا ہے اپنی نشانی تمہارے پیٹ میں زندہ چھوڑ گیا ہے"۔ شریں کا لہجہ اور انداز بہت ناقابل فہم تھا۔

"کیا ٹکر ٹکر مجھے دیکھ رہی ہو۔ ہوش کے ناخن لو آنکھیں اور کان کھلی رکھو۔ میں تمہیں اتنا بیوقوف نہیں سمجھتی تھی۔ خیر میں خود ہی کچھ کرتی ہوں"۔ شریں نے اپنا غصہ اُس پہ نکالا۔ پھر وہ اُس کے کانوں میں کھسر پھسر کرنے لگی۔ اب بات مائرہ کی سمجھ میں آ گئی تھی اور شریں مطمئن تھی۔ "خیر یہ بتاؤ شاہ زیب کا بینک بیلنس کتنا ہو گا تم دونوں کا اپنا اپنا اکاؤنٹ تھا۔ وہ اب اُسے قدر دور ہو کے بیٹھ گئی۔ "ہم دونوں کا اکاؤنٹ جوائنٹ تھا میں نے بتایا بھی تھا آپ کو"۔ پھر اُس نے بینک اکاؤنٹ میں موجود رقم کی تفصیل بتائی۔ "ہاں رقم تو اچھی خاصی ہے۔ تمہارے ابو بتا رہے تھے کہ بزنس ڈاؤن جا رہا ہے"۔ شریں یہ تفصیل دانستہ چھپا گئی کہ اُن کے شوہر اور بیٹے کی نااہلی کی وجہ سے بزنس خسارے میں ہے۔ کتنے اداروں کا آرڈر وہ مکمل نہیں کر سکے تھے۔ اچھا خاصا قرضہ چڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

عدنان ہاشمی کاغذات اپنے سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ اورنگزیب سمیت نوید اور ہارون بھی موجود تھے۔ ایک کونے میں عمر زیب بھی بیٹھے تھے پر اُن کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ عدنان ہاشمی نے کچھ قانونی تقاضے پورے کرنے تھے اس لیے اُن کے پاس آیا تھا۔ اُس نے دریکتا کے حصے کی تفصیلات بتائیں۔ عمر زیب کے تمام کاروبار اس گھر اور دیگر جائیداد کا وارث

عمر زیب نے اُسے ہی بنایا تھا۔ یہ وصیت پرانی تھی جب عمر زیب نے شاہ زیب کا حصہ اُس کو دیا تھا تب اُنہوں نے دریکتا کے بارے میں بھی وصیت تیار کر لی تھی۔ شاہ زیب کی وفات اور عمر زیب کی ذہنی حالت کے پیشِ نظر عدنان ہاشمی نے خود اُن کے پاس آنے میں دیر لگائی تھی۔ عمر زیب کے بھائیوں اور بھابھیوں کی موجودگی میں عدنان ہاشمی نے وصیت پڑھ کے دریکتا کو سنائی۔ اُسے دولت و جائیداد کی تفصیلات سے دلچسپی نہیں تھی۔ مگر اورنگزیب اور شریں سمت باقیوں کی توجہ بھی اُسی کی طرف تھی۔ ہارون اور نوید کے چہرے اُتر گئے تھے وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید اُنہیں بھی کچھ مل جائے۔ اُن کے پاس اپنی اچھی خاصی جائیداد تھی پھر بھی اُن کی ہوس ختم نہیں ہو رہی تھی۔ حالانکہ عمر نے اپنی گاؤں والی زمین برابر برابر اُن تینوں بھائیوں کو بانٹ دی تھی۔ باقی عمر کے پاس جو کچھ تھا وہ آنکہ کا چھوڑا ہوا یا پھر اُس کی اپنی محنت تھی جس کے حقدار اُس کی بیٹی اور بیٹا تھا۔

☆☆☆

وکیل کے جاتے ہی شریں اورنگزیب کو لے کر بیٹھ گئی۔ ''آپ نے دیکھا عمر بھائی نے شاہ زیب کے ساتھ کتنی زیادتی کی۔ دریکتا کو اتنا کچھ دیا اور شاہ زیب کو بس تھوڑا بہت دے دلا کے خوش کر دیا''۔ وہ سراسر غلط بیانی سے کام لے رہی تھی۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ شاہ زیب کا حصہ دریکتا سے زیادہ ہی تھا۔ ''ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ مائرہ کے پاس اب صرف وہ گھر اور بینک بیلنس ہی بچا ہے''۔ اورنگزیب نظر چرا گئے تھے۔ شریں کو جیسے سانپ نے ڈنک مارا۔ ''اور وہ کروڑوں کا کاروبار وہ کس کا ہے''۔ وہ چمک کے بولی، کاروبار سمجھو ٹھپ ہو گیا ہے شیئرز بیچ کے قرضہ اُتارنا پڑے گا۔ اس کے بعد کچھ نہیں بچے گا''۔

اورنگزیب اور اُن کے لاڈلے سپوت کی وجہ سے یہ سب ہوا تھا۔ عاشر کا رویہ اسٹاف کے ساتھ بہت حاکمانہ تھا۔ شاہ زیب نے اُسے اختیار کیا دیا تھا وہ خود کو کسی اور سیارے کی مخلوق تصور کرنے لگا تھا۔

اس کے اس رویئے کی وجہ سے اسٹاف میں بے چینی پیدا ہو رہی تھی۔ شاہ زیب کو اکثر اپنے کاروبار کے سلسلے میں آؤٹ آف سٹی بھی جانا پڑتا۔ ایسی صورت میں عاشر تمام اُلٹے سیدھے فیصلے خود کرتا۔ رہی سہی کسر اورنگزیب نے گھٹیا میٹریل خرید کر پوری کر دی تھی۔ شاہ زیب کے قائم کیے گئے نوزائیدہ کاروبار کو سخت دھچکہ لگا تھا وہ دھڑام سے زمین بوس ہوا تھا۔ اورنگزیب اور عاشر اب بیٹھے بغلیں بجا رہے تھے۔ مائرہ بھی اس صورتحال سے ناواقف تھی۔ وہ تو خوش تھی کہ گھر کے ساتھ ساتھ کاروبار کی بھی تن تنہا مالک بن گئی ہے۔ بے شک کاروبار خسارے میں ہے پر کاروبار تو ہے ناں۔ شریں، اورنگزیب یا عاشر میں سے کسی نے اُسے نہیں بتایا تھا۔ شاہ زیب کی موت کے گرداب سے وہ نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔ کیونکہ شریں اُسے مستقبل پہ نظر رکھنے پہ بار بار اصرار کر رہی تھی۔

''مائرہ کو تو پتہ ہی نہیں ہے۔'' شریں نے شوہر کی توجہ اس نکتے کی طرف دلائی۔ ''ہاں اُسے میں کچھ دن تک بتا دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ مائرہ کو اپنا گھر کرائے پہ دے دینا چاہیے۔ اپنا اچھا پوش علاقے میں بنا ہوا نیا گھر ہے۔ کرایہ بھی اچھا مل جائے گا۔ ویسے بھی وہ وہاں اکیلی رہ تو نہیں سکتی''۔ ''ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں مائرہ انکار نہیں کرے گی۔ آپ کو وہ گھر کرائے پہ دے دینا چاہیے''۔ چلو میں وہ کام بھی کر لوں گا۔ اب صورتحال کافی عجیب سی ہو گی ہے۔ عمر تو سمجھو آدھے سے زیادہ پاگل ہو گیا ہے۔ اُسے کسی چیز کا ہوش نہیں ہے۔ اتنا بڑا کاروبار ہے۔ دریکتا نازک سی لڑکی ہے وہ مردوں والے کام تو نہیں کر سکتی ناں۔ میں کل عمر کی فیکٹری جاتا ہوں خود۔ اور سب دیکھتا ہوں۔ عمر میرا چھوٹا بھائی ہے میری ذمہ داری ہے اب سب مجھے ہی دیکھنا ہو گا ناں۔ وہ بہت دردمندی سے بولے۔ شریں اپنے سرتاج کی عقل مندی پہ عش عش کر

اٹھی۔ مگر نوید اور ہارون بھی تو عمر کے بھائی تھے۔ اُن دونوں نے ایکا کر لیا تھا۔ اورنگزیب جب عمر کی فیکٹری گئے تو وہاں ہارون اور نوید اُن سے پہلے ہی موجود تھے۔ جو کچھ اُنہوں نے سوچا تھا وہی کچھ اُن دونوں کے ذہن میں بھی تھا۔ اس موقعے پہ لڑائی سود مند نہیں تھی۔ وہ خاموش ہو گئے۔ فیکٹری کا منیجر عمر زیب کے تین تین بھائیوں کو اکٹھا دیکھ کر الرٹ ہو گیا۔ عمر زیب کی حالت اب ایسی نہیں تھی کہ وہ پہلے کی طرح کاروبار چلا سکتے۔ اس لیے وہ ہفتہ دس دن میں اُن کے گھر جاتا اور دریکتا کو آگاہ کرتا رہتا۔ اُسے بھی کاروباری سوجھ بوجھ نہیں تھی اپنی عقل اور شعور کے مطابق ہی بات کرتی۔ منیجر بھانپ چکا تھا کہ اس گھر اور کاروبار کی مالک نو عمر بھی ہے اور اتنی سمجھدار بھی نہیں ہے۔ اُس کے دل میں خوفِ خدا موجود تھا بے ایمانی کا خیال بھی اُس کے دل میں نہیں آیا۔ وہ پہلے کی طرح اپنی خدمات سرانجام دیتا رہا۔ عمر زیب کا رویہ اپنے ملازمین کے ساتھ ماتحتوں والا نہیں تھا۔ اس لیے سب اُسے پسند بھی کرتے تھے اور اپنی گزشتہ روش پہ قائم تھے۔

عمر زیب نے جیتے جی دریکتا کو اپنے حصے کا مالک بنا دیا تھا۔ قانونی رو سے اب وہ وارث تھی اور عاقل و بالغ بھی تھی۔ اپنی مرضی سے فیصلے کر سکتی تھی۔ مگر اُس نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ پپا نے اُسے کاروباری بکھیڑوں سے دور ہی رکھا تھا۔ اُس پہ کوئی بوجھ نہیں ڈالا تھا۔ منیجر ارسلان درانی نے دبے الفاظ میں اُسے دو تین بار کہا کہ آپ ہفتہ میں ایک بار آفس کا چکر لگا جائیں کریں۔ اس سے آپ کو بہت فائدہ ہو گا۔ پر دریکتا کا دل نہیں چاہتا تھا کہ پپا کو چھوڑ کے جائے۔ وہ تو کالج بھی مارے باندھے جاتی تھی۔ وہاں بھی اُس کا دھیان پپا میں ہی اٹکا رہتا۔ عمر زیب کے بھائیوں نے تو پکے پکے اِدھر ہی ڈیرے ڈال لیے تھے۔ فرح اور فوزیہ گاؤں لوٹ گی تھیں مگر شریں اِدھر ہی تھی۔ مائرہ نے بھی کہا تھا کہ امی آپ میرے پاس ہی رہیں۔ دریکتا پہ انہوں نے یہی ظاہر کیا تھا جیسے بحالت مجبوری یہاں رہ رہی ہیں ورنہ اُن کا بس چلے تو ابھی اور اسی وقت گاؤں والی حویلی لوٹ جائیں۔ مائرہ سے چھوٹی سائرہ بھی پڑھائی کے بہانے اِدھر ہی آ گئی تھی۔ ٹھاٹ سے باوردی ڈرائیور کے ساتھ کالج جاتی۔ وہاں سے واپسی پہ شام کو اکیڈیمی جاتی۔ اُسے مختلف کورس کرنے کا جنون تھا۔ فی الحال تو وہ اپنا پڑھائی کے سلسلے میں اکیڈیمی جاتی تھی۔ اس کے بعد اُس کا پروگرام کچھ اور تھا۔ شہری رنگ ڈھنگ اُسے کچھ زیادہ ہی بھا گیا تھا۔ گاؤں جانے کا دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ یہاں بہت خوش تھی۔ اپنی مرضی سے مائرہ کے ساتھ والا کمرا لیا تھا۔ اس میں سہولت اور اُس کی مرضی کی ہر چیز موجود تھی۔ جدید میوزک سسٹم، انٹرنیٹ، کیبل اور اسی نوعیت کی دیگر چیزیں وہ بھی بہت تیزی سے زمانے کا چلن سیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری آئے ہوئے تھے۔ آج اُنہوں نے عمر کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔ اورنگزیب سے سامنا ہوا تو اُنہوں نے سلام کیا۔ اُس نے بہت سرد مہری سے سلام کا جواب دیا۔ اور اُسے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ کافی دیر وہ اکیلے بیٹھے رہے۔ کسی نے آ کر ڈرائنگ روم میں جھانکا تک نہیں۔ وہ پہلے آتے تو کسی اپنے کی طرح عمر زیب اُنہیں کبھی بیڈ روم میں کبھی اسٹڈی روم میں بٹھا لیتے۔ کسی قسم کا کوئی تکلف ہی نہیں تھا۔ جب سے شاہ زیب کی موت ہوئی اور عمر کے بھائیوں، بھابھیوں نے یہاں قدم رنجہ فرمایا۔ وہ پہلے والی بے تکلفی ختم ہو کے رہ گی تھی۔ اب وہ صبر سے انتظار کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد اُنہیں قدموں کی چاپ اس طرف آتی سنائی دی۔ عمر زیب کے بڑے بھائی اورنگزیب اندر داخل ہوئے۔ ''میں کافی دیر سے انتظار کر رہا ہوں۔ عمر کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے''۔ اُنہیں بہت غصہ آیا پر لہجہ نرم ہی تھا۔

''عمر کو میں خود ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔ ایک بہت اچھے ڈاکٹر کا کسی نے بتایا ہے۔ جس ڈاکٹر سے آ
اُس کا علاج کروا رہے ہیں وہاں سے تو میرے بھائی کو کسی قسم کا بھی فرق نہیں پڑا ہے۔ اُس کی حالت جوں کی توں
پہلے سے زیادہ خراب ہے۔ اس لیے میں خود علاج کرواؤں گا اُس کا۔ آپ نے کافی مدد کی بڑا احسان کیا ہمارے خاند
پہ کہ عمر کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے رہے۔ مگر ہم عمر کے بھائی زندہ ہیں۔ ہمارے جیتے جی آپ اُسے ڈاکٹر کے پاس
کہ جائیں۔ اُس کے لیے فکر مند ہوں ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ آپ جتنا کر چکے ہیں کافی ہے اور یہ بتا
کہ کیا لیں گے چائے کہ ٹھنڈا۔'' اورنگزیب کا لہجہ و انداز اور الفاظ بہت اہانت آمیز تھے۔ آخر میں اُس نے تحقیر آمیز ان
میں آداب میزبانی نبھائے۔ طاہر لغاری کو بہت بے عزتی کا احساس ہوا۔ اُن کے بدلے رویے تو یہاں آنے جانے
دوران ہی اُنہوں نے محسوس کر لیے تھے پر اتنی توہین کا اُنہوں نے سوچا تک نہ تھا۔

''نہیں کسی چیز کا بھی دل نہیں ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ دریکتا سے اگر ملاقات ہو جاتی تو......'' طاہر لغاری
آج تک یہ لجاجت بھرا رویہ اختیار نہیں کیا تھا۔ ''وہ تو اس وقت اپنی ایک دوست کے گھر گئی ہوئی ہے میری چھوٹی بیٹی سائ
کے ساتھ''۔ اورنگزیب نے دروغ گوئی سے کام لیا۔ طاہر مایوس ہو کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اورنگزیب اُن کے ساتھ چ
چلتے گاڑی تک آئے۔

''ہم عمر کو بہت اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔ ضرورت پڑی تو باہر بھی لے جائیں گے۔ میں فون کر کے آپ
بتاتا رہوں گا عمر کے بارے میں۔ آخر کو آپ اُس کے بہت اچھے دوست ہیں۔ بہت ساتھ دیا ہے اُس کا۔ یہ احسان
نہیں اُتار سکتے۔'' اورنگزیب نے لفظ ''دوست'' پہ اچھا خاصا زور دے کر کہا تو طاہر کو اپنے کانوں کے قریب خطرے کی گھ
کی آواز سنائی دی۔

کیا اورنگزیب کو یہ نہیں پتہ کہ عمر کی بیٹی اُن کے بیٹے اشعر کی منکوحہ ہے وہ یہ رشتہ کیوں بھول رہا ہے۔ طا
صرف عمر کا دوست نہیں اُس کی بیٹی کا سسر بھی ہے اور عمر کا سمدھی بھی ہے۔

''خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' طاہر نے حسب عادت زیادہ ٹینشن نہیں لی۔

اورنگزیب نے اُس کے جانے کے بعد گیٹ بند کیا۔

دریکتا اندر عمر زیب کے پاس بیٹھی تھی۔ اُسے طاہر انکل کے آنے اور پھر جانے کا پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ عمر سو ر
تھے اور وہ اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ گزشتہ ایک ہفتے میں اُن کے رویے میں بہت جارحانہ پن آ گیا تھا۔ چیزیں اُٹھا اُٹھا ک
پھینکتے اپنے بال نوچتے۔ کبھی روتے کبھی ہنستے۔

شریں نے اورنگزیب کو مشورہ دیا تھا کہ انہیں نیند کی گولیاں زیادہ دیا کرو تا کہ عمر بھائی سکون سے رہیں
اورنگزیب نے دریکتا کے ذمہ یہ ڈیوٹی لگائی تھی کہ عمر جب زیادہ شور کرے اُسے یہ گولیاں دے دو۔ اکثر اوقات وہ انہیں
پکڑ کر انجکشن بھی لگا دیتے۔

انجکشن لگتے ہی عمر پرسکون ہو کے سو جاتے۔ باپ کی حالت دیکھ دیکھ کے دریکتا جی ہی جی میں کڑھتی۔ شا
زیب کے بعد اُس کے لبوں سے مسکراہٹ جدا ہو گئی تھی۔ اس گھر سے خوشی روٹھ گئی تھی۔ وہ بہت کم بولتی تھی سائرہ کی اپن
دلچسپیاں تھیں۔ مائرہ شریں کے ساتھ لگی رہتی۔ باقی اس گھر میں اور ایسا کوئی نہیں تھا وہ جس کے ساتھ کلام کرتی۔ عمر
اُسے پہچانتا اور کبھی اُسے دیکھتے ہی مارنے کے لیے دوڑتا۔ اُس کا رویہ خطرناک تھا۔ پر ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا۔ عام روٹین
میں وہ خاموش بیٹھا خلاؤں میں گھورتا یا بڑبڑائے جاتا۔ دریکتا رات کی تنہائی میں روتی۔ جانے پپا کی حالت میں کب
بہتری آنی تھی۔ طاہر انکل آتے تھے تو اُسے مضبوطی کا احساس ہوتا پر کچھ دنوں سے انہوں نے چکر نہیں لگایا تھا۔ دریکتا نے
اُن کا نمبر لینے کی ضرورت ہی نہیں تصور کی۔ عمر زیب کے سیل فون میں اُن کا نمبر موجود تھا۔ پر نہ جانے اُس کا سیل فون
کہاں تھا۔ اُس کے لاکھ ڈھونڈنے کے باوجود نہیں ملا تھا۔ ورنہ وہ اُن سے رابطہ کرتی۔ اُس کا کتنا دل کرتا کہ اپنے رکے
ہوئے آنسو کسی مہربان کندھے پہ سر رکھ کے بہا دے۔ پر وہ مہربان کندھا مونس و غم خوار وجود خود سے بھی بیگانہ ہو چکا تھا۔
فرح اور فوزیہ چچی جو پہلے اُس کے واری صدقے جاتی اب دُور دُور ہی رہتیں۔ ویسے بھی وہ یہاں سے گاؤں چلی گئی تھیں۔
صرف نوید اور ہارون چچا ہی اِدھر تھے۔ صبح پپا کے آفس اور فیکٹری جاتے اور پھر شام بہت لیٹ واپس آتے۔ دریکتا اُن کی
ممنون تھی کہ وہ اپنی جان مار کر اُن کے کاروبار پہ توجہ دے رہے تھے۔ پپا تو اس قابل تھے ہی نہیں کہ اب کاروبار دیکھتے۔
رہی وہ تو اُسے ان باتوں اور کاموں کا کوئی تجربہ ہی نہیں تھا۔ وہ اُلٹا اُن کی احسان مند تھی۔

شاہ زیب کو یہ دنیا چھوڑے تین ماہ سے زائد ہو چکے تھے۔ گھر کے معاملات اور دیگر اس طرح کی چیزیں چچا اور
تایا لوگ ہی چلا رہے تھے۔ وہ ان فکروں سے بے نیاز تھی۔

☆☆☆

شریں لان میں بیٹھی تھی۔ طاہر لغاری کو جاتے ہوئے اُس نے بھی دیکھا۔ اورنگزیب اُسے چھوڑ کر شریں کی
طرف ہی آ رہے تھے۔ اُس کے قریب آ کے دھم سے کرسی پہ بیٹھ گئے۔ ''یہ کیوں آیا تھا آج''۔ شریں نے تیوریاں چڑھا
لیں ''کہہ رہا تھا عمر کو ڈاکٹر کے پاس چیک اَپ کے لیے لے کے جانا ہے''۔ ''پھر آپ نے کیا کہا؟''۔ ''وہی جو مجھے کہنا
چاہیے تھا''۔ اورنگزیب سکون سے بولے۔ ''پھر بھی میں بھی تو سنوں''۔ شریں نے اصرار کیا۔ ''میں نے کہا کہ ہم اُس کے
بھائی ہیں اُس کی فکر کرنے اور ڈاکٹر کے پاس لے کر جانے کے لیے۔ بس ٹھیک کر دیا ہے طاہر لغاری کو میں نے۔ عقل
ہوئی تو آئندہ اس طرح نہیں آئے گا''۔ ''کیوں نہیں آئے گا آپ بھول رہے ہیں کہ وہ دریکتا کا سسر بھی ہے''۔ شریں نے
حقیقت یاد کرائی تو اورنگزیب مسکرانے لگے۔ ''ہاں یہ تو ٹھیک کہا تم نے لیکن خیر اُسے بھی دیکھا جائے گا۔ فی الحال میں کچھ
اور سوچ رہا ہوں''۔ ''کیا؟'' شریں اورنگزیب کے راز دارانہ انداز سے چونک گئی۔ اورنگزیب نے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا
جیسے کسی اور کے یہاں موجود نہ ہونے کا اطمینان کرنا چاہ رہا ہو۔ پھر شریں کی طرف کرسی کھسکائی۔ ''تمہیں پتہ تو ہے ہی شاہ
زیب کے کاروبار کے خسارے میں جانے کا۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے دریکتا کے پاس شاہ زیب سے زیادہ
حصہ ہے اگر وہ اُس میں سے کچھ دے دے تو ہم آنے والے نقصان کو ٹال سکتے ہیں۔ اس طرح وہ سارا کاروبار ہم پھر سے
شروع کریں گے۔ اب تو مجھے تجربہ بھی ہو گیا ہے۔ کیوں نہ اپنا کاروبار کریں اور مالک بن جائیں''۔

شریں اورنگزیب کی بات سن کر سوچ میں ڈوب گی۔ ''پر یہ سب ہوگا کیسے''؟ اُس نے کام کا سوال کیا ''یہ بھی
ہو جائے گا تم دیکھو تو سہی میں کیا کرتا ہوں۔ بس تم کوشش کرو کہ اس کی بھنک بھی کسی اور کے کانوں میں نہ پڑے۔ ورنہ بنا
بنایا کام بگڑ جائے گا''۔ اورنگزیب آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ شریں پوری توجہ سے سن رہی تھی۔ ''مجھے عمر بھائی کا یہ
دوست طاہر لغاری بہت خطرناک اور تیز انسان لگتا ہے۔ مجھے اس کا یہاں آنا بھی پسند نہیں ہے۔ کچھ کریں کہ اُس سے
جان چھوٹ جائے''۔ شریں بہت خائف تھی۔ خائف تو اورنگزیب بھی تھا پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ اُسے اگر کسی سے
خطرہ تھا تو وہ طاہر لغاری ہی تھا۔ اس گھر میں طاہر کا بے دھڑک، بلا روک ٹوک آنا جانا اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ عمر

زیب ہوش و خرد سے بیگانہ تھا۔ اپنے حواس سے کام لینے پہ قادر نہیں تھا۔ طاہر پھر بھی آتا جاتا اُس کی کیئر کرتا۔ وہ حقیقی معنوں میں سچا اور مخلص دوست تھا۔ بھلا اُن تین سگے بھائیوں کے ہوتے ہوئے طاہر لغاری کی کیا ضرورت تھی۔ وہ خود اپنے بھائی کا خیال رکھ سکتے تھے۔

☆☆☆

شریں دو دن کے لیے گاؤں آئی ہوئی تھی۔ اُسے دائی شریفاں سے کام تھا۔ دائی شریفاں ابھی تک اسی کام سے وابستہ تھی اور اُس کی صحت بھی اتنی عمر ہو جانے کے بعد شاندار تھی۔ وہ اب خود بہو اور پوتے پوتیوں والی تھی۔ بہت خوشحال اور اپنے گھر کی مالک تھی۔ شریں نے اُسے پیغام دے کر حویلی بلوایا تو وہ حیران رہ گئی کہ اتنے عرصے بعد اُسے کیوں یاد کیا جا رہا ہے۔ خیر اُسے کام سے غرض تھی آم کھانے سے مطلب تھا اُس کی اتنی خوشحالی کا راز بھی یہی تھا۔ وہ [illegible] پشتم بھاگی آئی۔ حویلی والے معمولی خدمت کے عوض اُسے منہ مانگا پیسہ دیتے رہے تھے۔

''آؤ دائی شریفاں کیسی ہوں۔'' شریں اُس کے استقبال کے لیے خود کھڑی ہوگی۔ شریفاں خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ ''بس آپ کی دعائیں ہیں بی بی جی''۔ وہ خوشامدی لہجے میں از حد انکساری بھر کے بولی۔ ''بی بی جی کوئی کام ہے کیا۔ سنا ہے زیادہ تر آپ شہر میں رہتی ہیں''۔ ''ہاں شریفاں کام ہے تب ہی تو شہر کی بڑی بڑی ڈاکٹرنیوں کو چھوڑ کر تیرے پاس آئی ہوں۔ تیرے ہنر پہ مجھے بہت اعتبار ہے''۔ اپنی اتنی اہمیت پہ شریفاں خوشی سے پھول گی''۔ پھر ذرا ٹھہر کے اس نے اپنا منہ اس کے کان کے قریب لے آئی اور آہستہ آہستہ بولنے لگی۔ شریفاں برابر سر ہلا رہی تھی۔

''بی بی جی آپ فکر مت کریں کام پکا اور سولہ آنے ٹھیک ہوگا۔ میں ابھی گھر جاتی ہوں اور دوائی بنا کے لاتی ہوں۔'' شریفاں نے اُس کی ساری فکر دور کر دی تھی۔ وہ فوراً اُلٹے پاؤں گھر چلی گی۔ شریں بے تابی سے اُس کے انتظار میں تھی۔

وکیل عدنان ہاشمی نے وصیت سنا کے اُن سب کی مت ہی مار دی تھی ورنہ مائرہ والے مسئلے سے وہ بہت پہلے فارغ ہو جاتی۔ خیر دائی شریفاں نے اُسے پورا یقین دلایا تھا کہ کام ہو جائے گا۔ شریں نے اپنی طرف سے عقل مندی کی تھی کہ اُسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ یہ دوائی کس کے لیے لے کے جا رہی ہے۔ دائی شریفاں نے خود بھی اس طرح کا کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی تھی اور مالک لوگوں کا مزاج جانتی تھی۔

شریں اور مائرہ نے بڑی خوبصورتی سے ابھی تک شاہ زیب کی نشانی کو چھپایا ہوا تھا۔ شریں کو لگتا تھا جیسے اُس نے دیر کر دی ہے۔ وہ اور بکھیڑوں میں مصروف تھی۔ اس طرف سے وقتی طور پہ اُس کا دھیان ہٹ گیا تھا۔ اب وہ بھاگ دوڑ کر رہی تھی۔ مائرہ کی ابھی عمر ہی کیا تھی۔ چھوٹی سی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اگر شاہ زیب کا بچہ دنیا میں آ جاتا تو یہ مائرہ کے مستقبل پہ اثر انداز ہوتا۔ بے شک وہ خوبصورت تھی کم عمر تھی۔ شہری رنگ ڈھنگ جانتی تھی لیکن بچے کی ماں بن جاتی تو اُس کی اہمیت کم ہو جاتی۔ شریں دنیا اور معاشرے کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی جس طرح شرفاء میں طوائف کو قبول نہیں کیا جاتا تھا اُسی طرح ایک بیوہ اور بچے کی ماں کے ساتھ بھی داغ لگے چاند کا سلوک کیا جاتا۔ اور مائرہ بہت کم عمری میں یہ داغ اپنے وجود پہ سجا بیٹھی تھی۔ چاند پہ داغ ہے اُسے دیکھا تو جا سکتا ہے پر آنگن میں نہیں اُتارا جا سکتا۔ مائرہ بھی ایسا ہی چاند تھی۔ اور شریں اُس کے مقدر سے خوف کھا گئی تھی۔ اُس کی مائرہ کے بارے میں اپنی پلاننگ تھی اور قدرت کی اپنی پلاننگ تھی۔ [illegible]

اس عذاب سے چھٹکارا دلانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

فوزیہ اور فرح دونوں باتیں کر رہی تھیں۔ شریں حویلی آئی ہوئی تھی ورنہ اُس نے تو شہر میں ہی ڈیرے ڈالے ہوئے تھے بمعہ شوہر اور بیٹی کے۔ عاشر بھی ساتھ تھا۔ شریں نے اپنی طرف سے راز داری برتی تھی کہ شریفاں کی آمد کا پتہ نہ چلے۔ پر فرح کو خبر ہو گئی تھی۔ اُس نے فوزیہ کے آگے پیٹ ہلکا کیا۔ ''شریں نے شریفاں دائی کو بلوایا ہے''۔ ''ارے کوئی کام ہوگا تو بلوایا ہے ناں''۔ فوزیہ نے شروع میں اہمیت نہیں دی۔ ''اب شریں کو کون سا کام ہوگا۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ مائرہ کے ساتھ کوئی گڑ بڑ ہے''۔ فرح کی چھٹی حس تیز تھی۔ ''اگر ایسی بات ہوتی تو شریں خود بتاتی''۔ فوزیہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ''لیکن مجھے لگتا ہے ایسی ہی بات ہے۔ شریں بھابھی جوڑ توڑ کی ماہر ہے کیا پتہ اندر کون سی کھچڑی پک رہی ہے۔ ہمیں تو دودھ سے مکھی کی طرح نکال کے پھینک دیا ہے''۔ فرح کا ملال کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ''ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ دریکتا اتنی جائیداد کی حصہ دار ہے۔ شریں بھابھی کی تو رال ٹپک پڑی ہوگی''۔ فوزیہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ خیر اُن دونوں کے لیے ایک پہلو اطمینان بخش تھا کہ نوید اور ہارون بھی عمر بھائی کے کاروبار کی دیکھ بھال کر کے اپنا اپنا حق وصول کر رہے تھے۔ یہاں اُنہوں نے اورنگزیب بھائی کی چالاکی چلنے نہیں دی تھی۔ اُنہیں بھی احساس ہو گیا تھا کہ وہ سب کچھ اکیلا ہڑپ اور ہضم نہیں کر سکتے۔ ہارون اور نوید بھی تو عمر کے بھائی تھے۔ وہ بھی تو اُس کی دولت میں حصہ دار تھے۔ بقول نوید اور ہارون کے کہ ہم محنت کر کے جائز کمائی کھا رہے ہیں ہمارا بھی حق بنتا ہے۔ دریکتا کو پتہ ہی نہیں تھا کہ پاپا کے کاروبار سے کتنی آمدنی ہو رہی ہے۔ اُسے کبھی معلوم کرنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ زمانے سے اُس کی چالاکیوں سے ناآشنا تھی سب کو اپنی طرح صاف نیت تصور کرتی تھی۔ اور یہ اُس کی بیوقوفی تھی۔

☆☆☆

شریں گاؤں سے لوٹ آئی تھی۔ پہلی فرصت میں اُس نے دائی شریفاں کی دی گئی دوائی اپنی نگرانی میں مائرہ کو کھلائی۔ شریفاں نے کہا تھا بہت جلدی کام ہو جائے گا۔ مگر مقررہ وقت گزر جانے کے باوجود اُسے خوشخبری نہیں ملی تو وہ کچھ اور سوچنے پہ مجبور ہو گئی۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا اور اُس کا مقصد ابھی تک پورا نہیں ہوا تھا۔ مائرہ کو کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جانا ناگزیر تھا۔

گھر سے کسی کو بتائے بغیر وہ مائرہ کو لے کر نکل آئی۔ مائرہ عدت میں تھی شریں اُس کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے مضبوط جواز کے ساتھ نکلی تھی۔

اُنہوں نے ایک ڈاکٹر کا پتہ چلا لیا تھا جو اس طرح کے کام بھاری معاوضے پہ کر دیتی تھی۔ پیسہ اُن کے پاس موجود تھا سو پریشانی والی بات نہیں تھی۔ لیڈی ڈاکٹر عائشہ انور نے اپنا کلینک اور چھوٹا سا ہاسپٹل ایک عام سے علاقے میں کھولا تھا۔ شریں نے پوچھ پوچھ کے ڈھونڈ ہی لیا۔ ڈاکٹر عائشہ کے پاس صرف دو عورتیں بیٹھی تھیں اُن کے بعد مائرہ کی باری آئی اور نرس اُسے اندر لے گی۔ کچھ دیر بعد شریں کو بھی اندر بلوایا گیا۔ ''بیٹھیں''۔ ڈاکٹر نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ شریں سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''خاتون بات دراصل یہ ہے کہ اگر آپ اس وقت ابارشن کروانا چاہتی ہیں تو یہ اس بچی کے لیے بہت خطرناک ہوگا''۔ اُس کا اشارہ مائرہ کی طرف تھا۔ ''اگر آپ میرے پاس کچھ دن پہلے آ جاتیں تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ مگر اب نہیں آپ کی بیٹی کی جان بھی جا سکتی ہے میں نے پیسے لینے ہوتے

ہیں۔ مگر وقت گزر گیا ہے۔ بجائے لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں باقی آپ کی جو مرضی۔ میں نے مشورہ دینا تھا دے دیا۔ ویسے اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھ سکتی ہوں''۔ ڈاکٹر عائشہ کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ شریں نے اثبات میں سر ہلا کے پوچھنے کی اجازت دی۔ ''آپ کی بیٹی کم عمر ہے اور یہ اس کا پہلا بچہ ہے۔ لوگ تو اس موقعے پہ بہت خوش ہوتے ہیں آپ کیوں ابارشن کروانا چاہ رہی ہیں''۔ شریں کچھ دیر کے لیے خاموش سی ہوگی۔ ''اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے۔ اور شوہر کے مرنے کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ یہ اُمید سے ہے۔ آپ نے ابھی خود کہا ہے کہ میری بیٹی کم عمر ہے اتنی کم عمری میں اس نے یہ صدمہ بھی جھیل لیا ہے۔

ٹھیک ہے جو ہونا تھا ہوگیا اب اس کے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ میں چاہتی ہوں کسی اچھے گھرانے میں اس کی شادی کر دوں۔ بچے کے ساتھ کون قبول کرے گا اسے۔ کون اس ہونے والے بچے کو باپ کا پیار دے گا اس کی پرورش، تعلیم اور کھانے کی ذمہ داری کون قبول کرے گا۔ اس نصیبوں جلی کو تو کوئی نہ کوئی بر مل جائے گا اس بچے کا کیا ہوگا؟''

شریں کا لہجہ بہت تلخ تھا۔ ڈاکٹر عائشہ خاموش ہوگی کچھ دیر۔ ''خیر آپ اچھی امید رکھیں اپنے رب سے۔ جو اسے اس دُنیا میں لائے گا وہی اس کا پالن ہار بھی ہوگا''۔ ڈاکٹر عائشہ مائرہ کے لیے اپنے دل میں عجیب سی ہمدردی محسوس کر رہی تھی۔ حالانکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اُسے اپنے کام سے غرض ہوتی تھی۔ جو عورتیں اس کے پاس آتیں وہ سب کا کام کر دیتی! آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اُس کے اندر سے ہمدردی اور خدا ترسی کی آواز اُبھری تھی۔ شریں کی زبانی مائرہ کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا سن کر اُسے اور بھی دُکھ ہو رہا تھا۔ ''آپ ان کا خیال رکھیں فروٹ، جوس، گوشت اچھی غذائیں اور مائرہ آپ خوش رہنے کی کوشش کریں میری دعا ہے کہ یہ بچہ آپ کے لیے خوش قسمت ثابت ہو''۔ وہ دونوں سے بیک وقت مخاطب تھی۔ شریں منہ لٹکائے مائرہ کے ساتھ ڈاکٹر عائشہ کے کلینک سے باہر آئی۔

اب گھر جا کے اُسے یہ خوشخبری بھی سنانی تھی کہ مائرہ اُمید سے ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس بات کو مزید چھپا کے مائرہ کی ذات پہ بدنامی کا کوئی دھبہ لگوائے۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ شاہ زیب کی نشانی کو دنیا میں آنا ہی تھا۔ حالانکہ اُس نے کتنی بار کوشش کی کہ ایسا نہ ہو۔ شریں کو غصہ آرہا تھا۔ بظاہر اُوپر سے پُرسکون اور خوش تھی۔ گھر پہنچتے ہی پہلا ٹکراؤ دریکتا سے ہوا۔ شریں نے سب سے پہلے اُسے بتایا۔ اُس کے چہرے پہ پہلے ایسے تاثرات ابھرے جیسے اُسے یقین ہی نہ آرہا ہو۔ تو پھر پورے چہرے نے خوشی کا احاطہ کیا۔ بے اختیار وہ مائرہ سے لپٹ گی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے مگر یہ خوشی کے تھے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ پپا کو بھی خوش خبری سنائے پر اُن کو سنانا نہ سنانا برابر تھا وہ اپنے حواس میں ہوتے تو کتنا خوش ہوتے کہ شاہ زیب کی نشانی اس دنیا میں آنے والی ہے۔ تھوڑی دیر تک مائرہ کے اُمید سے ہونے کی خبر گاؤں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ شریں نے فون کر کے فوزیہ اور فرح کو بھی بتا دیا۔

☆☆☆

باسط کچھ دنوں کے لیے پاکستان آیا ہوا تھا۔ اُسے دوبئی میں ہی مائرہ کے شوہر کے ساتھ ہونے والے حادثے اور پھر مائرہ کی بیوگی کا پتہ چل چکا تھا۔ بینا نے روتے ہوئے اُسے فون پہ یہ خبر سنائی تھی۔ باسط کو اس بات سے کوئی دکھ نہیں ہوا۔ وہ بے حسی سے سنتا رہا تھا۔ اُس نے مائرہ یا شریں خالہ سے فون پہ تعزیت بھی نہیں کی۔ اُس کا دل چاہ نہیں رہا تھا کہ اُن سے دکھ بھرے جملے بولے یا افسوس کا اظہار کرے۔

ان تین چار ماہ کے دوران وہ بہت مصروف رہا تھا۔ اب اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ گھر جائے اور سکون سے وقت گزارے۔ اس بار وہ اپنے ساتھ کوئی سامان نہیں لایا تھا۔ جس طرح پہلے لاتا اور لے جاتا تھا۔ اس لیے ہر فکر سے آزاد تھا۔

بینا اور حمزہ احمد بیٹے کو اپنے درمیان پا کے بہت خوش تھے۔ اُس نے پہلے تو سب کو جی بھر کے شاپنگ کروائی پھر ایک اور نئی گاڑی خریدی۔ وہ بڑی ترنگ میں تھا۔ آج سارا دن نئی گاڑی دوڑائی تھی۔ پھر ایک فائیو سٹار ہوٹل میں لنچ کیا۔ گھر لوٹا تو جوتوں سمیت بیڈ پہ لیٹ گیا۔ بینا لپک کے اُس کے پاس آئی۔ ''آج کہاں رہے سارا دن''۔ وہ بیڈ پہ بیٹھ گئی اور اُس کے ماتھے پہ آئے بال پیچھے ہٹائے۔ ''بس آوارہ گردی کرتا رہا ہوں۔ پھر واپس چلے جانا ہے۔ وہاں تو مجھے ان عیاشیوں کا ٹائم نہیں ملتا بس کام، کام اور صرف کام''۔

''اوہو تمہارے جانے کے نام پہ یاد آیا کہ تم اپنی شریں خالہ کی طرف سے تو ہو آؤ۔ اتنا بڑا صدمہ گزرا ہے اُن پہ۔ غم کا پہاڑ ٹوٹا ہے مائرہ پہ۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے میرا۔'' سچ مچ بینا بہت پریشان لگ رہی تھی۔ عمر زیب کی طرف سے برسوں پرانی خلش اور ٹھکرائے جانے کی اذیت آج بھی اُس کے دل میں موجود تھی پر عمر کے جوان بیٹے کی موت نے اُسے بھی غمزدہ کر دیا تھا۔ وہ بھی باسط اور ایاز کی ماں تھی۔ اُس نے عمر کا غم اپنے دل میں محسوس کیا تھا گہرائی تک اب تو وہ نیم پاگل ہو چکا تھا۔ بینا کو اُس پہ ترس آتا تھا۔ کسی کمزور لمحے میں برسوں پہلے اُس کے دل نے عمر زیب کی تباہی و بربادی کی خواہش کی تھی۔ اب اپنی اُس خواہش پہ اُسے ندامت تھی۔ وہ باسط اور اپنی اولاد کی طرف سے مطمئن تھی بے چارے عمر زیب نے کیا پایا تھا۔ پہلے من چاہی بیوی نے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کا تحفہ چھوڑ کر خود اس دنیا سے ابدی دنیا کا سفر کیا۔ دوسری شادی کی تو وہ بیوی بھی زیادہ عرصہ اُس کا ساتھ نہ دے سکی۔ اب جوان بیٹے کی حسرت ناک موت نے اُسے نیم پاگل بنا دیا تھا۔ کیا ملا تھا عمر کو بھلا...... بینا جتنا جتنا غور کرتی اُسے عمر زیب پہ اُتنا ہی ترس آتا۔

عمر زیب کے مقابلے میں اُس کا شوہر نہ تو اتنا خوبصورت تھا اور نہ بے پناہ دولت کا مالک تھا شروع میں بینا بہت روتی تھی۔ آہستہ آہستہ حالات میں تبدیلی آئی۔ باسط کو جاب ملی اب اُن کے پاس بہت خوبصورت گھر، گاڑی، نوکر سب کچھ ہی تھا۔ اُس کی اولاد اُس کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔ اُس نے کوئی ایسا صدمہ نہیں اُٹھایا تھا جس طرح کے عمر زیب اُٹھا چکا تھا۔ اُس کے مقابلے میں وہ خوش قسمت تھی۔ اب تو وہ ملال بھی ختم ہو گے تھے جنہوں نے برسوں پہلے دل میں گھر کیا تھا۔ ''امی آپ بھی میرے ساتھ چلیں''۔ ''نہیں بیٹا میں ہو آئی ہوں۔ تم جاؤ۔ شریں خالہ مائرہ کے ساتھ شہر میں ہی ہے۔ تم جاؤ۔ ہم مرنے والے کو واپس تو نہیں لا سکتے پر اُن کا دکھ تو بانٹ سکتے ہیں ناں''۔ بینا نے دانستہ دامن بچایا۔ وہ عمر زیب کو اس حال میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ''ٹھیک ہے امی میں کل چلا جاؤں گا''۔ وہ آرام سے مان گیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ بینا اُسے آرام کرتا چھوڑ کر اُس کے پاس سے اُٹھ آئی۔ باسط نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا مائرہ اور شریں خالہ کے بارے میں۔ ''ٹھیک ہے مائرہ بیگم میں کل آرہا ہوں تم سے تعزیت کرنے۔ ذرا دیکھوں تو سہی اتنا بڑا صدمہ اُٹھا کے تم کیسی ہوگی ہو؟''

''تمہارا حال کیسا ہے اب۔ کل دیکھوں گا۔'' باسط کے لبوں پہ زہر میں ڈوبی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

سائرہ گیٹ کے پاس ٹہل رہی تھی۔ موسم بہت خوبصورت ہو رہا تھا۔ ایک دم سے آسمان پہ بادل اُمنڈ آئے تھے۔ گیٹ کے باہر کوئی گاڑی رُکی تھی۔ اُس نے اُچک کے سامنے دیکھنے کی کوشش کی کہ باہر کون ہے۔ باتوں کی آواز آ رہی تھی چوکیدار کسی کے ساتھ بول رہا تھا۔

اتنے میں گیٹ کھل گیا اور کالے رنگ کی اکارڈ اندر آ گی۔ سائرہ روش کے پاس ہی تھی۔ گاڑی زن سے اُس کے پاس سے گزری تھی وہ سائیڈ پہ ہوگی۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ اُسے کسی نوجوان کی شکل نظر آئی تھی۔ جب تک وہ گاڑی روک کر دروازہ کھول کے نیچے اُترا سائرہ اُس کے قریب پہنچ گی۔ پولیس یونیفارم میں ملبوس دراز قامت گھنی مونچھوں مضبوط شخصیت اور پُر اعتماد انداز والا یہ نوجوان اُس کے لیے اجنبی تھا۔ وہ پہلی نگاہ میں ہی اُسے سراہے بغیر نہ رہ سکی۔ ''اسلام علیکم میں اشعرلغاری ہوں عمر انکل کا پتہ کرنے آیا ہوں کافی دن سے آنا چار ہا تھا پر مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ ابھی بھی آفس سے سیدھا اِدھر آ رہا ہوں۔ آپ اطلاع دے دیں گھر والوں کو''۔

وہ شائستگی و اعتماد سے بولتا اُسے بہت اچھا لگا۔ پتہ نہیں کون تھا۔ سائرہ نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اتنے اعتماد سے بول رہ تھا۔ یقیناً عمر چچا کے ساتھ اس کا کوئی نہ کوئی تعلق تو ضرور ہوگا۔ اُس نے سوچا اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ اشعر بیٹھ چکا تھا۔ سائرہ اُلٹے پاؤں شریں کو بتانے بھا گی کیونکہ اُس نے سختی سے کہا تھا کہ گھر میں کوئی بھی آئے سب سے پہلے مجھے بتاؤ۔ اُصولی طور پہ اُسے دریکتا کو پہلے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ پر ماں سے ڈرتی تھی اس لیے پہلے اُسی کو بتایا۔ ''امی کوئی اشعرلغاری آئے ہیں عمر چچا کا پوچھنے میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے''۔ ''کسی اور کو تو نہیں بتایا''۔ اُن کا محتاط اشارہ دریکتا کی جانب تھا۔ ''نہیں اور تو کسی کو نہیں بتایا۔ سامنے کوئی تھا ہی نہیں''۔ شریں نے سکون کی سانس لی۔

اشعر اُنہیں اپنے مقابل پا کے احترام سے کھڑا ہو گیا اور حال احوال پوچھا۔ شریں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سائرہ بھی شریں کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں آ گئی تھی۔ اُسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اشعرلغاری کون ہے اور اس کا عمر چچا یا اس گھر سے کیا تعلق ہے۔ وہ دریکتا کے نکاح میں طبیعت کی خرابی کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکی تھی۔ اس لیے اشعرلغاری سے انجان تھی۔ اُسے جستجو لگی ہوئی تھی کہ یہ نوجوان ہے کون۔ جس سے امی بھی مرعوب نظر آ رہی تھیں۔ ''عمر انکل کیسے ہیں کہاں ہیں''۔ اشعر نے پوچھا۔ ''وہ تو سو رہے ہیں ورنہ میں کسی نہ کسی طرح اُنہیں یہاں لے آتی''۔ شریں نے عذر پیش کیا۔ ''کوئی بات نہیں میں خود اُنہیں جا کے دیکھ لیتا ہوں۔ اس طرح مجھے بھی تسلی ہو جائے گی۔ آپ اُن کے کمرے تک مجھے لے چلیں''۔ وہ اُن سے پہلے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ناچار شریں کو بھی اُٹھنا پڑا۔ اُن کی مرضی نہیں تھی کہ اشعر عمر زیب کو دیکھے۔ مگر کچھ سوچ کے خاموش ہوگی۔ وہ اُسے ساتھ لیے عمر زیب کے بیڈ روم میں آئی۔ کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے۔ اُس نے آگے بڑھ کے پردے ہٹا دیئے اور ساتھ لائیٹ بھی جلا دی۔ عمر انکل واقعی سوئے ہوئے تھے۔ اشعر کو اپنا وہاں بیٹھنا بیکار ہی لگا۔ وہ باہر آ گیا۔ شریں کو بھی اُس کی تقلید کرنی پڑی۔ ''انکل کا ٹریٹ منٹ چل رہا ہے''۔ اشعر نے واپس ڈرائنگ روم میں پہنچ کے پھر سے پوچھا ''ہاں بیٹا علاج ہو رہا ہے عمر بھائی کا۔ بہت قابل ڈاکٹر سے اورنگزیب علاج کروا رہے ہیں۔ اگر کوئی فرق نہ پڑا تو ہم باہر لے جائیں گے علاج کی خاطر عمر بھائی کو۔ شاہ زیب کی موت نے بہت بُرا اثر ڈالا ہے ان پہ۔ خیر خدا کی مرضی تھی یہ۔ کسی کا کیا بس چلتا ہے۔ میری جوان معصوم بیٹی بھی تو بیوہ ہوئی ہے پر رو دھو کے خاموش ہو گئی ہوں میں بھی''۔ شریں کی صورت رونی سی ہو گی تھی۔ اشعر کو آئے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ اتنی دیر میں چائے کے ساتھ کافی لوازمات ٹیبل پہ اُس کے سامنے سجا دیئے گے۔ شریں اور سائرہ کے بیحد اصرار پہ اُس نے صرف آدھی پیالی چائے لی۔ واپسی سے پہلے جانے اُس کے دل میں کیا آئی کہ اُس نے شریں سے دریکتا کا پوچھ لیا۔ وہ شاہ زیب کے جنازے پہ اُسے نظر آئی تھی اس کے بعد دوبارا نہیں دیکھا تھا۔ ''آنٹی دریکتا سے ملاقات ہو سکتی ہے''۔ ''وہ سارا دن اپنے کمرے میں گھسی رہتی ہے جانے کیا کرتی ہے۔ نہ ہمارے ساتھ بولتی ہے نہ بیٹھتی ہے۔ میں جا کے بتائی ہوں اُسے''۔ شریں کو اشعر کی فرمائش ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ خیر اُسے مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔ سائرہ اشعر کے پاس اکیلی رہ گی۔ ''آپ کہاں رہتے ہیں''۔ ماں کی غیر موجودگی میں اُس نے پہلا سوال پوچھا۔ اشعر نے بتا دیا۔ سائرہ اور سوال پوچھنے کی تیار کر رہی تھی کہ شریں اکیلی ہی واپس آ گی۔ دریکتا اُس کے ساتھ نہیں تھی۔ ''کہتی ہے میرے سر میں درد ہو رہا ہے ابھی نہیں مل سکتی''۔ شریں نے اشعر کی طرف دیکھے بغیر یہ جملہ کہا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے شدید قسم کی انسلٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دریکتا سے عمر انکل کے بارے میں پوچھنا چار رہا تھا۔ وہ اُن کی بیٹی تھی۔ اپنے باپ اور اُن کے ٹریٹ منٹ کے بارے میں باقی گھر والوں سے زیادہ ہی جانتی ہوگی۔ اسی پوائنٹ پہ اُس کی توجہ تھی۔ پر اُس نے سر درد کا بتا کر ملنے سے مجبوری ظاہر کر دی تھی۔

اشعر کے چہرے پہ چھائی غصے اور توہین کی سرخی شریں سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ اُس کا تیر نشانے پہ لگا تھا۔

☆☆☆

کافی دیر کروٹیں بدلنے کے باوجود اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹکا کے بیٹھ گئی اور جوتوں کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ جوتے پہن کے واش روم میں گئی اور ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پہ مارے۔ اب قدرے سکون کا احساس ہوا دریکتا کو۔ دروازہ ہلکے سے کھول کے باہر قدم نکالا۔ کچھ فاصلے پہ مائرہ بھابھی کا کمرا تھا وہ آرام کر رہی تھی۔ دریکتا پپا کو دیکھنے نیچے آئی۔ ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ ''جانے کون آیا ہے''۔ اُس نے خود کلامی کی۔ وہ ڈرائنگ روم کے سامنے گزر رہی تھی۔ اس کے بعد پپا کا کمرا تھا۔ ''دیکھو تو سہی کون ہے مجھے پتہ ہی نہیں کہ کون آیا ہے''۔ وہ دروازے کے سامنے تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتی۔ اندر کی طرف سے دروازہ کھولا گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اپنی جھونک اور تیزی میں دریکتا سے ٹکرایا۔ یہ ٹکراؤ شدید نہیں تھا پر وہ گرتے گرتے بچی۔ ٹکرانے والے نے اُسے سنبھال لیا تھا۔ یہ اشعرلغاری تھا۔ جس کی بادامی آنکھوں میں اس وقت بے پناہ غصہ ہلکورے لے رہا تھا۔ اُس کے پیچھے شریں اور سائرہ کے چہرے اُبھرے تھے۔ ''بہت خوشی ہوئی ہے آج آپ کے گھر آ کے۔ آپ کے ہاں مہمانوں سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ مجھے پہلے کوئی اندازہ نہیں تھا ورنہ آپ کو بتا کے آتا''۔ پے در پے واروں سے وہ بوکھلا گی۔ اشعر اُسے آگے سے ہٹا کے خود اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ شریں اور سائرہ نے بڑے اخلاق سے رخصت کیا۔ پر دریکتا کی طرف سے اُس کے دل میں بے پناہ غصہ تھا۔ اب تو اُس میں سوال بھی شامل ہو گئے تھے۔

وہ پریشان سی ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ شریں اشعر کے جانے کے بعد اُس کے پاس آئی۔ ''تم سو رہی تھی اس لیے میں نے تمہیں نہیں اُٹھایا۔ عمر بھائی کی وجہ سے پریشان رہتی ہو مجھے پتہ ہے۔ رات کو کافی دیر تک تمہارے کمرے کی لائیٹ جلتی رہتی ہے۔ جانے سوتی بھی ہو کہ نہیں۔ اس لیے میں نے تمہیں نہیں جگایا کہ چلو جتنی دیر سوئی رہو گی۔ پریشانیوں اور سوچوں سے بچی رہو گی۔ ویسے میں اشعر کو عمر بھائی کے کمرے میں لے گی تھی۔ خود دیکھ کر گیا ہے اُنہیں۔ سائرہ اور میں نے اشعر کو کمپنی دی ہے۔ تمہارا ابھی بتا دیا کہ آرام کر رہی ہے''۔ دریکتا نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔ اشعر کی اُس کے ساتھ ابھی تک کوئی بھرپور یا زوردار قسم کی ملاقات نہیں ہوئی تھی جو وہ اُس کے مزاج کے بارے میں جان سکتی یا اندازہ لگا سکتی۔ اُسے پہلے تو اشعر سے ٹکرانے پہ ہی شرمندگی ہو رہی تھی۔ شریں تائی اور سائرہ نے بھی دیکھا تھا۔ پھر اشعر کا طنزیہ اندازہ گفتگو۔ جانے اُس کا ری ایکٹ ایسا کیوں تھا۔ اُس کے وہ طنزیہ جملے۔ سوچتی اور اُلجھتی۔ ''بہت خوشی ہوئی آج آپ کے گھر آ کے۔ آپ کے ہاں مہمانوں سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ مجھے پہلے کوئی اندازہ نہیں تھا ورنہ بتا کے آتا''۔

شریں تائی اور سائرہ نے اتنے اچھے طریقے سے پوچھا۔ خاطر مدارت کی پھر اُسے کیا شکوہ تھا جو وہ اتنے غصے میں گیا تھا۔ دریکتا سوچ سوچ کے اس کا جواب تلاش کرنے میں ناکام ہوگئی تھی۔

سائرہ کو جانے کیوں بہت افسوس ہورہا تھا یہ جاننے کے بعد کہ اشعر لغاری دریکتا کا شوہر ہے۔ اسی لیے تو اتنے غصے سے بات کی تھی اُس کے ساتھ اور تیزی سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے نکلا تھا۔ اُسے دریکتا سے حسد سا محسوس ہوا۔ اتنی شاندار پرسنالٹی تھی اشعر لغاری کی وہ دیکھتے ہی مرعوب ہوگئی تھی۔ اُس کے بیٹھنے، بات چیت کرنے کا انداز سب کچھ کتنا پُر اعتماد تھا۔ سائرہ مائرہ سے سال بھر ہی چھوٹی تھی پر اُس کی طرح اتنی تیز طرار نہیں تھی۔ شریں نے ابھی اُس کو سنوارنے نکھانے میں اتنی دلچسپی ہی نہیں لی تھی۔ ورنہ وہ مائرہ سے دو ہاتھ آگے ہی ہوتی۔ ابھی تو دل کو اس تاسف نے گھیرا ہوا تھا کہ دریکتا کا شوہر کتنا زبردست ہے۔

☆☆☆

باسط کو اپنے سامنے دیکھ کر شریں کو ناقابل بیان قسم کی خوشی ہورہی تھی۔ شاہ زیب کی موت کے بعد اُن کی بینا سے جب بھی بات ہوتی وہ باسط کا خاص طور پہ پوچھتیں۔ بینا نے بھی بہن کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی دلچسپی محسوس کرلی تھی پر توجہ نہیں دی تھی۔ "کب آئے ہو تم۔ نہ تمہارے آنے کا پتہ چلتا ہے نہ جانے کا۔ لگتا ہے خوب کمار ہے ہو۔" شریں نے اُس کی کلائی پہ بندھی قیمتی گھڑی ہاتھ میں پکڑا اسٹائلش سا موبائل فون اور اُس کے پہنے گئے قیمتی سوٹ سے اُس کی آمدنی کا اندازہ لگایا تھا۔ وہ جس چم چم کرتی گاڑی میں اپنے ڈرائیور سمیت آیا تھا وہ خود ہی اپنے قیمتی ہونے کا اعلان کررہی تھی۔ وہ اُس کی خاطر مدارات میں بچھ بچھ گئیں باسط کی گھومتی نظریں اُن کی خوش اخلاقی اور مہمان نوازی سے قطع نظر مائرہ کو ڈھونڈ رہی تھی۔ رہا نہیں گیا تو اُن سے پوچھ ہی بیٹھا۔ "خالہ مائرہ کہاں ہے نظر نہیں آرہی ہے۔" اُس نے کہاں جانا ہے نصیبوں جلی نے۔ اپنے کمرے میں ہے۔" شریں خالہ نے تاسف آمیز ٹھنڈی سانس لی۔ باسط سے کوئی جواب ہی نہیں بن پڑا۔ خاموشی سے جوتے کی ٹو سے دبیز قالین کو کریدنے لگا۔ "میں نے مائرہ سے تعزیت کرنی ہے خالہ۔" خاصی دیر کے بعد وہ بولا تو شریں چونک گئی "ہاں ٹھیک ہے وہ عدت میں ہے...... پر"۔ وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں کہتے کہتے رُک سی گئی۔ "خالہ میرے حساب سے تو اُس کی عدت ختم ہوگی ہے چار ماہ دس دن کی مدت ہے ناں عدت کی"۔ وہ اُن سے تصدیق چاہ رہا تھا۔ "ہاں کہتے تو تم ٹھیک ہو اتنی ہی مدت ہوتی ہے عدت کی پر مائرہ ماں بننے والی ہے ابھی کچھ دن پہلے ہی ہمیں بھی یہ بات پتہ چلی ہے"۔ شریں خالہ نے اُس کے حواسوں پہ بم گرایا تھا۔ اس طرف کا تو اُس نے سوچا ہی نہیں تھا نہ کبھی اس پہلو کی طرف دھیان گیا تھا۔ ایسی بات تھی تو پہلے کیوں نہیں پتہ چلی...... اُسے خود ہی اپنی سوچ پہ ہنسی آ گئی۔ بھلا یہ بات اُسے امی بتاتی کہ مائرہ ماں بننے والی ہے"۔ اُس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کے کہا۔

"تو یہ کون سی خوشی کی بات ہے۔ شاہ زیب خود تو مر گیا میری مائرہ کو دکھوں کے حوالے کرکے پہلے کوئی کمی تھی جو وہ جاتے جاتے اُسے ماں کے رتبے پہ بھی فائز کرگیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ مائرہ کی جان چھوٹ جائے پر میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہوا"۔ شریں خالہ اُسے سب کچھ ایسے بتا رہی تھی جیسے وہ اُن کی سہیلی ہو کوئی راز دار ہو۔ "خالہ ہر بار تو آپ کی خواہش پوری نہیں ہوسکتی ناں۔ کبھی کبھی ناکامی بھی مقدر ٹھہرتی ہے"۔

وہ بہت عجیب انداز میں اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا تو شریں کو بے چینی سی ہونے لگی۔ باسط کے چہرے پہ اپنی عمر کے برعکس بہت پکا پن سا تھا۔ جیسے بہت جہاں دیدہ اور زمانہ شناس ہو۔ یہ پختگی وسنجیدگی وزمانہ شناسی اُس کی باتوں سے بھی چھلکتی تھی۔ "اچھا یہ بتاؤ وہاں کیا کرتے ہو"۔ وہ اپنی بے چینی کو زائل کرنے کے لیے پوچھ رہی تھی۔

"خالہ میں ایک امپورٹ ایکسپورٹ فرم میں کام کرتا ہوں قسمت اچھی تھی جو یہاں نوکری مل گی۔ ورنہ ایک بی ایس سی پاس لڑکے کو کون ملازم رکھتا ہے عمر بھی کم تھی تجربہ بھی نہیں تھا پر ساری بات قسمت کی ہے۔ مختصر عرصے میں گھر بھی لے لیا ہے گاڑی بھی ہے بلکہ میرے ساتھ دو لڑکے اور بھی ہیں وہ کہتے ہیں ہمیں اپنا کاروبار کرنا چاہیے اس میں بہت پرافٹ ہے ہوسکتا ہے میں اپنا کاروبار شروع کرہی دوں ابھی سوچ رہا ہوں۔" باسط مزے سے بتا رہا تھا اور شریں رشک سے دیکھ رہی تھی۔ "واہ میری بہن کی قسمت کتنی اچھی ہے جو تم جیسا بیٹا دیا ہے۔ اللہ ہر کسی کو تم جیسا بیٹا دے"۔ اُن کی دعا پہ باسط کا دل چاہا کہ زور سے ہنسے۔ پر اُس نے یہ بے وقوفی نہیں کی۔ ہولے سے سر ہلا دیا۔

"اچھا خالہ مائرہ یہاں آسکتی ہے یا میں اُس کے پاس جاسکتا ہوں۔" اُس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے دوبارہ اپنا سوال کچھ الفاظ کے اضافے کے ساتھ دہرایا۔ "ہونہہ ہے تو وہ عدت میں۔ پر تم اتنی دور سے آئے ہو میں اُسے کہتی ہوں سر منہ ڈھانپ کے تم سے بات کرلے"۔ شریں خالہ کا انداز احسان کرنے والا تھا۔ باسط نے ایک بار پھر بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا۔ وہ تو آج بڑے لطیفے سنا رہی تھیں۔ ورنہ وہ کہنے لگا تھا کہ خالہ آپ کب سے اتنی مذہبی مزاج کی ہوگئی ہیں۔ اور اگر آپ کو خدا نے یہ توفیق بخش ہی دی ہے تو پھر اپنی بات سے ہٹ کیوں رہی ہیں۔ جس بات کی اجازت اسلام نہیں دیتا آپ کیوں دے رہی ہیں۔ میں مائرہ کے لیے نامحرم ہوں وہ میرے لیے نامحرم ہے۔ جب تک اُس کے ہاں بچے کی ولادت نہیں ہوجاتی تب تک اُس کی عدت ختم نہیں ہوگی اور آپ بظاہر جو مجھ پہ احسان کررہی ہیں۔ دل سے آپ بھی یہی چاہتی ہیں"۔

شریں خالہ نے اُسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ مائرہ اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ امی سمیت باسط کو دیکھ کر اُس نے بڑی تیزی سے پاس پڑا دوپٹہ اُٹھا کر سر اور جسم کے گرد لپیٹا تھا۔ اُس کی یہ کوشش اضطراری تھی۔ "باسط کہہ رہا تھا تم سے تعزیت کرنی ہے اس لیے آیا ہے"۔ ساتھ ساتھ شریں ہی بول رہی تھی۔ باسط بڑے غور سے مائرہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کی نگاہیں برے کی طرح جسم کو چھید رہی تھی اور ایکسرے کی طرح ٹٹول رہی تھی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ موٹی لگ رہی تھی پر چہرا کمزور ہی تھا۔

"میں آتی ہوں کچھ کھانے کے لیے بنانے کا کہہ کر۔" شریں بہانے سے باہر نکل گی تو باسط پوری طرح مائرہ کی طرف گھوم گیا۔ "میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ مجھے بہت افسوس ہوا ہے یا غم سے دل پھٹ گیا ہے پر جو ہوا اچھا بھی نہیں ہوا۔ کم سے کم تمہارے ساتھ بالکل بھی نہیں۔ اتنا امیر اور صاحب جائیداد تھا تمہارا مرحوم شوہر اور تم ایک جوان بیوہ کیا کرو گی کیسے زندگی گزارو گی۔ ابھی سے اکیلی ہوگئی ہو"۔ باسط کے لفظ لفظ میں سفاکی تھی۔ مائرہ نے پہلی بار اتنے عرصے میں اُسے غور سے دیکھا جب سے وہ اُس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ باسط نے داڑھی رکھ لی تھی۔ داڑھی نے اُس کے پورے چہرے کا تاثر ہی بدل کے رکھ دیا تھا۔ بڑا بڑا اور میچور لگ رہا تھا پھر جو چہرے پہ سنجیدگی اور پختگی تھی وہ کسی طور بھی یہ ظاہر نہیں کرتی تھی کہ باسط مائرہ سے کچھ سال ہی بڑا ہے۔ اُس کا وزن بھی پہلے کے مقابلے میں بڑھ گیا تھا۔ رخسار بھرے بھرے ہوگئے تھے اور جبڑا ابھی بھاری لگ رہا تھا۔ داڑھی اُس نے کافی بڑھالی تھی۔ اپنے بیٹھنے کے انداز سے کافی پُر اعتماد نظر آ رہا تھا۔ "پیاری لگ رہی ہو اس حال میں بھی"۔ باسط کا اشارہ اُس کی بدلی ہوئی جسمانی ہیت کی طرف تھا۔ مائرہ جھینپ سی گی۔ "خیر میں پھر آؤں گا جب اس بوجھ سے آزاد ہوجاؤ گی۔ پھر تم سے بہت سی باتیں ہوں گی جو میں کرنہ سکا تھا۔ اور تمہیں

یہ کہوں گا کہ جو ہوا اُسے بھول جاؤ۔ گزشتہ زندگی کو سوچو بھی مت۔ تمہارے حق میں اور آئندہ زندگی میں یہی بہتر ہوگا''۔ پتہ نہیں وہ نصیحت کر رہا تھا دھمکی دے رہا تھا ڈرا رہا تھا یا اپنے پُرخلوص جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔ مائرہ فرق نہیں کر سکی تھی۔

☆☆☆

دریکتا باسط کی موجودگی کی وجہ سے بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔ وہ اُسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ شریں اُسے رُکنے پہ اصرار کر رہی تھی۔ مگر وہ مان نہیں رہا تھا۔ بالآخر اُس نے کہا کہ وہ رات رُکے گا نہیں البتہ رات کا کھانا ضرور اُن کے ساتھ کھائے گا۔ شریں خوش ہوگئی۔ کچن میں ملازموں کی شامت آئی ہوئی تھی۔ جلدی کرو جلدی کرو کی پکار لگی ہوئی تھی۔ شریں نے باسط کو ٹی وی لاؤنج میں ہی بٹھایا ہوا تھا۔ وہیں دریکتا بھی تھی۔ وہ بار بار اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گھنے بالوں والی، موٹی موٹی آنکھوں والی مائرہ کی نند اُسے بڑی قابلِ توجہ لگی تھی۔ وہ دل ہی دل میں کوئی حساب کتاب کر رہا تھا۔ اُس کے علم کے مطابق مائرہ شادی کے بعد الگ گھر میں چلی گئی تھی۔ جب کہ ابھی وہ اپنے سسرال میں تھی۔ اُس کے سسر کی حالت قابلِ رحم تھی وہ بھی یہی سوچ رہا تھا پھر اس جائیداد کا مالک و مختار کون ہے۔ یقیناً مائرہ کی گھنے بالوں والی یہی نند ہوگی۔۔ جس کی موٹی موٹی آنکھوں میں حیرانی ہے جسے باسط کا یوں گھور گھور کے دیکھنا ناگوار گزر رہا ہے۔ پھر گویا اُسے دریکتا پہ ترس سا آگیا۔ اُس نے دیکھنا موقوف کر دیا اور شریں خالہ سے باتیں کرنے لگا۔

☆☆☆

طاہر لغاری صبح صبح لان میں بیٹھے اخبار بینی کا شوق پورا کر رہے تھے۔ اشعر تیار ہو کے اُن کے پاس سے گزر کر گیٹ کی طرف جا رہا تھا تو طاہر لغاری کو جیسے کوئی بات یاد آ گی۔ حالانکہ وہ اُن سے مل کے اللہ حافظ بول کے جا رہا تھا۔ طاہر لغاری نے پیچھے پکارا تو وہ واپس آ گیا۔ ''ارے میں نے تمہیں کہا تھا کہ کسی دن ٹائم نکال کے عمر کی طرف سے ہو آنا۔ تم گئے نہیں ہو''۔ ''پپا میں گیا تھا کل اُن کی طرف۔ بس ذہن سے نکل گیا آپ کو بتانا''۔ ''اوہ اچھا اچھا کیسی طبیعت ہے عمر کی''۔ طبیعت کا تو مجھے پتہ نہیں کیونکہ وہ خود سوئے ہوئے تھے۔ اشعر کو کل کی بات یاد آ گی تھی''۔ دریکتا سے ملاقات ہوئی وہ کیسی تھی۔ ''جی پپا اُن محترمہ سے بھی ملاقات ہوئی تھی گھڑی بھر کے لیے۔ کیونکہ اُن کے سر میں درد تھا۔ میں جب واپسی کے لیے نکل رہا تھا تو اُن کی تشریف آوری ہوئی تھی۔ دیکھنے میں ٹھیک ہی لگ رہی تھیں وہ کیونکہ بظاہر کسی بیماری کے آثار لگ تو نہیں رہے تھے''۔ اشعر تپا ہوا تھا۔ طاہر لغاری اُسے غور سے دیکھنے لگے وہ کس طرح بات کر رہا تھا جیسے کوئی رنجش ہو دل میں۔

فی الحال اشعر کو دیر ہو رہی تھی ورنہ وہ پوچھتے کہ تم دریکتا کے ذکر پہ ایک دم غصے میں کیوں آ گئے ہو۔ آخری بار جب وہ عمر کی طرف گئے تھے تو اُس کے بڑے بھائی اورنگزیب نے کافی عزت افزائی کی تھی سو اُن کا جی نہیں جا رہا تھا خود جانے کو۔ اسی لیے اُنہوں نے اشعر کو کہا تھا کہ اُن کی طرف چکر لگا لیا کرو۔ اشعر ہو تو آیا تھا پر غصے میں تھا۔ اب وہ یہی سوچ رہے تھے کہ آیا اشعر کے ساتھ کوئی بداخلاق اور بدتمیزی تو نہیں کی گئی۔ ورنہ وہ اتنا جلدی غصے میں آنے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

وادی نیلم کا وہی ہوٹل تھا وہی کمرا تھا۔ شاہ زیب نے سفید رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اُس کا چہرا اُداس تھا۔ مائرہ اُسے غصے اور نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ ''مائرہ بتاؤ ناں تم نے ایسا کیوں کیا؟ تم نے مجھ سے لڑائی کی وہ غلط باتیں کیں جن کی وجہ سے مجھے غصہ آ گیا اور اس غصے میں مجھے کوئی سمجھ نہیں آئی اور گاڑی کھائی میں گر گئی۔ گردن کی ہڈی ٹوٹنے سے مجھے بہت اذیت سے گزرنا پڑا۔ اور اب تم اور شریں تائی میرے ہونے والے بچے کو قتل کرنا چاہ رہی ہو بولو کیوں تم ایسا کیوں کر رہی ہو۔ میں تمہیں قتل کر دوں گا اگر تم نے سوچا بھی کچھ ایسا''۔ شاہ زیب اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ کھولے مائرہ کی طرف بڑھنے لگا جیسے اُس کی گردن دبا دینا چاہتا ہو۔ اس دوران مائرہ جو پہلے خوب اُونچا بول رہی تھی لڑ رہی تھی ڈر چکی تھی اور پیچھے ہٹ رہی تھی پر شاہ زیب آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ''مجھے پتہ ہے تم نے مجھ سے ویسی محبت نہیں کی جو میرا حق تھی یا جس طرح میں نے تمہیں ٹوٹ کے چاہا۔ شریں تائی اور تم نے میری دولت سے محبت کی اور اسی خاطر تائی نے تمہیں یہاں شہر ہمارے گھر بھیجا تھا۔ تم اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوگی۔ مجھ سے شادی بھی کر لی۔ تم میرے بچے کی ماں بننا نہیں چاہتی تھی ناں۔ یہ بچہ تمہاری خواہش کے بغیر تمہاری کوکھ میں آیا ہے اور تم اس سے جان چھڑانا چاہتی ہو تا کہ اپنی نئی زندگی میرے بچے کے نام ونشان کو مٹا کے شروع کر سکو۔ میں تمہیں مٹا دوں گا''۔ شاہ زیب کے ہاتھ اُس کی گردن پہ جم گئے۔ مائرہ نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ پر اُس کے منہ سے پھنسی پھنسی روہانسی آوازوں کے سوا کچھ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ اُس کی آنکھ کھل گی۔ ایک چھناکے سے جیسے سارا منظر ٹوٹ گیا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں لیٹی ہوئی تھی۔ زیرو پاور کی لائیٹ بھی آن تھی۔ اُسے اپنے گلے میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہو رہے تھے۔ مائرہ کے دونوں ہاتھ اپنے گلے پہ دھرے ہوئے تھے جیسے وہ شاہ زیب کی گرفت سے رہائی پانا چاہ رہی ہو۔ وہ بُری طرح ڈر گئی تھی۔ حیران بھی تھی اُس کے چلانے کی آواز سن کے کوئی جاگا کیوں نہیں۔ پھر خود ہی اُسے ہنسی آ گئی جب اُس کی آنکھ کھلی تھی تو اُس کے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکل رہی تھی۔ کوئی کیسے جاگتا۔

یہ عجیب سا خواب دیکھنے کے بعد دوبارہ کوشش کے باوجود اُسے نیند نہیں آئی۔ ساتھ طبیعت بھی عجیب سی ہو رہی تھی۔ پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ پیٹ پہ ہی رکھے ہوئے تھے۔ جیسے درد کو اندر ہی اندر دبانا چاہ رہی ہو۔ تکلیف کے باوجود وہ شریں کو کچھ بتاتی نہیں تھی اور نہ ڈاکٹر کے پاس جاتی۔ صرف ایک دفعہ کے علاوہ وہ دوبارہ چیک اَپ کروانے بھی نہیں گی۔ جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ نہ اُسے اپنے کھانے پینے کا کوئی ہوش تھا۔ اکیلے میں کتنی بار اُس نے اپنے پیٹ پہ زور زور سے مکے مارے تو خود کو اذیت سے دو چار کیا اُلٹی سیدھی گولیاں کھائیں کہ شاید اُس کے پیٹ میں سانس لیتی زندگی دم توڑ جائے۔ پر شاہ زیب کے ہونے والے بچے نے تو پیٹ میں حرکت بھی شروع کر دی تھی اب وہ اُسے اپنے وجود کا احساس دلا رہا تھا۔ اُس پہ ہنس رہا تھا قہقہے لگا رہا تھا کہ کیسے مجھ سے پیچھا چھڑاؤ گی۔ میں نے آ کے رہنا ہے تمہاری گود میں۔ اپنی ہر کوشش میں ناکام ہونے کے بعد وہ روتی۔

باسط جب سے اُن کے گھر سے ہو کے گیا تھا۔ زیاں کا احساس کچھ اور بھی حد سے سوا ہو رہا تھا۔ امی نے بہت کچھ بتایا تھا اُس کی جاب اور دیگر چیزوں کا۔ اُس نے امی کی آنکھوں میں نئی امید کے دیئے جلتے دیکھے تھے۔ مائرہ نے غور کیا تو ایسے ہی امید کے ہزاروں دیئے اُسے اپنے اندر بھی روشن ہوتے محسوس ہوئے۔ باسط کیا آیا تھا اُسے نئی زندگی کا ایک پیام ملا تھا۔ وہ امید دلا کے گیا تھا۔ اپنے آنے کا کہا تھا جیسے دبے دبے لفظوں میں اپنے انتظار کا بول گیا ہو۔ تھوڑی دیر ہی اُس کے پاس بیٹھا تھا پر وہ اُسی طلسم میں قید تھی۔ اب اس ہونے والے بچے سے اُسے کوئی خاص دلچسپی یا لگاؤ نہیں تھا۔ لگاؤ تو پہلے بھی نہیں تھا۔ بحالت مجبوری نو ماہ یہ بوجھ برداشت کرنا ہی تھا۔ اس بوجھ سے آزاد ہونے کے بعد ہی باسط نے آنا تھا۔ تب تک اُسے انتظار کرنا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی پر نہیں نیند دور کھڑی ہاتھ مل رہی تھی۔ پھر ابھی کچھ دیر پہلے دیکھا گیا خواب بھی پریشان کن تھا۔ شاہ زیب مرنے کے بعد بھی اُس کی زندگی میں موجود تھا۔ چاہے

خواب کے راستے ہی یہی اور اپنی نشانی کے ساتھ۔ اُس پہ ہنستا قہقہے لگاتا۔

☆☆☆

شریں اورنگزیب کو غصے سے دیکھ رہی تھی اور وہ بھیگی بلی بنا صفائیاں دے رہا تھا۔ اُسے بہت جلدی تھی سب کچھ ایک دم سے حاصل کرنے کی۔ پر اورنگزیب سکون اور آرام سے سب کام کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر شریں کا رویہ اور غصہ اُسے کوفت سے دوچار کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ شاہ زیب کے گرتے بزنس کو سہارا دینے کے لیے دریکتا سے کہو۔ وہ تو اس کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ کہتی تھی۔ پر اورنگزیب نے اُسے ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ شاہ زیب کے جس گرتے بزنس کو سہارا دینے کی بات شریں کر رہی ہے وہ تو کب کا زمین بوس ہو چکا ہے اور اب اُس کا ملبہ ہی بچا ہے۔ شریں عورت تھی اورنگزیب کے خیال میں ناقص العقل۔ وہ اس قابل نہیں تھی کہ اُسے کسی راز میں شریک کیا جاتا۔

''جو بھی آتا ہے یہی پوچھتا ہے کہ ہم عمر کا علاج کروا رہے ہیں کہ نہیں کہاں سے کروا رہے ہیں کس ڈاکٹر سے کروا رہے ہیں۔ اگر کروا رہے ہیں تو علاج سے فائدہ ہو رہا ہے کہ نہیں۔ کبھی طاہر لغاری چلا آ رہا ہے اور کبھی اُس کا بیٹا۔ کہ جی عمر انکل کا پتہ کرنے آیا ہوں۔ ہم کب تک سب کو جواب اور صفائیاں دیتے رہیں گے۔ کسی کو کیا تکلیف ہے عمر سے آپ کا ہم سے خونی رشتہ ہے۔ اوروں کو کس بات کی فکر ہے ہم جو بھی کریں۔'' شریں ہاتھ نچا نچا بول رہی تھی۔ اورنگزیب نے ذرا بھی بُرا نہیں منایا مسکرانے لگا۔ شریں اس عالم میں اورنگزیب کی مسکراہٹ سے اُلجھ گئی۔ ''آپ کیوں ہنس رہے ہیں۔ میں پریشان ہوں اور آپ میری حالت سے لطف لے رہے ہیں''۔

''میں تمہاری حالت سے لطف نہیں لے رہا ہوں آئندہ کا سوچ کے خوش ہو رہا ہوں کہ عمر علاج کے لیے باہر چلا جائے گا اور دریکتا اُس کے ساتھ ہوگی۔ ظاہر ہے عمر کے ساتھ کسی کو تو ہونا چاہیے تو بیٹی سے زیادہ کون اُس کا خیال رکھ سکتا ہے۔'' شریں بھی مسکرانے لگی۔ ''مائرہ کا ہونے والا بچہ بھی تو اپنے دادا کی جائیداد کا وارث ہے۔ اگر دریکتا اپنی خوشی سے بھائی کے خون کو خوشی خوشی اپنے کاروبار اس گھر یا دیگر جائیداد کا وارث نامزد کر دے تو یہ کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں ہوگی ناں'' ''بالکل بھی نہیں۔ ایسا صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ کہ بہنیں خوشی خوشی بھائیوں کے لیے اپنے حق سے دستبردار ہوتی آئی ہیں۔ عورتیں مردوں کی خوشی پہ اپنی خوشی اپنا حق سب کچھ قربان کرتی رہی ہیں اگر دریکتا اپنے ہونے والے بھتیجے یا بھتیجی کے حق میں اپنی جائیداد سے دستبردار ہو جاتی ہے تو یہ کوئی نئی تاریخ رقم کرنے والی بات نہیں ہوگی ایک عام سا واقعہ ہوگا۔ جسے لوگ جلد بھول بھال جائیں گے۔ پر یہ سب پیار و لاڈ اور نرمی سے کرنے والا کام ہے۔ دریکتا معصوم سی بچی ہی تو ہے جسے دنیا کا زیادہ پتہ نہیں ہے۔ اُسے ان چیزوں سے کہاں پالا پڑا ہے۔ جو ہم سوچ رہے ہیں۔ عمر نے اس کا نکاح کر کے کام مشکل کر دیا ہے۔ لیکن ہارون یا نوید کے کسی بیٹے کے ساتھ اُس کا نکاح ہوتا تو ہمارے لیے بہت مشکل ہوتی۔ جو میری پلاننگ ہے اس پہ عمل درآمد کرنا مشکل ہوتا۔ طاہر لغاری اور اُس کا بیٹا ہمارے خاندان سے نہیں ہے یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے۔'' اورنگزیب آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ''اُس دن یہاں آیا تو میں خائف سی ہو گئی تھی۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہماری راہ میں مزاحم ہو۔ دریکتا کی جائیداد اُسے بھی تو لالچ میں ڈال سکتی ہے''۔ شریں کے خدشات اپنی جگہ تھے۔ ''نہیں نہیں دریکتا کی جائیداد اُسے لالچ میں نہیں ڈال سکتی۔ طاہر لغاری خود بہت ہی خوشحال خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خاندان سے جہاں عورت کی دولت و جائیداد پہ نظر رکھنا مردانگی کے خلاف تصور کیا جاتا ہے۔ بے فکر تم چھوڑ دو''۔ ''کیسے چھوڑ دوں میں اشعر کو دیکھ کے خوفزدہ ہو گئی تھی''۔ ''کہا ناں مت خوفزدہ ہو۔ اشعر جیسے پولیس آفیسر بہت دیکھے ہیں۔ تم بس یاد رکھو کہ

عمر کو ملک سے باہر لے کے جانا ہے علاج کی خاطر''۔ ''ٹھیک ہے جو آپ کہتے ہیں ویسا ہی ہوگا''۔ شریں خلاف توقع بہت زمانبرداری سے بولی۔ اور اورنگزیب سیدھا ہو کر اُس کا چہرا دیکھنے لگا۔ شریں جھینپ کے نظر چرا گئی۔

☆☆☆

باسط جس شخص کے لیے کام کرتا تھا اُس کی اپنے نائب سے اَن بن ہو گئی تھی۔ نائب کا جھکاؤ شروع سے ہی باسط کی طرف تھا۔ وہ اُسے اُس کی ہوشیاری اور سمجھداری جو چالاکی کی حد تک بڑھی ہوئی تھی کی وجہ سے بہت پسند کرتا تھا۔ اب باس سے ان اختلافات کے بعد وہ مکمل طور پہ باسط کا حمایتی بن گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ باسط کے ساتھ مل کے اپنا آزادانہ کام شروع کرے۔ پر جانے کیوں باسط نے ابھی تک اُسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ باس اور اُس کے نائب جیسے لوگوں میں اپنی کم عمری کے باوجود بہت جلد مقبول ہو گیا تھا۔ بہت سے لوگ اچھی آفر کا لالچ دے کے باس سے توڑنے کی کوشش کر چکے تھے۔ پر ایسی ہر آفر کا جواب اُس نے نفی میں دیا تھا۔ اُسے پتہ تھا ان لوگوں سے غداری کا دوسرا مطلب موت ہے۔

وہ ہوشیار بھی تھا اور اُسے زندگی سے پیار بھی تھا۔'' وہ بہت کچھ حاصل کر چکا تھا۔ باس کے نائب نے ایک ایسی آفر کی کہ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے کہا کہ ابھی تم میرے ساتھ کام کرو۔ بندے میرے پاس موجود ہیں۔ تم میرے پاس آجاؤ۔ جب تمہارا دل چاہے چھوڑ کے چلے جانا۔ میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ ساری زندگی کے لیے باندھ کے نہیں رکھوں گا''۔ آخری بات ایسی تھی کہ وہ مجبور ہو گیا تھا۔ پھر بھی سوچنا ضروری تھا اُس نے چند دن کی مہلت مانگ لی۔ باس کا نائب خوش تھا۔ اُسے یقین تھا سوچنے کے بعد باسط کا جواب ہاں ہی میں ہوگا۔ وہ انکار نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ آفر ہی ایسی تھی۔ ہر شخص نارمل زندگی گزارنے کی خواہش رکھتا ہے جس میں کوئی خوف خطرہ اور جان ہتھیلی پہ لے کے پھرنے والا کوئی کام نہ ہو۔ ایک گھریلو بیوی ہو بچے ہوں زندگی کی سہولیات ہوں۔ ایسی خواہشات باسط کے دل میں بھی تھیں۔ کیونکہ اُس نے باس کے نائب کو بتایا تھا کہ اُس کی ایک کزن ہے جسے وہ دل ہی دل میں چاہتا تھا۔ اُس کی ماں کی بھی خواہش تھی کہ وہ لڑکی اُس کی بہو بنے۔ پر اُس کا رشتہ کہیں اور طے ہو گیا۔ اب اُس لڑکی کے شوہر کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ باسط نے اُسے دل کی بات بتائی تھی کہ وہ اب بھی اُسی لڑکی سے شادی کا خواہش مند ہے۔ باسط اُن لوگوں کے ساتھ رہ کے بہت سفاک اور خود غرض ہو گیا تھا۔ ایسی نازک بات باسط کے منہ سے سن کے باس کے نائب کو حیرانی ہوئی تھی۔ خیر وہ جس جگہ اور جس پیشے میں تھا وہاں ان باتوں پہ زیادہ دیر توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔ اپنے اپنے تقاضے اور نزاکتیں تھیں۔ وہ زیادہ دیر کھل کے حیران بھی نہیں ہو پایا تھا کیونکہ باس کے ساتھ ایک معاملے میں اختلاف بہت خطرناک رُخ اختیار کر گیا تھا اس لیے اُس نے باسط کو اپنے ساتھ مل کے کام کرنے کا آئیڈیا دیا تھا۔ کچھ اور بھی لوگ تھے جو اُن کے ساتھ کام کرنے کے معاملے میں سنجیدہ تھے کیونکہ منافع بہت زیادہ تھا خطرہ بھی تھا پر وہ خطرے کو خاطر میں لانے والے کمزور لوگ نہیں تھے۔ اُنہیں پتہ تھا وہ اپنے اگلے سانس کی بھی گارنٹی نہیں دے سکتے آئے گی کہ نہیں۔ دولت کی ہوس نے سوچنے کی طاقت ہی چھین لی تھی۔ پر باسط بھی سوچ رہا تھا۔ ہر پہلو کو تنقیدی نگاہ سے دیکھ بھی رہا تھا۔ اُس کے بعد اُس نے اپنا فیصلہ باس کے نائب کو سنانا تھا۔ جو بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

دریکتا کالج سے لوٹی تو پورے گھر پہ بڑی غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ورنہ جب سے سائرہ آئی تھی اُس کی موجودگی میں خاموشی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ تیز آواز میں خوب دھوم دھڑکے والا میوزک سنتی تھی۔ اب اُس نے

اپنا کمرا بھی بدل لیا تھا۔ شاہ زیب کے بیڈروم کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ دریکتا نے اُس کی موت کے بعد اُس کا بیڈروم لاک کر دیا تھا۔ سائرہ نے ایک دن چابی مانگی تو اُس نے دے دی۔ اُس نے سوچا کہ ویسے ہی مانگی ہے۔ سائرہ نے اپنا مختصر سا سامان اُدھر ہی سیٹ کر دیا۔ دوسرے دن دریکتا نے شاہ زیب کے کمرے سے آتی تیز چھبتے میوزک کی آواز سنی تو آئی۔ اندر سائرہ چیئر پہ بیٹھیں پاؤں ہلا رہی تھی۔ پاس ہی اُس کے جوتے پڑے تھے اور سامنے ڈریسنگ ٹیبل پہ سن بلاک لوشن، مختلف کریمیں، لپ اسٹک، نیل پالش اور اسی نوعیت کی باقی چیزیں بھی رکھی نظر آ رہی تھیں۔ دریکتا کو غصہ آ گیا۔

''سائرہ یہ شاہ زیب بھائی کا کمرا ہے میں نے خود لاک کیا تھا۔ اس کمرے میں اُن کی یادیں بکھری پڑی ہیں۔ تمہیں اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔'' سائرہ تو جیسے لڑنے کو تیار بیٹھی تھی شروع ہو گی۔ ''یہ کمرا میں نے لے لیا ہے۔ تمہارا بھائی تھا تو میرا بہنوئی بھی تھا۔ اور کن یادوں کی بات کرتی ہو۔ شاہ زیب بھائی یہ دنیا چھوڑ چکے ہیں اور اپنی یادیں بھی ساتھ لے گے ہیں۔ تم بھی حقیقت کی دنیا میں واپس آؤ''۔ اُس کی زور زور کی آوازوں پہ ثریں اور مائرہ بھی اِدھر آ گئیں۔ ''کیوں شور کر رہی ہو سائرہ''۔ مائرہ بہن سے مخاطب تھی۔ ''میں نے اس کمرے میں اپنا سامان رکھا ہے تو یہ شور کر رہی ہے کہ یہ میرے بھائی کا کمرا ہے اس کمرے میں اُن کی یادیں ہیں تم اپنا سامان اُٹھاؤ اور یہاں سے جاؤ''۔ سائرہ نے کچھ سچ اور کچھ جھوٹ کی آمیزش سے واقعے کو زیادہ سے زیادہ مزے دار بنا کے پیش کیا تو مائرہ کو غصہ آ گیا۔ ''اس گھر پہ صرف تمہارا حق نہیں ہے میرا بھی ہے سمجھیں تم۔ سائرہ اِدھر ہی رہے گی۔ دیکھتی ہوں کس میں اتنی جرأت ہے جو تمہیں یہاں سے نکالے''۔ دریکتا وہیں خاموش ہو گی۔ وہ تو بول کے پچھتا رہی تھی۔ مائرہ بھابھی حق پہ آ گئی تھی۔ حالانکہ اُس نے ایسا کچھ کہا ہی نہیں تھا۔ اُن سب کی یہاں اپنے گھر میں آمد کے بعد وہ خود اپنے خول میں سمٹ گئی تھی۔ خود کو محدود کر لیا تھا۔ اتنے میں ثریں تائی آگے بڑھیں اور خاموش کھڑی دریکتا کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ ''ارے کیا کرتی ہو۔ ٹھیک ہی تو کہتی ہے یہ کہ اس کمرے میں شاہ زیب کی یادیں ہیں۔ ایک بھائی کا درد بہن ہی سمجھ سکتی ہے۔ یہ اس کے بھائی کا کمرا ہے وہ یہاں رہتا رہا تھا۔ اُس کی چیزیں اُس کی نشانیاں ہیں یہاں''۔ دریکتا کو گلے لگائے وہ ہولے ہولے سسکنے لگی تو دریکتا بھی رونے لگی۔ ''تم خوش قسمت بہن ہو کہ شاہ زیب تمہارے پاس ایک اور نشانی چھوڑ گیا ہے۔ مائرہ کچھ عرصے بعد شاہ زیب کے بچے کو جنم دینے والی ہے۔ تم اُس کی پھوپھو کہلاؤ گی۔ شاہ زیب کا خون شاہ زیب کی اولاد بھائیوں کی اولادیں بہنوں کو بڑی پیاری ہوتی ہیں۔ وہ تو سب کچھ وار دیتی ہیں۔ اُن پہ پھر یہ سب شاہ زیب کے بچے کا ہو گا''۔ ثریں ہولے ہولے اُس کے بالوں کو سہلا رہی تھیں۔ انہوں نے آنکھ کے اشارے سے سائرہ اور مائرہ کو یہاں سے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ دریکتا شاہ زیب کے ہونے والے بچے کے ذکر پہ خوش ہو گی۔ اُس کی آنکھوں میں خواب سجنے لگے۔ اپنے بھائی کے خون کے ساتھ اُس کا رشتہ بھی کتنا پیارا تھا۔ جس نے لمحہ بھر کے لیے اُسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔

''تمہارے تایا بتا رہے تھے کہ شاہ زیب کا کاروبار تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ بنیادیں تو ہل ہی چکی ہیں کیونکہ شاہ زیب کو اس کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لیے خسارہ ہی ہوتا رہا۔ تمہارے تایا اور اشعر نے بہت کوشش کی کسی نہ کسی سنبھالا دینے کی۔ بینک سے لون لیا، اپنی زمین گروی رکھ دی پر کچھ فائدہ نہیں ہوا زمین گروی رکھنے کا بھی۔ بینک نے ہماری زمین ضبط کر لی ہے کیونکہ وقت پہ ادائیگی نہیں کر سکا تھا شاہ زیب۔ اُس کا کاروبار تباہ ہوا ہی ہوا ہماری زمین بھی گی۔ اب اگر کوئی انویسٹ منٹ کرے تو بات بن سکتی ہے ورنہ شاہ زیب کا قائم کیا ہوا کاروبار گیا سمجھو۔'' ثریں جذباتی داؤ کھیل رہی تھی۔ اُس کی توقع کے عین مطابق دریکتا پریشان ہو گی۔

''تائی آپ تایا سے کہیں ناں کہ انویسٹ منٹ کریں۔'' ثریں نے سر پہ ہاتھ پھیر کے دہائی دی۔ ''ارے میں اتنی دیر سے یہی تو بتا رہی ہوں کہ اپنی زمین تک تمہارے تایا نے گروی رکھ دی ہیں۔ کہاں سے انویسٹ منٹ کریں۔ اچھا خاصا پیسہ ہو تو بات بن سکتی ہے۔ یہ لاکھوں کا کام نہیں ہے''۔ ''تائی پھر کیا ہو سکتا ہے''۔ اب اُس نے کام کی بات کی تھی۔ ثریں خوش ہو گی۔ شکاری خود چل کے پھندے کی طرف آ رہا تھا۔ ''ہاں اگر تم شاہ زیب کے کاروبار میں انویسٹ منٹ کرو تو اُس کا کاروبار بچ سکتا ہے۔ کل جب اُس کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہو گا تو وہی وارث ہو گا ناں۔ ہم تو نہیں ہوں گے ناں۔ نہ ہمیں کوئی غرض ہے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے ہمارے پاس۔ ہم نے کسی کے پیسے پہ نظر ہی نہیں رکھی ہے''۔ ثریں نے بڑی مہارت سے صفائی بھی پیش کر دی اپنی۔ دل میں چور تھا ناں اپنے حالانکہ دریکتا کا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں تھا جس طرف ثریں سوچ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے میں بھائی کے کاروبار میں انویسٹ منٹ کرتی ہوں۔ ابھی منیجر کو فون کرتی ہوں وہ گھر ہی آ جائے گا میں اُسے پوچھتی ہوں''۔ ''ارے نہ نہ منیجر کو فون کر کے گھر بلانے کی کیا ضرورت ہے تم اپنے تایا سے بات کر لو۔ وہ خود ہی سب کچھ کر لیں گے''۔ ثریں اُس کی حماقت پہ ایک دم گھبرا سی گی۔ ''ٹھیک ہے تائی جب تایا گھر آ جائیں تو اُن سے بات ہوتی ہے''۔ ''جیتی رہو میری بچی۔ تم ایسا کر کے شاہ زیب کے ہونے والے بچے پہ احسان کرو گی۔ جو یتیمی کا سرٹیفکیٹ ماں کے پیٹ سے ہی لے کے پیدا ہو گا''۔ ثریں نے ایک بار پھر دوپٹہ آنکھوں پہ رکھ لیا اور رونے لگی۔ اُس کا ساتھ دریکتا بھی پوری رفتار اور طاقت کے ساتھ دے رہی تھی۔ مشکل کام دریکتا نے نہایت آسانی کے ساتھ کر دیا تھا۔ ثریں نے اورنگزیب کو گھر بلوا لیا۔ دریکتا کے علم میں لائے بغیر۔ انہوں نے بھی یہ ظاہر کیا جیسے وہ کسی کام سے اچانک آئے ہوں۔ دریکتا پاس نہیں تھی۔ اُنہوں نے اپنی کارگزاری بڑی خوشی سے مجازی خدا کے گوش گزار کی۔ ''اب وہ کہتی ہے کہ میں کیسے انویسٹ منٹ کروں میں یہاں بلواتی ہوں آپ نے جو کرنا ہے اُسے بتا دیں''۔ ثریں کے قدم خوشی میں کہیں سے کہیں پڑ رہے تھے۔ چند منٹ بعد دریکتا ثریں کے ساتھ آ گی۔ ''میری بیٹی کیا کہہ رہی ہے''۔ تایا اورنگزیب نے اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ ''تایا جان تائی نے مجھ سے شاہ زیب کے کاروبار کا ذکر کیا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ ختم ہو یا اُسے ختم کر دیا جائے اس لیے میں چاہتی ہوں اس سلسلے میں مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے میں کروں کیونکہ میں زیادہ نہیں جانتی اس بارے میں''۔ اورنگزیب اُس کی بات سن کے خاموشی میں ڈوب لے۔ بڑی دیر بعد سر اُٹھا کے اُس کی طرف دیکھا۔ اُن کی خاموشی سے وہ بے قرار ہو گی۔

''بیٹی بہت پیسہ چاہیے اس کے لیے۔ یہ کوئی لاکھوں کا کاروبار نہیں تھا یا ہزاروں کا نہیں تھا شاہ زیب نے اپنی بے وقوفی اور ناتجربے کاری سے اپنا سب سرمایہ اس میں جھونک دیا تھا۔ میں کیا بتاؤں تمہیں''۔ وہ ہچکچاہٹ کا شکار لگ رہے تھے۔ ''تایا جان پھر بھی کچھ بتائیں تو سہی''۔ وہ منت ریز لہجے میں بولی تو وہ ٹھنڈی سانس لے کے رہ گے۔ ''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ اس کے لیے پیسہ بہت چاہیے ہو سکتا ہے۔ تمہارا سارا بینک بیلنس اس میں خرچ ہو جائے۔ اور کل کو تم مجھے اپنے سگے تایا کو الزام دو کہ میں نے تمہیں یہ مشورہ دیا تھا۔ نہ بابا میں کل کلاں کو کوئی الزام اپنے سر نہیں لے سکتا۔ حالانکہ میں تو سب کی بھلائی کا ہی سوچ رہا ہوں۔ مگر کبھی کبھی اچھائی اپنے ہی گلے پڑ جاتی ہے اورنگزیب نے بڑی چالاکی سے بال اُس کے کورٹ میں ڈال دی تھی۔ ''تایا جان آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں میں کیوں آپ کو الزام دوں گی۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ بے شک سارا بینک بیلنس ختم ہو جائے مجھے پروا نہیں ہے۔ پپا کے بعد آپ ہی ہمارے بڑے ہیں اور یقیناً ہماری بھلائی کا ہی سوچیں گے''۔ وہ شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ ''پھر بھی بیٹی اچھی طرح سوچ لو۔ میں تو شاہ

زیب کے اُس بچے کے بارے میں پلان کر رہا ہوں جو دنیا میں آنکھ کھولے گا تو یتیم ہوگا۔ اگر شاہ زیب کا کاروبار بچ جاتا ہے تو اُس کے بچے کے لیے بہت فائدہ مندہ ہوگا۔ شاہ زیب کا بچہ اتنے بڑے خاندان کا فرد ہوگا تم کبھی نہیں چاہو گی کہ وہ کسی کا ضرورت مند اور محتاج ہو۔ آخر کو اُس کو پھوپھو اور دادا دولت و جائیداد کے مالک ہیں کچھ اس کو تو بھی ملنا چاہیے ناں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں''۔ اورنگزیب نے دریکتا کے سر پہ ہاتھ پھیرا جیسے اُسے تائید چاہ رہے ہوں۔

''تایا جان آپ بیٹھیں میں اپنے کمرے سے ہوکے ابھی آئی۔ وہ عجلت میں اُٹھ گی۔ اورنگزیب نے فاتحانہ نگاہوں سے ثریں کی طرف دیکھا''۔ ''دیکھا تم نے آرام آرام سے کام کرنے کا نتیجہ''۔ وہ سارا کریڈٹ خود لینا چاہ رہے تھے۔ عمر زیب اگر ہوش میں باشعور ہوتے تو اپنے بھائی کی اس کایا پلٹ پہ بہت حیران اور دکھی ہوتے۔ وہ تو ثریں کی طرح اتنے خودغرض نہیں تھے۔ ثریں بھابھی تھی وہ تو بھائی تھے۔ اپنا خون ایک باپ کی اولاد۔ وہ کیوں اتنے خودغرض ہو گئے تھے صرف اور صرف اپنے مفاد اور اپنی اولاد کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

دریکتا جلد ہی واپس آ گی۔ وہ اپنی الماری سے چیک بک نکال کے لائی تھی۔ ثریں اور اورنگزیب اُس کے ہاتھوں کی طرف ہی دیکھ رہے تھے جس میں چیک بک اور بال پوائنٹ دبا ہوا تھا۔ دریکتا نے چیک بک پہ سائن کیے اور پھر صفحہ پھاڑ کے تایا اورنگزیب کی طرف چیک بڑھایا۔ اُنہوں نے اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا کہ دریکتا نے کتنی رقم کا چیک لکھا ہے۔ اُن کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ یہ بلینک چیک تھا یعنی وہ اس میں اپنی مرضی سے جتنی رقم چاہے لکھ سکتے تھے۔ اُنہوں نے اندرونی خوشی کو سنجیدگی اور رعب کے پردے میں چھپالیا۔ ''دریکتا تمہارا بہت بہت شکریہ جو تم نے مجھ پہ اتنا اعتبار کیا۔ میں اس اعتبار کو کبھی نہیں توڑوں گا۔ اب میں ان پیسوں سے شاہ زیب کی اولاد کے لیے کچھ کروں گا''۔ ''تایا جان اور پیسوں کی جب بھی ضرورت پڑی مجھے بتایئے گا۔ کسی قسم کی ہچکچاہٹ دل میں مت لایئے گا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے جو آپ نے مجھے شاہ زیب بھائی کے بزنس کے بارے میں اصل صورت حال کے بارے میں آگاہ کیا۔ ورنہ مجھے کب پتہ چلنا تھا''۔ وہ اُلٹا اُن کی ممنون اور احسان مند ہو رہی تھی۔ ''ہاں بیٹی تمہیں ساتھ ساتھ میں سب بتاتا رہوں گا۔ بلکہ میں تمہیں شاہ زیب کے آفس بھی لے جاؤں گا تاکہ کسی بھی قسم کا شک وشبہ اگر تمہارے دل میں ہے تو ختم ہو جائے''۔

''ارے نہیں تایا جان میں کیوں شک کروں گی۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی''۔

اُس نے شرمندہ نگاہوں سے تایا کی طرف دیکھا تو اُنہوں نے شفقت سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ پھر اُس کے دیئے چیک کو حفاظت سے والٹ میں رکھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ کتنی رقم اکاؤنٹ سے نکلوائی جائے۔

☆☆☆

باسط نے سابقہ باس کے نائب کے ساتھ کام کرنے پہ آمادگی ظاہر کی تو اُس نے خوشی سے باسط کو گلے لگالیا۔ ''تم نے آج میری بہت بڑی فکر ختم کر دی ہے ورنہ میں آج سوچ رہا تھا کہ اگر تم نے جواب نہیں دیا تو میں ہاشم کے ساتھ مل کے کام شروع کروں گا''۔ اُس نے اپنے ایک اور ساتھی کا نام لیا۔ ''بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے اس کے بعد ہی فیصلہ کرتا ہے انسان''۔ باسط سنجیدہ لہجے میں بولتا ہوا اُسے الگ ہوکے صوفے پہ بیٹھ گیا۔ ''تمہاری یہی دوراندیشی اور دیدہ شناسی ہی تو ہے جس کی وجہ سے میں نے یہ پلان کیا تھا کہ تمہارے ساتھ مل کے کام شروع کیا جائے۔ ہم دونوں کہاں سے کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ مال میرا ہوگا آدمی بھی میں دوں گا تم میرے دست راست ہوگے۔ تم نے سب کچھ دیکھنا ہوگا''۔ ''ٹھیک ہے میں تیار ہوں''۔ ''اس میں تمہارے لیے جو سب سے بڑا فائدہ ہے وہ یہ ہے کہ تم جب بھی اپنی مرضی سے کاروبار سے الگ ہونا چاہو ہو جانا میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ راضی خوشی جانا''۔ فی الحال تین چار دن بعد میرے فلیٹ آجانا۔ وہاں سے سکندر کے پاس جانا ہے۔ تمہیں مال دکھانا ہے۔ بہت ہی اعلیٰ اور عمدہ کوالٹی کا مال ہے۔ انٹرنیشنل مارکیٹ میں اُس کی ڈیمانڈ کے ساتھ ساتھ قیمت بھی بہت زیادہ ہے۔ چند پھیروں میں ہی مال اِدھر سے اُدھر کر کے ہم بے اندازہ دولت کمالیں گے''۔ اُس کی آنکھوں میں حسین سپنے دمک رہے تھے۔

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو ہمیں آغاز کر دینا چاہیے۔ پھر میں کچھ عرصے بعد اپنے گھر جاؤں گا اور شادی کروں گا''۔ باسط نے آئندہ کا پلان بتایا تو نائب نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ میری دعا ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ میں تو اپنی محبت کو پا ہی نہیں سکا پر تم ضرور پالو گے۔ کیونکہ تم میں جذبہ بھی ہے۔ جرأت بھی اور ہمت بھی اور سب سے بڑھ کر تم میں قوت فیصلہ بھی موجود ہے۔ تم راہ میں آنے والی ہر مشکل کا مقابلہ کر سکتے ہو''۔ باس کے نائب کا نام تو اظہر تھا پر زیادہ لوگ اُس کے اصل نام سے واقف نہیں تھے اور نہ ہی نام سے پکارتے تھے۔ باسط اپنی تعریف پہ پھول سا گیا۔

☆☆☆

اورنگزیب دریکتا کو شاہ زیب کا آفس دکھانے پہ بضد تھے مگر وہ انکار کر رہی تھی۔ ''تایا جان میں نے کیا کرنا ہے دیکھ کے۔ آپ سب معاملات دیکھ رہے ہیں یہی کافی ہے''۔ بیٹا میں چاہتا ہوں کہ تم ایک بار دیکھ تو لو ساتھ فیکٹری پہ بھی نظر ڈال آنا جہاں مال تیار ہوتا ہے۔ میں نے تمہارا پیسہ کن کن جگہوں پہ خرچ کیا ہے تمہیں وہ سب حساب بھی چیک کروانا ہے۔ ''ایسا نہ ہو کہ کل کوئی بدخواہ میرے بارے میں بدگمان کر دے''۔ ''تایا جان ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ میں آپ کے بارے میں کچھ برا سوچوں۔ آپ نہ پریشان ہوں۔ مجھے آپ پہ پورا یقین ہے''۔ دریکتا کا لہجہ اُس کے اعتبار کا گواہ تھا۔ اورنگزیب پرسکون ہو گے۔ اُس نے اُن کی ایک اور پریشانی دور کر دی تھی۔

☆☆☆

منیجر صاحب گھر تشریف لائے تھے۔ سائرہ نے فوراً جا کے ثریں کو اطلاع دی۔ ثریں مغرور قدموں سے چلتی و اکڑی گردن کے ساتھ صوفے پہ اُن کے سامنے بیٹھی تھی۔

''ہاں جی کیا کام ہے آپ کو جو اس طرح آپ کو گھر آنے کی زحمت کرنی پڑی''۔ وہ نخوت سے ناک چڑھا کے بولی۔ منیجر صاحب کو اُن کا یہ انداز ہضم نہ ہوسکا۔ وہ عمر زیب کے منہ چڑھے تھے۔ اور عمر اُن پہ بے پناہ اعتماد کرتے تھے۔ وہ کوئی بھی کاروباری فیصلہ اُن کے مشورے کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ جب اُنہوں نے اپنے کاروبار اور جائیداد کا نصف حصہ شاہ زیب کے حوالے کیا تو اُنہیں بتایا کہ اُنہیں اپنا یہ کاروبار وہ دریکتا کے حوالے کریں گے اور وہی اُس کی مالک ہوگی۔ کچھ عرصے بعد بڑی رازداری سے اُنہوں نے وہ کام کر دیا تھا۔ اب حالات ویسے نہیں رہے تھے۔ عمر زیب بزنس کی دیکھ بھال سے خود معذور تھے۔ ایسے میں دریکتا کو بولڈ اسٹیپ لینا چاہیے تھا۔ پر وہ خاموش تھی۔ منیجر صاحب نے دبے لفظوں میں دو تین بار اُسے کچھ بتانا چاہا پر وہ نہیں سمجھ سکی۔ وہ کھل کے بول بھی نہیں سکتے تھے۔ کھل کے بولتے تو نوکری سے فارغ کر دیئے جاتے۔ ویسے بھی وہ کیا کہتے۔ اُن کے اپنے رشتہ دار تھے سب۔ اُن کے مقابلے میں وہ منیجر صاحب کی کہی کسی بھی بات کا کیسے اعتبار کرتی۔ پھر بھی آج اُن سے رہا نہیں گیا تو وہ اُن کے گھر آئے۔ آفس میں تو عمر زیب کے تینوں بھائیوں کا قبضہ تھا۔ وہ کچھ کر ہی نہیں پا رہے تھے۔ ''مجھے دریکتا صاحبہ سے کچھ فائلز سائن کروانی تھی۔ اس لیے گھر آیا ہوں''۔ حتی الامکاں اُنہوں نے اپنے لہجے کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔ آپ اورنگزیب صاحب ہاتھ فائلز بھجوا دیتے''۔ صاحب لوگوں سے میں

نوکروں والے کام لے سکتا ہوں۔ اُنہوں نے بھی طنزیہ انداز میں کہا تو شریں کی تنی تنی سی گردن کچھ ڈھیلی پڑ گئی۔

''ٹھیک ہے میں دریکتا کو بلواتی ہوں۔'' شریں نے پاس سے گزرتی نوکرانی کو آواز دے کر دریکتا کو بلانے کا کہا۔ دریکتا کے آنے پہ شریں اُدھر ہی بیٹھی رہی ایک پل کے لیے بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوئی۔ اُس کی نگاہ، منیجر اور دریکتا کی حرکات وسکنات پہ تھی۔ وہ کچھ آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ اُس نے کان اُدھر ہی لگا دیئے۔ ''آپ خود آفس کا چکر لگالیا کریں کبھی کبھار'' وہ دریکتا سے کہہ رہے تھے۔ شریں کی آنکھیں رنگ بدلنے لگی۔ اُسے منیجر پہ بہت غصہ آیا۔ سائن کروانے آیا تھا اور ساتھ مشورے دے رہا تھا۔ ''ٹھیک ہے میں کل تایا جان کے ساتھ آؤں گی خود''۔ دریکتا اس بار اُن کی فرمائش یا مشورہ رد نہیں کر پائی تھی۔

''ضرور آیئے گا میں انتظار کروں گا''۔ منیجر صاحب کا لہجہ بہت مخلصانہ تھا۔ اس سے اُن کی اپنی کوئی غرض وابستہ نہیں تھی۔ ''عمر صاحب کیسے ہیں اب''۔ ''پپا کی حالت پہلے جیسی ہے کوئی فرق نہیں پڑا ہے''۔ دریکتا یکدم اُداس ہوگئی تھی۔ ''تو کون سے ڈاکٹر اُن کا ٹریٹ منٹ کر رہے ہیں''۔ ''کوئی بھی نہیں''۔ ''کیا مطلب میں سمجھا نہیں''۔ ''اصل میں ڈاکٹرز نے جو دوائیں پہلے تجویز کی تھی وہی دے رہے ہیں پپا کو۔ تایا جان لے کے گئے تھے۔ پپا کو ڈاکٹر کے پاس۔ اُنہوں نے بتایا ہے کہ پپا کی حالت ایسے ہی رہے گی۔ اُن کی ذہنی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ باقی جو دوائیاں ہم اُنہیں استعمال کروا رہے ہیں وہ دورے کی شدت کم کرنے کے لیے ہیں۔ پہلے پپا کو دورہ زیادہ دن کے بعد پڑتا تھا اب اُس کے دورانیے میں کمی آگئی ہے۔ تایا جان بتا رہے تھے کہ ہوسکتا ہے کہ پپا کو مینٹل ہاسپٹل یا کسی نفسیاتی علاج گاہ میں نہ داخل کروانا پڑ جائے۔ کیونکہ اب اُن کا رویہ گھر والوں کے ساتھ خطرناک اور جارحانہ ہوتا جارہا ہے''۔ یہ سب تفصیل بتاتے ہوئے دریکتا کا لہجہ نم آلود سا ہوگیا تھا۔ بیچارے منیجر صاحب خود اُداس ہوگئے۔ ''کیا میں اُنہیں ایک نظر دیکھ سکتا ہوں''۔ ''ہاں آیئے میرے ساتھ''۔ دریکتا اُنہیں پپا کے کمرے کی طرف لے آئی۔ اُس نے باہر سے کمرے کا لاک کھولا۔ وہ حیران حیران سے اُس کے پیچھے داخل ہوئے۔ عمر زیب صاحب گہری نیند میں تھے۔ شریں بھی اُٹھ کے اُن کے پیچھے آگئی تھی۔ منیجر صاحب تاسف سے سوئے ہوئے عمر زیب کو دیکھ رہے تھے۔ اُنہیں عجیب سی وحشت ہورہی تھی۔ اُنہیں پس منظر میں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ مگر یہ گڑبڑ کیا تھی اُنہیں معلوم نہیں تھا۔ دریکتا کے چہرے پہ معصومیت اور انجان پن کی تحریر واضح تھی۔ وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے کہ شریں کو دیکھ کے اپنے سوال کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ وہ بلی کی طرح دبے قدموں آئی تھیں۔ شکر تھا کہ اُنہوں نے دیکھ لیا تھا۔

منیجر صاحب اُس کے بعد جلد ہی اجازت لے کے رخصت ہوگئے۔ ''اس منیجر کی دھلائی بہت ضروری ہے''۔ شریں اُس کے جانے کے بعد سوچ رہی تھی۔ ابھی یہ فکر اُس کے سر پہ تھی کہ رات کو دریکتا نے تایا اورنگزیب سے کل آفس جانے کا کہہ دیا۔ اُس نے منیجر کا ذکر گول کردیا پر شریں اُس سے پہلے ہی یہ بات اُن تک پہنچا چکی تھی۔ اورنگزیب پریشان سے ہوگئے۔ ''ایسا ہے کہ میں کچھ دن کے لیے شہر سے باہر ایک ضروری کام کے سلسلے میں جارہا ہوں۔ وہاں سے آؤں گا تو آفس جانا میرے ساتھ۔ آخر کو وہ تمہارا ہی تو ہے۔ تم مالک تم باس اور ہم ماتحت ہی تو ہیں تمہارے کام کرنے والے بھاگ دوڑ کرنے والے''۔ تایا اورنگزیب کا لہجہ جیسے بھرا گیا تھا۔ دریکتا تڑپ ہی تو گئی۔

''میں ایسا نہیں تصور کرتی ہوں۔ خدانخواستہ ایسی سوچ کبھی میرے ذہن میں آئی ہی نہیں۔'' آپ ایسا سوچیں بھی مت۔ بڑی دیر بعد دریکتا کے سمجھانے اور معذرتیں کرنے کے بعد وہ کچھ نارمل ہوئے تو جیسے کوئی، بھولی ہوئی خاص بات اُن کے ذہن میں آئی۔ سر پہ ہاتھ پھیر کے رہ گئے۔ ''اوہو بات کیا کرنے لگا تھا تمہارے ساتھ ذہن سے نکل ہی گئی''۔ ''کیا بات ہے تایا جان''۔ دریکتا اُن کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ''بیٹا یہ منیجر ہے ناں جسے عمر نے اپائنٹ کیا تھا اس کی بہت ساری بے ایمانیاں اور گھپلے ان چند ماہ کے دوران میں نے پکڑے ہیں اب تو یہ ہمارے منہ کو آنے لگا ہے۔ نقصان پہنچا رہا ہے ہماری ساکھ کو۔ عمر بھائی نے بڑی محنت سے اپنے اس کاروبار کو ترقی دی ہے میں اس میں کسی طرح کا نقصان برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے میں نے اسے ڈس مس کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں نے سوچا تمہیں بتا دوں۔ پھر بھی اگر تم اسے بحال رکھنا چاہتی ہو تو میں اس کی راہ میں آڑ نہیں بنوں گا''۔ ''تایا جان آپ جو مناسب سمجھیں کریں میں کچھ نہیں کہتی''۔ کہنے کو تو اُس نے یہ بول دیا تھا مگر دل ہی دل میں منیجر صاحب کے ساتھ ہونے والی کچھ گھنٹے پہلے کی باتیں یاد کرکے اُسے پریشانی ہورہی تھی۔ وہ بظاہر ایسے لگتے تو نہیں تھے۔ پھر پپا بھی اُن کی تعریف ہی کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے تایا جان سچ کہہ رہے ہوں۔ اُن کا تجربہ اور مشاہدہ زیادہ ہے۔ اُنہیں انسانوں کی پرکھ بھی زیادہ ہوگی ورنہ وہ منیجر صاحب کو ڈس مس کرنے کا فیصلہ نہ کرتے۔ اس آخری سوچ نے اُسے عارضی طور پہ مطمئن کردیا تھا۔ پر دل رہ رہ کے یہی گواہی دے رہا تھا کہ منیجر صاحب مخلص انسان ہیں وہ ایسا نہیں کرسکتے۔

☆☆☆

دن بڑے بے کیف اور بے رنگ سے تھے۔ مائرہ بھابھی کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی تھی۔ ہاتھ پاؤں سوجنے لگے تھے اور چہرے پہ بھی ورم تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کچھ تکالیف لاحق ہوگئی تھیں۔ شریں اُس کی حالت اور تکلیف دیکھ دیکھ کے کڑھتی۔ اورنگزیب اُن کے مجازی خدا نے گاؤں واپسی کا حکم سنایا تھا۔ سائرہ کا واپسی کا ذرا بھی دل نہیں تھا پر شریں نے کسی نہ کسی طرح اُسے بہلا کے واپسی پہ آمادہ کرہی لیا۔ ''ہم بہت جلد پھر واپس آجائیں گے تم معاملے کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو''۔ ''کہا نہ ہم ہی واپس جائیں گے''۔ وہ ضدی ہورہی تھی۔ ''صرف ہم ہی نہیں جائیں گے''۔ ''پھر کون کون جائے گا''۔ ''منہ اِدھر کرو''۔ شریں نے اشارہ کیا تو وہ قریب کھسک آئی۔ وہ آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں بتانے لگی۔ سائرہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''پھر ہم سب کب تک جائیں گے میرے کالج کا کیا ہوگا''۔ اُسے یہ فکر بھی لاحق تھا۔ ''جہاں مائرہ پڑھتی تھی تمہارا داخلہ بھی وہیں ہوگا فکر مت کرو تمہارا سال ضائع نہیں ہوگا۔ جیسے ہی حالات بہتر ہوئے ہم دوبارہ اِدھر آجائیں گے''۔ ''ٹھیک ہے آپ کہتی ہیں تو مان لیتی ہوں دل ذرا بھی نہیں کررہا ہے گاؤں جانے کو۔ یہاں اتنا مزا آتا ہے لوگ کتنے ماڈرن ہیں۔ فرفر انگلش بولتے ہیں۔ دیر سے سوتے ہیں کتنے مزے میں رہتے ہیں''۔ ''تم ناشکری ہو۔ گاؤں میں کتنا رعب ہے ہم حویلی والوں کا۔ کتنی ٹور تار ہے لوگ جھک جھک کے سلام کرتے ہیں، ڈرتے ہیں۔ جوتیاں سیدھی کرتے ہیں ہماری۔ شہر میں کیا ہے کوئی ہم سے متاثر نہیں ہوتا۔ یہاں سب برابری کی سطح پہ بات کرتے ہیں۔ یہاں ہماری چوہدراہٹ نہیں چلتی۔ گاؤں کے اپنے مزے ہیں''۔ شریں نے اُسے گاؤں میں رہنے کے فوائد گنوانے شروع کیے تو اُس کے سارے اعتراضات ختم ہوگئے۔

☆☆☆

تایا جو شہر سے باہر گئے ہوئے تھے لوٹ آئے تھے۔ سب کے ساتھ بیٹھے اپنی مصروفیات کے بارے میں بتا رہے تھے۔ پھر وہ بطور خاص دریکتا کی طرف متوجہ ہوئے جو وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہیں لگ رہی تھی۔ وہ عمر زیب کے بارے میں سوچ رہی تھی اس لیے اُس کا دھیان اُن کی باتوں کی طرف نہیں تھا۔ ''بیٹا میں اسلام آباد میں اپنی

ایک جان پہچان والے ڈاکٹر سے ملا تھا۔عمر زیب کی ساری رپورٹس اُسے دکھائیں سارا مسئلہ بھی ڈسکس کیا تو اُس نے ایک مشورہ دیا ہے تم اگر سننا چاہو تو"۔ "جی تایا جان آپ بتائیں اُنہوں نے کیا کہا"۔ وہ چونک کر اپنے خیالات سے باہر آئی۔

میرا یہ دوست مشہور سرجن ہے اور دماغی امراض کا ماہر بھی۔ اُس نے کہا ہے کہ اگر ہم عمر زیب کا ماحول بدل دیں یا اُسے کسی اور جگہ لے جائیں تو ماحول اور مقام کی تبدیلی بہت فائدہ مند ہو گی اس طرح عمر کی صحت یابی کے امکانات جو بالکل معدوم ہو گئے ہیں پھر سے روشن ہو جائیں گے۔"سچ تایا جان ایسا ممکن ہے۔ وہ خوش ہو گی"۔"ہاں بالکل سچ۔ اب تم بتاؤ راضی ہو کہ نہیں"۔ وہ قدرے مطمئن ہو گئے۔"تایا جان کسی بات سے راضی میں کچھ سمجھی نہیں ہوں آپ کی بات"۔ وہ اُلجھی نگاہوں سے اُنہیں تکنے لگی۔"یہی ماحول اور مقام کی تبدیلی والی بات سے جو ڈاکٹر نے کہی ہے"۔

"جی تایا جان میں بالکل راضی ہوں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ میں تو خوش ہو گئی ہوں کہ اس طرح میرے پپا تو ٹھیک ہو جائیں گے"۔"شاباش تم نے واقعی ثابت کر دیا ہے کہ تم اپنے باپ سے بہت محبت کرتی ہو۔ پھر تیاری کرو"۔"کہاں کی تیاری تایا ابو"۔

"گاؤں چلنے کی تیاری۔ عمر کو وہیں تو لے کے جانا ہے اپنوں کے درمیان رہے گا اپنوں کی بھرپور محبت ملے گی تو ٹھیک ہو جائے گا"۔"ٹھیک ہے تایا ابو مجھے منظور ہے"۔"وہاں بیٹا وہاں تمہارا بھی دل لگا رہے گا"۔ ہونہہ وہ سر ہلا کے رہ گی۔

☆☆☆

پپا کے اور اپنے کپڑے اور ضرورت کی دیگر چیزیں دریکتا نے ایک بڑے بیگ میں رکھ لی تھیں۔ فارغ ہونے کے بعد سونے کے لیے لیٹی تو طرح طرح کی سوچوں نے ذہن کو گھیر لیا۔ خاصی دیر کے بعد نیند نے پلکوں پہ بسیرا کیا۔

اُسے سوئے ہوئے جانے کتنی دیر ہوئی ہو گی کہ دروازے پہ بڑے زور سے دستک ہوئی۔ نیند میں ڈوبا ذہن بیدار ہوا پھر اُس کے بعد آنکھیں بمشکل کھلیں کیونکہ نیند کا شدید غلبہ تھا۔ بیڈ پہ اِدھر اُدھر سرہانے کی طرف سے ٹٹول کے دوپٹہ اُٹھایا اور دروازے کے قریب پہنچ کے پہلے احتیاطاً پوچھا کہ کون۔"میں ہوں شریں تیار ہو کے باہر آ جاؤ۔ ہم بھی گاڑی میں بیٹھنے لگے ہیں"۔ ہائیں اُس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اُس نے گھوم کے دیوار گیر گھڑی پہ وقت دیکھا۔

"ابھی تو فجر کی اذان ہونے میں بھی دیر ہے۔ پھر اتنی جلدی جانے کا مطلب"۔ وہ خود سے سوال کر رہی تھی۔ جلدی جلدی منہ پہ پانی کے چھینٹے مارے کپڑے تبدیل کیے اور بالوں میں اُلٹا سیدھا برش کر کے اپنا بیگ کمرے سے نکال کے باہر رکھا۔ کافی بڑا اور بھاری بیگ تھا۔ گاڑی تک لے جانا اُس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

اُس نے جیسے ہی بیگ باہر رکھا ملازم نے آ کے اُٹھا لیا اور جا کے گاڑی کی ڈگی میں رکھ دیا۔ دریکتا نے الوداعی نگاہ گھر کے در و دیوار پہ ڈالی اور تھکے تھکے قدموں سے گاڑی کی سمت بڑھ گی۔ اورنگزیب عمر کو پہلے ہی گاڑی میں لا کے بٹھا چکے تھے۔ اس کوشش میں اُن کا سانس پھول گیا۔ سگریٹ نوشی کی لت نے کہیں کا بھی تو نہیں چھوڑا تھا۔ بہت جلدی تھک جاتے۔ کوئی محنت طلب کام تو کر ہی نہیں سکتے تھے وہ۔

عمر زیب کی آنکھیں بند تھیں وہ گاڑی کی بیک سیٹ پہ آنکھیں موندے نیم دراز تھے۔ دریکتا اُن کے قریب آ کے بیٹھ گئی۔ اورنگزیب نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ بڑی خاموشی اور پراسرار طریقے سے اُن کے سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔ جس میں ہر ذی نفس خاموش تھا۔ مائرہ کے چہرے پر البتہ تکلیف کے آثار تھے۔ کیونکہ لیڈی ڈاکٹر نے اُسے آخری تین ماہ میں مکمل ریسٹ اور سفر نہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ کچھ راستے تک تو سڑک ٹھیک تھی اُس سے آگے کا سفر سچ مچ

تکلیف دہ تھا۔ خاص طور پہ مائرہ کے لیے۔ اب تو ڈلیوری کا وقت بھی قریب آ رہا تھا اور اس عالم میں یہ سفر اُس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ ہر جھٹکے پہ اُس کے پیٹ میں درد کی لہریں ہلکورے لینے لگتیں اور وہ دانتوں پہ دانت جما لیتی۔

اُس کے برعکس سائرہ اتنی جلدی بیدار کیے جانے پہ غصے میں تھی اور بڑبڑا رہی تھی۔

"اندھیرے میں ہی اُٹھا دیا۔ صبح کا انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا جیسے"۔ پورا راستہ وہ مختلف طریقے سے اپنا غصہ ظاہر کرتی رہی۔ شریں گھور گھور کے اُسے دیکھتی رہی کہ شاید چپ ہو جائے پر سائرہ دبنے یا ہار ماننے والی نہیں تھی۔

☆☆☆

اللہ اللہ کر کے یہ سفر تمام ہوا۔ اورنگزیب اور عاشر نے عمر زیب کو سہارا دے کے باہر نکالا۔ اُن کی آنکھیں اب کھل چکی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے کچھ بڑبڑا رہے تھے۔

"مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو"۔ اُنہوں نے کمزور جسم کی ساری طاقت استعمال کر کے اُن دونوں سے اپنے بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ عاشر کی گرفت اور بھی سخت ہو گی۔"چچا جان آپ سیدھی طرح آگے چلتے ہیں یا نہیں"۔ وہ دبے دبے لہجے میں اُنہیں غصے سے دیکھتا ہوا آگے کی طرف دھکیلنے لگا۔ دریکتا اُن کے پیچھے تھی۔ اورنگزیب نے بیٹے کو فہمائشی نگاہوں سے گھورا۔ عمر زیب کی جدوجہد جاری تھی۔ اس اثناء میں وہ برآمدہ عبور کر کے صحن تک پہنچ چکے تھے۔ دریکتا سے پپا کی بے بسی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ آگے ہو کے عاشر کے سامنے آ گی۔"عاشر بھائی آپ جائیں میں پپا کو خود لے جاتی ہوں"۔ اورنگزیب نے بیٹے کو اشارہ کیا۔ وہ ہٹ گیا۔ دریکتا پپا کے پاس آ گئی اور اُن کا بازو تھام لیا وہ لڑکھڑاتے قدموں سے گھسیٹ گھسیٹ کے بڑی مشکل سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اگر تایا یا اُس نے اُنہیں پکڑ نہ رکھا ہوتا تو وہ کب کے زمین بوس ہو چکے ہوتے۔ دریکتا کی موجودگی سے وہ کچھ پرسکون سے ہو گئے تھے۔

"عمر کی حالت ایسی نہیں کہ اسے کوئی کمزور سی لڑکی سنبھال سکے۔ اس لیے میں نے عاشر کی مدد لی تھی کیونکہ غصے میں عمر کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اور خطرناک ثابت ہو سکتا ہے"۔

تایا اورنگزیب عمر زیب کو اندر ایک کمرے میں لا چکے تھے۔ دریکتا نے تکیہ ٹھیک کر کے اُنہیں بستر پہ بٹھایا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں گاؤں آمد پہ اُنہیں ٹھہرایا جاتا تھا۔ اورنگزیب چلے گئے اب دریکتا عمر زیب کے پاس اکیلی تھی۔

وہ پاؤں اُوپر کر کے لیٹ گئے۔ اُن کی بند پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں وہ سرگوشیوں میں خود باتیں کر رہے تھے۔ دریکتا نے پاس آ کے سننے کی کوشش کی پر صرف اُن کے ہلتے ہونٹ ہی نظر آ رہے تھے کوشش کے باوجود کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ عمر زیب کے سر اور داڑھی کے بال کافی بڑھ چکے تھے۔ اُنہیں تراش خراش کی ضرورت تھی۔ اُس کے خوش لباس خوش پوش ہنس مکھ پپا کی کیا حالت ہو گئی تھی وہ پہچانے ہی نہیں جا رہے تھے۔ وہ بیڈ پہ اُن کے پاس بیٹھ گی۔ عمر زیب اب بھی کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے پپا کے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو ایک دم سے اُنہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے پپا پہ پھر سے دورہ پڑنے لگا ہو۔ پر اُنہوں نے خاموش نگاہوں سے اُسے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔"شاہ زیب نے کہا تھا میں رات کو کال کروں گا میں کب سے انتظار کر رہا ہوں اُس نے کال ہی نہیں کی۔ میں پریشان ہو رہا ہوں"۔ وہ ہوش مندوں کی طرح صاف لہجے میں خود بول رہے تھے۔ دریکتا نے سماعتیں اُن کی طرف متوجہ کر دیں۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ پپا سے کیا کہے۔ اُسے اپنے خیال پہ خود ہنسی آ گی۔ کہ اگر وہ کچھ کہتے تو پپا کیا سمجھ پائیں گے کون سا وہ ایک نارمل انسان کی طرح ہیں۔ تھوڑی دیر بعد تایا واپس

آ گئے۔ اُن کے پاس عمر زیب کی ڈھیروں دوائیں تھیں جو ڈاکٹرز مختلف اوقات میں تجویز کرتے رہے تھے۔ ان میں وہ انجکشن اور گولیاں بھی تھیں جو عمر زیب کو آج کل استعمال کروائی جا رہی تھیں۔

تایا نے پانی کے ساتھ عمر زیب کو دو گولیاں دیں۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے بڑبڑانا بند کر دیا۔ اُس کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔ وہ کھولنا چا رہا تھا پر اُن پہ منوں بوجھ آ پڑا تھا۔ اُس کا ذہن مدہوشی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اندھیرے کا ایک پردہ تھا جو اُس کے دماغ اور آنکھوں کے درمیان حائل ہو رہا تھا۔

''میں نے عمر کو دوا دے دی ہے اب یہ کچھ گھنٹے سکون ۔۔ رہے گا۔ تم چاہو تو اپنے لیے دوسرا کمرا دیکھ لو میں سیٹ کروا دوں گا''۔ ''نہیں تایا جان میرا خیال ہے کہ میں اِدھر ٹھیک ہوں''۔ اُس نے انکار کر دیا۔ ''پر میں عمر کے دورے کی گارنٹی نہیں دے سکتا اور دورے کی حالت میں تمہیں پتہ ہی ہے کہ یہ کتنا خطرناک ہو جاتا ہے''۔ اُنہوں نے وارننگ دی تو دریکتا کچھ سوچنے لگی۔ آج اُس نے بہت قریب سے اور غور سے پپا کو دیکھا تھا۔ وہاں اپنے گھر میں اُنہیں بیڈ روم میں لاک رکھا جاتا تھا۔ اورنگزیب تب ہی دروازہ کھولتے جب اُنہیں میڈیسن یا کھانا دینا ہوتا یا پھر نوکروں نے اُن کے کپڑے بدلنے ہوتے۔ اُنہوں نے دریکتا کو بھی عمر زیب کے دوروں کا بتا کر خوفزدہ کر دیا تھا۔ اُس نے توجہ سے پپا کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اُس کے دل میں خیال آیا کہ پپا کو اُس کی دیکھ بھال، محبت اور توجہ کی ضرورت ہے وہ اُنہیں نوکروں کی خدمت کے سہارے نہیں چھوڑ سکتی۔ اُن کے سر اور داڑھی کے بال کتنے دنوں کے بڑھے ہوئے تھے۔ کسی کو خیال نہیں آیا تھا کہ انہیں بھی تراش خراش کی ضرورت ہے۔ وہ اُن کے پاس اِدھر رہے گی اور اُن کی چھوٹی موٹی ضروریات کا خود خیال رکھے گی۔ اُس نے پکا ارادہ کر لیا تھا۔

اورنگزیب نے اُس کے چہرے کے تاثرات سے شائد اُس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ لگایا تھا تب ہی پھر دوسرے کمرے میں رہنے پہ اصرار نہیں کیا۔ اورنگزیب جا ہی رہے تھے کہ اُس نے پیچھے سے پکارا۔ ''تایا جان اگر یہاں کوئی بال کاٹنے والا ہے تو پلیز بلوا دیں۔ پپا کے سر اور داڑھی کے بال بہت بڑھ گئے ہیں انہیں سیٹ کروانا ہے''۔

''ہاں ٹھیک ہے ابھی تھوڑی دیر میں نائی یہاں پہنچ جائے گا اپنا کام کر دے گا۔ تم ان چھوٹی چھوٹی باتوں پہ پریشان مت ہو''۔ تایا نے اُس کے سر کے بالوں کو اپنائیت سے سہلایا تو وہ مسکرا دی۔ تایا کتنے اچھے ہیں۔ اُس کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ پپا سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اگر تایا نہ ہوتے تو جانے اُس کا اور پپا کا کیا ہوتا۔ اس سے آگے وہ کچھ سوچ ہی نہیں سکی۔ دل ڈر سا گیا تھا۔

☆☆☆

دوپہر کے کھانے کے لیے اُسے سائرہ بلانے آئی۔ ''امی اور سب کھانے پہ انتظار کر رہے ہیں آ جاؤ''۔

''میں پہلے پپا کو کھلا دوں پھر خود کھاؤں گی۔ پپا کے لیے کھانا بھجوا دو''۔ دریکتا کو جھجک سی ہو رہی تھی۔ حالانکہ شریں تائی، سائرہ، عاشر سب اُن کے گھر میں بے تکلفی سے رہتے رہے تھے۔ بغیر اجازت چیزوں کا استعمال، کھانا پینا، پکوانا۔ پر اُسے یہاں اپنے تایا کے گھر میں خود سے کوئی چیز لیتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی کہ جانے یہ لوگ کیا سوچیں گے۔

''ٹھیک ہے میں امی سے کہتی ہوں آ جانا پھر......'' سائرہ وہیں سے پلٹ گی۔ کچھ دیر بعد نوکر کے ہاتھ ٹرے میں کھانا بھجوایا گیا۔ اُس نے بڑی مشکل سے پپا کو اُٹھایا اور سو سو منتیں کر کے جتن کر کے اُنہیں تھوڑا کھانا کھلایا دریکتا نے۔ اورنگزیب نے کھانے کے بعد میڈیسن دینے کو کہا تھا۔ اُس نے اُن کی ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے پپا کو مشکل سے دوا بھی کھلا دی۔

تھوڑی دیر بعد اُن کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے اور آنکھیں بند ہونے لگیں۔

تب وہ آہستگی سے دروازہ بند کر کے تائی شریں اور دیگر لوگوں کی طرف آئی۔ وہ سب کھانا کھا چکے تھے۔ تائی شریں نے اُسے دیکھتے ہی حویلی میں کام کرنے والی زیبن سے کھانا لانے کو کہا۔ جو یقیناً دریکتا کے لیے منگوایا جا رہا تھا۔ اُس نے آہستگی سے منع کر دیا۔ ''تائی مجھے بھوک نہیں ہے ذرا بھی''۔ اُسے اکیلے کھانے کا سوچ کر شرم سی آ گی۔ باقی سب کھا کے فارغ بھی ہو چکے تھے وہ اکیلی بیٹھ کے کیا کھاتی۔ بھوکے رہنا بہتر تھا۔ تائی نے بھی ایک دفعہ رسمی سا اصرار کیا اور اُس کے انکار پہ پھر دوبارہ نہیں کہا۔

مائرہ اور سائرہ کی اپنی مصروفیات تھیں وہ نظر نہیں آ رہی تھیں۔ تائی شریں، فوزیہ اور فرح چچی کے ساتھ باتوں میں لگی ہوئی تھی۔ وہ اکیلی قدرے دور بیٹھی اُن تینوں کو دیکھ رہی تھی۔ فرح چچی نے شائد اُس کی بوریت محسوس کر لی تھی۔ اُسے اشارے سے اپنی طرف آنے کو کہا۔ وہ بے دلی سے اُن کے پاس بیٹھ گی۔ ''اب تم اِدھر آ گئی ہو تو دل لگانے کی کوشش کرو۔ جہاں زندگی گزارنی پڑتی ہے وہاں دل لگانا پڑتا ہے۔ یہ دنیا کا دستور ہے۔ جو اس سے انحراف کرتا ہے اُسے پچھتانا پڑتا ہے''۔ چچی نے بڑے ناصحانہ انداز سے اُسے کوئی حقیقت باور کرانے کی کوشش کی تھی۔ جو دریکتا کے سر کے اُوپر سے گزر گئی۔ ''ارے دل کیوں نہیں لگائے گی۔ اس کی ماں نے یہاں ہمارے رنگ ڈھنگ اپنا کے زندگی گزاری''۔ شریں نے مسکراتے ہوئے بازو دراز کر کے اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ دریکتا کو اُن کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ بس سر ہلائے جا رہی تھی۔

☆☆☆

شام کو مسکین صورت ایک آدمی آیا اور عمر زیب کے سر کے بال کاٹے داڑھی سیٹ کی۔ دو ملازموں نے اُن کے کپڑے تبدیل کیے۔ وہ آج بہت زیادہ شور کر رہے تھے۔ لیمپ اُٹھا کے ایک ملازم کے سر پہ مارنے کی کوشش کی تو وہ خوفزدہ ہو کے بھاگ نکلا۔ دوسرے نے اپنا حوصلہ قائم رکھا۔ عمر زیب جارحانہ موڈ میں تھے۔ کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دے رہے تھے۔ ''میرے کپڑے دے دو۔ میرے کپڑے دے دو۔ یہ شاہ زیب کے ہیں مجھے دے دو''۔ دریکتا نے اُن کے پہننے کے لیے جو سوٹ نکالا تھا وہ اُسے ملازم کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ شور سن کے اورنگزیب بھی آ گئے۔ ہارون اور نوید بھی نکل آئے۔ کسی نہ کسی طرح کپڑے تبدیل کروانے کا مرحلہ ختم ہوا تو دریکتا اُن کے پاس آئی۔ نوید چچا پپا کو انجکشن لگا رہے تھے۔ دریکتا کا چہرا اُترا ہوا تھا۔ اُسے یہاں آ کے ایک پل بھی سکون کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ''ٹھیک ہو جائے گا عمر۔ تم مت پریشان ہو''۔ تایا اورنگزیب جانے کیا سمجھے تھے۔ اُس کے پاس آ کے اُسے تسلی دی۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پہ آ گی۔

انجکشن لگائے جانے کے بعد عمر زیب پُرسکون ہو رہے تھے۔ اُن کی جارحیت اور مدافعت رفتہ رفتہ دم توڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سو چکے تھے۔

اورنگزیب، نوید اور ہارون تینوں بھائی، اُن کے پاس سے اُٹھ کے قدرے الگ تھلگ سی جگہ پہ آ گئے۔

''عمر کی حالت دن بہ دن پہلے سے خراب ہوتی جا رہی ہے۔ ٹرنکولائزز، سلیپنگ پلز اور انجکشن اس کا علاج نہیں ہے۔ کچھ عرصے بعد وہ ان کا عادی ہو جائے گا تو یہ گولیاں اور انجکشن اُس کے لیے بیکار ثابت ہوں گے''۔ یہ ہارون زیب تھے۔ ''پھر کون اتنا فارغ ہے جو دن رات اُس کے پاس بیٹھ کے حفاظت کرے اُس کی دیکھ بھال کرے''۔ اورنگزیب بےخیال لہجے میں بولے۔ ''دریکتا ہے تو سہی پر اُس کا علاج ضروری ہے ورنہ اُس کے اعصاب رفتہ رفتہ بالکل کمزور ہو کے

تباہ ہو جائیں گے''۔ نوید نے مشورہ دیا تو اورنگزیب نے اُسے غصے سے دیکھا۔ ''دوائیں دے تو رہے ہیں عمر کو۔ اور اُس کی دیکھ بھال میں کون سی کمی چھوڑی ہے ہم نے۔ ڈاکٹر کے پاس بھی لے گے تھے جو دوائیں ہم اُسے استعمال کرا رہے ہیں۔ ڈاکٹر کی ہی تجویز کردہ ہیں''۔

''مگر یہ کوئی مستقل حل یا علاج نہیں ہے''۔ ہارون زیب کی دلیل کافی مضبوط تھی۔

''اب ہم اُسے یہاں لے آئے ہیں حویلی میں اپنوں کے پاس رہے گا سب کو دیکھے گا تو اُس کے ذہن پہ اچھا اثر ہی پڑے گا۔ وہاں شہر میں کون تھا اس کا۔ یہاں ہم اُس کے بھائی ہیں، ہماری اولادیں ہیں بیویاں ہیں۔ سب اُس کی دیکھ بھال کریں گے۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا''۔ اورنگزیب کا انداز دوٹوک تھا۔ ہارون اور نوید بھی خاموش ہو گئے اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں چھڑ گئیں۔ سب کو عمر کا خیال اور اُس کی دیکھ بھال بھول گئی۔ وہ اب بھی آنکھیں موندیں دوائیوں کے زیرِ اثر گہری نیند میں تھا۔ اُس کے لیے یہ گہری نیند ہی بہتر تھی۔ بیدار ہوتا تو شاہ زیب کو ڈھونڈتا، اُس کی فون کال کا انتظار کرتا۔ اُسے دیوانہ وار آوازیں دیتا۔ کبھی مائرہ کو پکارتا اُس سے خود ہی پوچھتا شاہ زیب کا اور پھر خود کو خود ہی جواب دیتا۔ اُس کا ذہن ایک مخصوص ثانیے کی گرفت میں قید ہو گیا تھا۔ جب شاہ زیب سے اُس کی آخری بار بات ہوئی تھی اور شاہ زیب نے اس وعدے کے ساتھ فون بند کیا تھا کہ میں کل اسی وقت آپ کو پھر کال کروں گا۔ پھر نہ تو وہ دن آیا اور نہ اُس کی کال آئی۔ نہ عمر کی شاہ زیب سے بات ہوئی۔ پر عمر انتظار کے اُسی لمحے کا قیدی بن چکا تھا۔

جب سے عمر زیب کی ذہنی حالت ابتر ہوئی تھی۔ مائرہ ایک بار بھی اُن کا حال دیکھنے یا پوچھنے اُن کے پاس نہیں آئی تھی۔ اب تو وہ حویلی میں تھے تب بھی اُس نے یہ زحمت گوارا نہیں کی کہ عمر چچا کو ایک نظر دیکھ ہی لے۔ بے شک وہ نیم پاگل تھے سب اُن کے پاس جاتے ڈرتے تھے پر اکثر اوقات وہ دوائیوں کے زیرِ اثر سوئے رہتے۔ نیند کے عالم میں تو وہ بالکل بے ضرر تھے۔ تب بھی اُس نے دلچسپی نہیں لی۔ کبھی درکتا سے بھی نہیں پوچھا کہ عمر چچا کیسے ہیں۔ اُن کی حالت اب کیسی ہے۔ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں۔ وہ اپنی دنیا میں مگن تھی۔ زیادہ تر کمرے تک ہی محدود رہتی۔

شریفاں دائی وقتاً فوقتاً گھر آ کے معائنہ کر جاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ شریں پاس کے شہر سے لیڈی ڈاکٹر کو بلوا کے بھی معائنہ کرواتی۔ مائرہ کے معاملے میں وہ بہت حساس ہو رہی تھی۔

ساتھ وہ پہلی بار ماں بن رہی تھی بہت احتیاط اور دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ لاکھ وہ مائرہ کی دلجوئی کرتی خیال رکھتی مگر اُس کی تکلیف میں حصہ دار نہیں بن سکتی تھی۔ مائرہ اکیلے ہی سب برداشت کرتی۔

اُس کی زندگی پہ تو جیسے خزاں کا پہرا تھا۔ ہر چیز زرد اُداسی میں لپٹی نظر آتی۔ کہیں کوئی دلچسپی اور اُمید نہیں تھی سوائے ایک انتظار کے۔ اس انتظار نے اُسے باقی چیزوں اور رشتوں سے لاپروا کر دیا تھا۔ اُسے اپنے وجود میں سانس لیتی زندگی اور اُس زندگی کو دنیا میں لانے سے ذرہ بھر بھی دلچسپی نہیں تھی۔ بحالت مجبوری وہ اس بوجھ کو برداشت کر رہی تھی۔ جس نے اُس کی ساری اسمارٹ نیس کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ اُس کے پر کشش جسم کو بھدا اور بے ڈول بنا ڈالا تھا۔ نازک ہاتھ پاؤں کا حلیہ ہی بگڑ گیا تھا۔ وہ سوجنے کے بعد اتنے بدصورت اور عجیب سے لگتے اُسے۔ مائرہ نے تو آئینہ دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اُس کے دل میں اپنی بدصورتی کا خوف سا کنڈلی مارے بیٹھ گیا تھا کہ شاہ زیب کے آنے والے بچے نے اُس کی شکل کا بھی ستیاناس کر دیا ہو گا جس طرح باقی جسم کا کر دیا تھا۔ دن بہ دن وہ پھیلتی ہی جا رہی تھی۔ نازک کمر، کمر اور کولہے بھی بھاری ہو گے تھے۔ اُس نے اپنے اوپر توجہ دینا ہی چھوڑ دیا تھا۔

اس ہونے والے بچے کے لیے اُس کے دل اور محسوسات میں کوئی ممتا نہیں جاگی تھی۔ نہ کوئی خواہش اور اُمنگ تھی۔ جانے کب اس عذاب سے رہائی ملنا تھی وہ ایک ایک دن گن گن کے گزار رہی تھی۔

درکتا کو اُس کی بڑی فکر تھی۔ صبح و شام پوچھنے چلی آتی ''بھابھی آپ ٹھیک ہیں ناں اپنا خیال رکھا کریں۔ کھانا ڈٹ کے کھائیں، خوش رہیں''۔ وہ روز اسی طرح کے جملے بولتی۔ مائرہ کے لبوں پہ زہرخند مسکراہٹ آ جاتی۔ دل ہی دل میں جھنجھلاتی۔ پر زبان سے نہ بولتی۔ شریں نے اُن دونوں بہنوں کو سختی سے ہدایت دی تھی کہ درکتا کے ساتھ اپنا رویہ لب و لہجہ ٹھیک رکھو۔ مارے بندھے مائرہ اُس کے سوالوں کے جواب دیتی۔ پر سائرہ اُسے زیادہ لفٹ نہیں کراتی تھی۔ درکتا سے سامنا ہوتے ہی چھم سے اشعر لغاری اُس کی نگاہوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اتنا شاندار نوجوان، درکتا کا شوہر۔ ایسا اُس کا بھی تو ہونا چاہیے۔ بلکہ اُس کا بھی تو ہو سکتا ہے۔ اُس میں آخر کیا کمی ہے۔ اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے خوبصورت ہے، بااخلاق ہے۔ کپڑے اچھے پہنتی ہے اور کیا چاہیے بھلا کسی کو۔ اشعر لغاری دیکھنے میں کافی میچور اور درکتا سے بڑا تھا۔ سائرہ کے خیال میں یہ اُس کی خوبی تھی۔ درکتا اُسی کی ہم عمر ہی تھی تقریباً سو اُس کی جگہ وہ بھی تو ہو سکتی ہے۔ سائرہ کے دماغ میں آج کل ایسی ہی سوچیں پل رہی تھیں۔ جن کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ اُسے دوبارہ آرزو اور حسرت تھی۔ اشعر لغاری کو دیکھنے کی۔ اُس سے ملنے کی۔ بات کرنے کی۔ مگر گاؤں میں یہ کہاں ممکن تھا۔ اس لیے ہی سب اُسے یہاں لے آئے تھے۔ وہاں رہتی تو اشعر سے ملنے کی امید تو تھی۔ وہ انکل کا پوچھنے یا درکتا سے ملنے تو آتا ہی۔ وہ بھی اسی بہانے اُسے مل لیتی اور چند باتیں کر لیتی۔ ہو سکتا ہے فلموں اور کہانیوں کی طرح اس کی زندگی میں بھی کوئی انہونی ہو جاتی اور وہ اُسے پسند کر لیتا۔ درکتا سے علیحدگی اختیار کر لیتا۔ اور ساری دنیا سے لڑ کے اُسے اپنا لیتا۔ وہ کھلی آنکھوں سے یہ خواب دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری آج صبح سے ہی کچھ پریشان سے تھے۔ جانے کیوں رہ رہ کے خیال کی رو عمر زیب اور درکتا کی طرف بہہ رہی تھی۔ اُن کا کچھ اَتا پتہ نہیں تھا۔ آخری بار اورنگزیب سے انسلٹ کروانے کے بعد اُن کا جی چاہا ہی نہیں کہ پھر وہاں جایا جائے۔ دل مسوس کر رہ جاتے۔ اشعر وہاں گیا اور اُس نے بھی درکتا کے رویے کی شکایت کی۔ رویوں اور رشتوں میں ایک اَن دیکھی سی دراڑ آ گئی تھی۔ تعلق جامد سے محسوس ہو رہے تھے۔ گمان یقین میں بدل رہے تھے۔ وہ خود وہاں جا کے دیکھنا چا رہے تھے کہ اس نظر نہ آنے والی دوری اور دراڑ کی وجوہات کہاں تک ہیں۔ ان کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جی تو نہیں چا رہا تھا پر اب وہاں جانا ناگزیر تھا۔ اشعر کی منکوحہ اور اپنے دوست کی اُس گھر میں موجودگی سے وہاں سے اُن کا بڑے مضبوط تعلق کا حوالہ موجود تھا۔ اس سوچ کے ذہن میں آتے ہی وہ اپنے آپ میں توانائی محسوس کرنے لگے۔ اُمنگیں تازہ اور جوان محسوس ہونے لگیں۔ اشعر گھر آیا تو وہ تیار بیٹھے تھے۔ عمر زیب کی طرف جانے کے لیے۔ اُسے بھی فوری تیاری کا حکم ملا تو وہ انہیں دیکھ کے رہ گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا اُن کے کہنے کو ٹال نہیں سکتا تھا۔

کچھ منٹ میں ہی یونیفارم تبدیل کر کے اُن کے ساتھ ہو لیا۔

☆☆☆

عمر زیب کے پُرشکوہ گھر کے داخلی گیٹ پہ چوکیدار کی صورت میں بالکل اجنبی صورت متعین تھی۔ اشعر نے گیٹ پہ پہنچ کے ہارن دیا تو چھوٹا گیٹ کھول کے وہ اجنبی صورت چوکیدار باہر نکلا۔ اشعر کی گاڑی، مضبوط شخصیت اور ساتھ موجود پُروقار سے طاہر لغاری کو دیکھ کے وہ خاصا متاثر نظر آنے لگا اور جھٹ ہاتھ ماتھے تک لے جا کے سلام کیا۔

اشعر نے سلام کا جواب دے کے گھر کے مالکان کا پوچھا اُس نے دانستہ طور پہ عمر زیب کا نام نہیں لیا تھا۔ ''صاحب اندر ہیں آپ جائیں''۔ اُس نے دونوں پٹ کھول دیئے گیٹ کے۔ اور اُنہیں اندر داخل ہونے کا موقعہ دے کے خود کونے میں ہوگیا۔

اندر موجود ایک اور اجنبی ملازم صورت لڑکے نے اُن کی آمد کی اطلاع کر دی تھی۔ اورنگزیب اُن کے استقبال کے لیے خود موجود تھے۔ ''اسلام علیکم طاہر صاحب آج کیسے راستہ بھول پڑے ہیں آپ''۔ پھر اُنہوں نے باری باری دونوں سے زوردار قسم کا مصافحہ کیا۔ مگر ہاتھ کی گرفت کے برعکس اُس میں خلوص ناپید تھا۔ طاہر لغاری کی طرف دیکھتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ جس سے طاہر اپنے آپ میں بے چینی محسوس کرنے لگے۔ ''تشریف رکھیے''۔ اُنہوں نے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔ جب وہ بیٹھے گے تو وہی اجنبی ملازم جسے طاہر نے پہلے کبھی یہاں عمر کے گھر میں نہیں دیکھا تھا اورنگزیب کے پاس آ کے کھڑا ہوگیا۔ اُنہوں نے اُسے چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لانے کو کہا اور دوبارہ اُن دونوں کی طرف متوجہ ہوگے۔

''ہاں جی اب بتائیں کیسے آنا ہوا''۔ اُن کے لبوں پہ بڑی خوش اخلاق قسم کے میزبان والی مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ ''ہم عمر کو دیکھنے اور اُس کا پتہ کرنے آئے ہیں۔ ساتھ میں اپنی بہو سے بھی ملنا چاہ رہا تھا اس لیے سوچا کہ آج چکر لگا ہی لیا جائے''۔ طاہر لغاری کو ایسے محسوس ہوا کہ جیسے اورنگزیب اور ملازموں کے سوا گھر میں اس وقت کوئی بھی نہیں ہے۔ عورتوں والی مخصوص گہما گہمی بھی ناپید لگ رہی تھی۔ ''اوہو آپ کو بتانا یاد ہی نہیں رہا''۔ اورنگزیب سر پہ ہاتھ مار کے بولے تو طاہر لغاری کو لگا جیسے کوئی خاص بات ہو۔ وہ اضطراری انداز میں اُن کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اشعر ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ جیسے یہاں موجود ہی نہ ہو۔ ''عمر زیب تو ملک سے باہر ہے میں نے ڈاکٹر سے مشورے کے بعد اُسے امریکہ بھجوا دیا ہے۔ جہاں اُس کا علاج ہو رہا ہے۔ دریکتا بھی ساتھ ہے عمر کے''۔ اورنگزیب اُن کی سماعتوں پر بم گرا کے بالکل مطمئن تھے۔ ''کب گئے وہ دونوں مجھے بتایا کیوں نہیں''۔ طاہر لغاری صوفے سے کھڑے ہوگے۔ ''آپ بیٹھیں میں سب بتاتا ہوں۔ اصل میں عمر کی حالت کچھ زیادہ خراب ہوگی تھی۔ اسی وجہ سے جلدی جلدی میں سب کچھ ہوا۔ کسی کو بھی بتانے یا طلاع کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ میں اس پہ معذرت خواہ ہوں''۔ اورنگزیب کے چہرے پہ شرمندگی کا تاثر تھا۔ اس خبر نے اشعر کو بھی حیران کر دیا تھا۔ وہ بھی توجہ دینے پہ مجبور ہوگیا۔

طاہر لغاری خود کو تھکا تھکا سا محسوس کرنے لگے۔ ''اچھا مجھے دریکتا کا کوئی نمبر دے دیں تاکہ میں اُسے رابطہ کر کے پوچھ تو سکوں''۔ اُمید کی ایک کرن نظر آئی تھی۔

''اس کے لیے معذرت چاہوں گا۔ دریکتا کا آج صبح فون آیا تھا کہ ہاسپٹل میں اُس کا موبائل فون کہیں گر گیا ہے وہ جیسے ہی کوئی اور فون لے گی مجھے بتا دے گی۔ اُس نے جب مجھے بتایا میں فوراً آپ کو نمبر دوں گا آپ رابطہ کر لیجیے گا''۔ طاہر لغاری نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ اشعر اُنہیں دیکھ کے پریشان ہوگیا۔

''ٹیک اِٹ ایزی پپا''۔ وہ اُنہیں تسلی دینے لگا۔ وہ اُس کی طرف دیکھ کے پھیکے انداز میں مسکرائے اور اُٹھنے کا اشارہ کیا۔

اورنگزیب نے بہت زور مارا کہ کچھ دیر اور بیٹھیں گپ شپ کرتے ہیں۔ پر وہ نہیں مانے۔ گیٹ سے باہر آ کے انہوں نے چند لمبے لمبے سانس لیے۔ جیسے اُن کے وجود میں سخت گھٹن ہو اور وہ اُسے نکالنا چاہ رہے ہوں۔

''پپا آپ کو ایک دم سے کیا ہوگیا ہے''۔ اشعر نے پوچھا۔ ''بیٹا مجھے کوئی بات کھٹک رہی ہے''۔ ''عمر زیب دریکتا کے ساتھ باہر بھی چلا گیا اور ہمیں کوئی اطلاع دینا بھی گوارا نہیں کیا گیا۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے یہ سب جھوٹ ہے''۔ ''پپا آپ چھوٹی چھوٹی باتوں کو ذہن پہ سوار کر لیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے عمر انکل واقعی ملک سے باہر ہی ہوں''۔

وہ عام سے لہجے میں بولا۔ وہ اس وقت اُن کے ذہن کو سوچوں اور ٹینشن سے آزاد دیکھنا چاہ رہا تھا۔ اس لیے دانستہ طور پر ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔ پر طاہر چڑ سے گے۔ ''ہاں تمہیں کیوں فکر ہونے لگی۔ وہاں جا کے اجنبیوں کی طرح بیٹھے رہے کوئی بات تک نہیں کی۔ تمہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ عمر کے ساتھ تمہاری منکوحہ بھی تو ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں تمہیں کوئی احساس ہی نہیں ہے''۔ اُنہوں نے اُس کی کلاس لے ڈالی اشعر مسکرانے لگا۔ طاہر بے چین سے تھے۔ ''کمال ہے عمر میرا دوست امریکہ پہنچ گیا اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا''۔ ''آپ کے دوست کے ساتھ میری منکوحہ بھی تو ہے آپ بھول رہے ہیں''۔ اشعر نے شرارتی انداز میں یاددہانی کروائی تو وہ اُسے گھورنے لگے۔ اشعر نے ساری توجہ ڈرائیونگ پہ مرکوز کر دی۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر اس خاموشی کو طاہر نے ہی توڑا۔ ''گھر کے ملازم بھی نئے ہیں۔ یہ بھی قابل غور بات ہے''۔ ''پپا آپ مت فکر کریں عام سی باتوں کو خوامخواہ ذہن پہ سوار کر رہے ہیں۔ اہمیت دے رہے ہیں۔ اُن کی مرضی گھر کے مالک ہیں جس کو چاہیں رکھیں جس کو چاہیں نکالیں۔ یہ میرے اور آپ کے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ اُن کے گھر کا مسئلہ ہے۔ ہوسکتا ہے وہ نوکروں کی کارکردگی سے مطمئن نہ ہوں یا اُنہیں اچھے نوکر مل گے ہوں اور اُنہوں نے پرانے نوکروں کو نکال دیا ہوں۔ اور رہی بات عمر انکل کو علاج کی خاطر ملک سے باہر بھجوانے کی تو اس میں نہ پریشانی والی بات ہے اور نہ حیرانی والی۔ کیونکہ اورنگزیب انکل اور اُن کی وائف نے پہلے بھی کہا تھا کہ ہم عمر کو علاج کی خاطر ملک سے باہر بھی بھجوائیں گے اگر وہ یہاں سے ٹھیک نہ ہوئے تو۔ اور یہ ذہنی بیماریاں اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہوتی آپ کو پتہ ہی ہوگا۔

امریکہ میں دماغی امراض کے بہترین معالج موجود ہیں۔ سو عمر انکل کی فیملی نے اُن کو وہاں بھجوا دیا ہوگا۔ اور بات رہ جاتی ہے ہمیں نہ بتانے کی یا اطلاع نہ کرنے کی تو اس کی وجہ اُن کی گھریلو پریشانیاں بھی ہوسکتی ہیں۔ عمر انکل کے ساتھ جو حادثہ ہوا یہ اتنا جلدی بھولنے والا نہیں ہے۔ گھر کا ہر فرد پریشانی کا شکار ہوگا اس لیے اُن کے ذہن میں یہ بات رہی ہی نہیں ہوگی کہ ہمیں اطلاع کروائی جائے''۔ اُس نے اپنی طرف سے اُنہیں مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ پھر اُن کی سوئی ایک نقطے پہ اٹک گی۔ ''اچھا دریکتا تو مجھے بتا سکتی تھی یا فون ہی کر سکتی تھی''۔ ''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہمارا نمبر اُن کے پاس موجود ہی نہ ہو''۔ اشعر کے پاس ہر بات کا ریڈی میڈ جواب تیار تھا۔ طاہر لغاری خاموش ہی ہوگے۔

☆☆☆

اورنگزیب سر پکڑے بیٹھے تھے۔ اس بات کا اندازہ اُنہیں پہلے سے تھا کہ کیا کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ اس کے حل بھی اُنہوں نے کچھ نہ کچھ تیار کر لیے تھے۔ پر یہ پریشانیاں اور مشکلات اتنی جلدی سامنے آجائیں گیں اس کا اُنہیں بہرحال پتہ نہیں تھا۔ کسی نہ کسی سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔ اور یہ مشورہ شریں سے بڑھ کر کون دے سکتا تھا۔

اتنی جلدی طاہر لغاری اپنے بیٹے کے ساتھ پوچھنے چلا آئے گا یہ اُن کی سوچ میں بھی نہ تھا۔ دریکتا کے نمبر کا آج اُنہوں نے بہانہ کر کے ٹال دیا تھا مگر آئندہ کے لیے یہ بہانہ نہیں چل سکتا تھا۔

اس کا حل بھی موجود تھا۔ آئندہ کسی پریشانی کی صورت میں اُنہیں کیا کیا کرنا تھا۔ اُنہوں نے سوچ لیا تھا۔

☆☆☆

اورنگزیب ہارون اور عاشر کے سپرد اُس کی ذمہ داری چھوڑ کے خود ہنگامی طور پہ گاؤں آ گئے تھے۔ شریں کو کچھ چیزوں اور واقعات کے بارے میں بتانا ضروری تھا۔ نوید بھی گاؤں میں تھا۔ اُسے دفتری معاملات سے اُلجھن سی ہونے لگی تھی ساتھ وہ اُکتا گیا تھا۔ اتنا لمبا انتظار اُس کے بس سے باہر تھا۔ اورنگزیب کی پلاننگ اُس کی عقل سے بعید تھی۔ وہ گاؤں میں اپنی چوہدراہٹ اور ٹور میں خوش تھا۔ ہارون فی الحال کسی اُمید میں اورنگزیب بھائی کے ساتھ ہی تھا۔

☆☆☆

گاؤں آئے ہوئے اُنہیں تین ہفتے سے زائد ہو گئے تھے۔ عمر زیب کی حالت میں کوئی بہتری دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ دریکتا کی تعلیم کا حرج ہو رہا تھا۔ اُس کی اُسے اتنی فکر نہیں تھی جتنی اپنے پپا کی تھی۔ اورنگزیب تایا تو اپنے ڈاکٹر دوست کے بلند و بالا دعوؤں کے ہمراہ عمر زیب کو گاؤں لے کے آئے تھے کہ یہاں کے ماحول میں رہ کے اس کی ذہنی حالت رفتہ رفتہ سنبھل جائے گی اور اس کا واحد علاج ہی یہی ہے۔ اُن کی ذہنی حالت کیا سنبھلنی تھی۔ چوبیس گھنٹے ایک کمرے میں بند اکثر اوقات مدہوشی کی حالت میں رہتے۔ کھانا بھی مشکل سے کھاتے۔ کوئی آ کے دیکھتا تک نہ تھا۔ ہاں نوید چچا کھڑے کھڑے پوچھتے کہ کیسی طبیعت ہے اب عمر بھائی کی۔ باقی کسی کے پاس شاید اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ شریں تائی بھی ادھر کا رُخ نہیں کرتی تھی۔ ہاں دریکتا پہ نظر پڑتی تو اُنہیں دھیان آتا کہ عمر زیب کا بھی پوچھ لینا چاہیے۔ سائرہ بھابھی، سائرہ یا باقی دونوں چچا کی اولادوں کو اپنے عمر چچا سے ایسی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے بھی ایک بیمار نیم پاگل شخص کی اُن کے نزدیک ایسی کوئی اہمیت بھی نہیں تھی۔ جو دن رات اُن کی پٹی سے لگے بیٹھے رہتے۔ لے دے کے دریکتا ہی تھی جو باپ کو دیکھ دیکھ کے جلتی تڑپتی۔ اُس کا سیل فون پر اسرار طور پہ اُس کے بیگ سے غائب ہو گیا تھا۔ اُس نے بھی زیادہ دھیان نہیں دیا۔ مگر اُس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ایک نیا موبائل فون خریدا جائے۔ کبھی کبھی اُسے کسی ہمدرد کی سخت ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنے دکھوں اور آنسوؤں کو اندر سمونے کا ہنر جانتی تھی۔ سو کبھی دوستوں سے بھی کھل کے بات نہیں کرتی تھی۔ یہ عادت اب پختہ ہو چکی تھی۔ لیکن احساس ہو رہا تھا اُسے کہ مجھے کسی سے بات کرنی چاہیے۔ یہ احساس ہوتے ہی اُسے طاہر انکل یاد آ گئے۔ وہ پپا کے مخلص اور قریبی دوست تھے۔ دریکتا کو اُن کے آنے سے پپا کی خیر خبر لینے سے بڑی ڈھارس ملتی تھی۔ لیکن اُنہوں نے بھی اچانک آنا جانا ختم کر دیا تھا۔ پھر ایک دن اُن کا وہ مغرور سا بیٹا آیا اور اُسے کچھ عجیب سی باتیں سنا کے چلا گیا۔ پھر ایک لمبی خاموشی تھی۔ کوئی بھی نہیں آیا۔ وہ طاہر انکل سے دل ہی دل میں شکوہ کناں تھی۔ اُنہیں خبر تو لینی چاہیے تھی۔ بے شک پپا اپنے حواس میں نہیں تھے پر وہ تو ٹھیک تھے تندرست تھے۔ اُن کے گاؤں آنے سے پہلے بھی پپا کا پوچھنے نہیں آئے۔

اب تو گاؤں آئے ہوئے بھی اتنے دن ہو گئے تھے۔ اُن کا کوئی اَتا پتہ ہی نہیں تھا۔ نہ ہی تایا نے کوئی ذکر کیا تھا۔ دریکتا کے دل میں تھا کہ ہو سکتا ہے اُن کی غیر موجودگی میں طاہر انکل پوچھنے آئے ہوں۔ اگر یہ بات ہوتی تو تایا ضرور اُسے بتاتے۔ اُسے رونا آنے لگا۔ پپا نے کتنے چاؤ سے طاہر انکل کے بیٹے کے ساتھ اُس کا نکاح کیا تھا۔ اُس شخص نے اُسے ایک بار بھی نہیں پوچھا تھا۔ اُس کی زندگی کتنی مشکلات اور پریشانیوں کا شکار تھی۔ وہ اکیلی ہی سب کچھ سہہ رہی تھی صبر کر رہی تھی۔ کیا فائدہ تھا اس نام نہاد بندھن کا جب اُس شخص نے اُس کے اور اپنے مابین رشتے کی نزاکت کو محسوس نہیں کیا تھا۔ ٹھیک ہے رخصتی نہیں ہوئی تھی ابھی پر وہ اُس کی منکوحہ تو تھی۔ اُس کی ان حالات میں خبر گیری کرنا اشعر کا فرض بنتا تھا۔ اور وہ شخص اپنے اس فرض سے ہی غافل تھا۔ دریکتا کو اُس کے ساتھ اپنا وہ تصادم یاد آیا تو ایک تلخ سی مسکراہٹ لبوں پہ آ کے دم توڑ گئی۔

☆☆☆

اورنگزیب شریں کو آہستہ آہستہ کچھ بتا رہے تھے جب دریکتا اُن کے پاس آئی۔ نوکرانی کی زبانی اُسے تایا کی آمد کا پتہ چلا تھا اور وہ چلی آئی تھی۔ دریکتا کو دیکھتے ہی انہوں نے شریں سے بات چیت کا سلسلہ موقوف کر دیا اور اُس کی طرف متوجہ ہو گئے جو مضطرب سی لگ رہی تھی۔ وہ سلام کر کے بیٹھ گئی۔ ''کیا بات ہے پریشان لگ رہی ہو''۔ اورنگزیب اُس کی اندرونی کیفیت تاڑ گئے تھے۔ ''نہیں تایا جان پریشان تو نہیں ہوں''۔ اُس نے ہنستے ہوئے تردید کی۔ ''پھر کیا بات ہے تمہارا چہرا بتا رہا ہے کہ کسی کشمکش میں ہو''۔

وہ چہرا پڑھنے کے فن سے آشنا تھے۔ اُس کی بات پہ یقین نہیں کیا تھا۔ ''تایا جان مجھے ایک سیل فون کی ضرورت ہے''۔ اُسے یاد آ گیا کہ اُس کا سیل فون کہیں گم ہو گیا ہے۔ ''یہ لو میرا لے لو میں اور خرید لوں گا بلکہ میرے پاس ایک اور فون موجود ہے''۔ اُنہوں نے ہاتھ میں پکڑا موبائل فون اُس کی طرف بڑھا دیا۔ ''نہیں تایا جان یہ آپ خود استعمال کریں کیونکہ میرے پاس سم بھی نہیں ہے کیونکہ میرا فون خود ہی کہیں غائب ہو گیا ہے''۔

''اچھا چلو تمہیں صبح ہی نیا فون اور سم مل جائے گی''۔ وہ شاہانہ انداز میں بولے۔ دریکتا طاہر انکل کے بارے میں معلوم کرتے ہوئے ہچکچک سی گئی۔ ''تایا جان ہمارے گاؤں آنے کے بعد طاہر انکل یا اُن کے گھر میں سے کوئی پپا کا پوچھنے تو نہیں آیا''۔ اُس نے تایا اورنگزیب سے نظریں ملانے سے گریز برتا تھا۔ شریں نے آنکھوں آنکھوں میں اورنگزیب کو اشارہ کیا۔ ''کوئی بھی نہیں آیا۔ میں خود اتنا حیران ہوں کہ عمر کا یہ دوست بڑے بڑے دعوے کرتا تھا۔ عمر کے ساتھ دوستی کا دم بھرتا تھا اور جب سے عمر کا یہ حال ہوا۔ چند بار کے علاوہ اُسے پوچھنے بھی نہیں آیا۔ چند دن پہلے دفتری سلسلے میں ایک تقریب ہوئی وہاں ''تمہارے پپا'' کا یہ دوست طاہر لغاری بھی آیا ہوا تھا۔ مجھ پہ نظر پڑی تو رُخ موڑ لیا۔ میں خود اُٹھ کے قریب گیا سلام دعا کی۔ تو بڑے روکھے پھیکے انداز میں سلام کا جواب دیا۔ میں نے خود ہی عمر کے بارے میں بتایا۔ آگے سے وہ کچھ نہیں بولا۔ بلکہ عمر کو گاؤں لانے سے پہلے میں نے گھر جا کے بتایا تھا کہ ہم اُسے گاؤں لے کے جا رہے ہیں۔ تب بھی اُس نے کچھ نہیں پوچھا۔ سچ پوچھو تو طاہر لغاری اور اُس کے بیٹے اشعر کے رویے سے مجھے بہت دکھ ہوا۔ عمر کو بہت جلدی تھی ان لوگوں سے رشتہ جوڑنے کی۔ میں بہت حیران ہوں کہ اتنی جلدی یہ لوگ بدل گئے ہیں۔ ابھی تو صرف عمر نے نکاح کیا تھا بیٹی کا اگر رخصتی کر دیتا تو جانے کیا ہوتا۔ خیر میں جاؤں گا طاہر کے گھر اور اُسے پوچھوں گا اُس کی بیگانگی اور سرد مہری کا سبب۔ ہم نے بیٹی دی ہوئی ہے کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ طاہر کو اس رشتے کا تو احساس کرنا چاہیے''۔ ''ایک لحاظ سے وہ بھی تو اپنی جگہ ٹھیک ہے''۔ شریں بلا کے سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''دریکتا کے ساتھ ساتھ اورنگزیب بھی چونک گئے''۔

''تم کس طرح کہہ سکتی ہو کہ طاہر لغاری اپنی جگہ ٹھیک ہے''۔ اورنگزیب نے پوچھا۔ ''عمر بھائی کا یہ دوست اکڑ رہا ہے۔ کیونکہ یہ بات آپ کے علم میں ہے ناں کہ عمر بھائی نے خود منتیں کر کے طاہر لغاری سے نکاح کے لیے کہا تھا۔ مارے باندھے منگنی تو کر لی تھی اُنہوں نے یا عمر بھائی نے جب دریکتا سے نکاح کے لیے خود سے اصرار کیا تو طاہر بھائی نے بیٹے سے کہا۔ دریکتا کے مستقبل کے ساتھ اُنہیں بہت ساری جائیداد اور فوائد نظر آ رہے تھے سو اشعر نے بھی نکاح کر لیا''۔

دریکتا ہراساں نگاہوں سے کبھی شریں تائی اور کبھی تایا اورنگزیب کو دیکھ رہی تھی۔ ان انکشافات نے اُس کے پاؤں تلے

سے زمین ہی سرکا دی تھی۔ کہ یہ نکاح پپا کے منتیں کرنے سے واسطے ترلے کرنے سے ہوا ہے۔ اُسے مجبوری کے عالم میں گلے میں طوق بنا کے ڈالا گیا ہے۔ کیا وہ اتنی گئی گزری تھی۔ پپا کو ان کی منت کرنی پڑی۔ کیا وہ شکل وصورت میں کم تھی یا اُس کے کریکٹر میں کوئی خرابی تھی جو پپا کو اُن لوگوں کی منتیں کرنی پڑیں کہ خدارا میری بیٹی کو اپنا لو۔ کیوں کیا اُس کے لیے کوئی رشتوں کی کمی تھی۔ وہ لولی لنگڑی تھی یا پھر ساری دنیا میں لڑکے ناپید ہو گئے تھے۔ اُس کے نسوانی پندار کا شیشہ بُری طرح چکنا چور ہوا تھا سارا نسوانی غرور قدموں تلے روندا گیا تھا۔ عورت کا غرور ہی اسی بات میں پوشیدہ ہوتا ہے کہ وہ من چاہی ہے اُسے اپنایا گیا ہے نہ کہ بھیک اور خیرات کی طرح قبول کیا گیا ہے۔ اُس کا یہ غرور ہی ٹوٹ گیا تھا۔ کاش کہ شریں تائی یہ منحوس بات اُسے نہ بتاتی۔ اپنے دل میں ہی رکھتی۔ کم سے کم وہ اتنا دکھی تو نہ ہوتی۔ اتنی توہین اور کم مائیگی کا احساس تو نہ ہوتا۔ کاش وہ پپا سے جواب طلب کر سکتی۔ اُن سے پوچھ سکتی کہ پپا آپ نے خیرات کی طرح کیوں مجھے اُن کی جھولی میں ڈالا۔ جیسے میں بوجھ تھی۔ آپ نے زبردستی طاہر انکل کے بیٹے کے سر مجھے منڈھ دیا۔

اُس کے کانوں میں شریں تائی کی تکلیف دہ آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ ''طاہر لغاری خود اب کہتا ہوگا کہ عمر نے مجھے زبردستی گھر بلا کے اپنی بیٹی دی ہے۔ ارے ہم نے بھی مائرہ کا رشتہ دیا تھا عمر کو۔ مگر اچھی طرح غور کرنے کے بعد۔ حالانکہ شاہ زیب کوئی غیر نہیں تھا۔ اور ایک عمر بھائی ہیں خود بول کے بیٹی دی۔ اس طرح خود اپنے منہ سے بیٹی کے رشتے کے لیے کہا جائے تو سامنے والا بندا بھی سوچتا ہوگا کہ بیٹی میں کوئی عیب ہوگا جب ہی سر سے بوجھ کی اُتاری ہے۔ اسی وجہ سے تو طاہر اکڑ رہا ہے''۔ دریکتا کا دل چاہ رہا تھا یہاں سے اُٹھ کے بھاگ جائے۔ ''ہاں نیک بخت تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ سامنے کی بات مجھے نظر ہی نہیں آئی۔ اسی وجہ سے طاہر کا رویہ تکلیف دہ حد تک اجنبیوں کی طرح ہے۔ پر تم نے دریکتا کے سامنے یہ ذکر چھیڑ کے اچھا نہیں کیا۔ اب دیکھو یہ کتنی پریشان ہو گی ہے''۔ اورنگزیب نے شریں کو گھورا تو اُس نے جھٹ دریکتا کو سینے سے لگایا۔ ''ٹھیک ہی تو کہتی ہوں میرے دل میں کتنی آرزو تھی کہ اسے اپنے عاشر کی دولہن بناؤں۔ عمر بھائی کی کتنی منتیں کیں پر نہیں مانے''۔ دریکتا نے ذرا سی ہمدردی پاتے ہی رونا شروع کر دیا۔ کتنے دن کے رُکے ہوئے آنسو تھے وہ دل کے زہر کو آنکھوں کے راستے بہا رہی تھی۔ شریں ہولے ہولے سے اُسے سہلا رہی تھی۔ چپ کروا رہی تھی۔ پر یہ ملال دریکتا کے دل سے ختم ہونے والا نہیں تھا کہ پپا نے خود سے بول کے طاہر انکل کو رشتے کے لیے کہا اور پھر نکاح کے لیے منتیں کیں۔ اسی وجہ سے افراتفری میں اتنی جلدی اُس کا نکاح ہوا تھا۔ ایک ایک کر کے وہ باتیں پوری جزئیات کے ساتھ یاد آ رہی تھی۔

''خیر بیٹا دل چھوٹا نہ کرو میں طاہر کے گھر جاؤں گا اُسے پوچھوں گا۔ ہم کوئی ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں جو وہ اتنی بیگانگی اور اکڑ دکھا رہا ہے۔ اُس کا رویہ ظاہر تو یہی کر رہا ہے کہ جیسے وہ اس رشتے کو قائم رکھنا نہ چاہ رہا ہو''۔

تایا اورنگزیب نے یہ حوصلہ دیا اور ساتھ ہی ایک نئے امکان کی طرف بھی اشارہ کیا۔ ''ارے نہیں قائم رکھنا چاہتا تو نہ رکھے۔ ہماری بیٹی کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ میں تو اپنے عاشر کی دلہن بناؤں گی اسے''۔ وہ پیار بھری نگاہوں سے نثار ہونے والے انداز سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ دریکتا اب بھی ہولے ہولے رو رہی تھی۔ وہ اپنے زیاں پہ ماتم کناں تھی۔ تائی شریں کے ارادوں پہ دھیان نہیں دے پائی تھی۔ نہ اس وقت اُسے اتنا ہوش تھا۔ وہ بات بھی ذہن سے نکل گی تھی جس کی خاطر وہ تایا کے پاس آئی تھی۔ وہ اُنہیں یہ کہنے آئی تھی کہ میں پپا کو لے کے شہر اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ میری تعلیم کا حرج ہو رہا ہے۔ پر حالات ایسے ہوئے کہ یہ بات اُسے بھول ہی گئی۔ وہ جہاں سے چلی تھی وہیں کی وہیں کھڑی تھی۔

☆☆☆

''کیا یہ سب ممکن ہوگا جو آپ سوچ رہے ہیں''۔ شریں نے سوچ میں ڈوبے اورنگزیب سے پوچھا تو وہ چونک گے۔ ''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ میں پہلے سیدھے طریقے سے جا کے بات کروں گا خود طاہر لغاری کے گھر جا کے۔ کہہ دوں گا کہ دریکتا اس رشتے کو برقرار نہیں رکھنا چاہتی۔ میرا نہیں خیال کہ اس بات کے بعد وہ انکار کریں گے''۔ ''پھر بھی اگر وہ نہ مانے تو......آپ کیا کریں گے''۔ ''ایک اور حل بھی ہے ناں میرے پاس''۔ وہ چٹکی بجا کے بولے۔ ''وہ کون سا حل ہے مجھے بھی تو بتائیں''۔ شریں کے چہرے پہ دبا دبا تجسس تھا۔ ''اس کام کے لیے عدالت ہے ناں میں دریکتا کی طرف سے خلع کا مقدمہ کر دوں گا۔ طاہر لغاری بہت عزت دار خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنی عزت بچانے کی خاطر خلع دے دے گا۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ عدالت میں جانے کی نوبت آئے۔ کیونکہ عزت داروں کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہوتا ہے۔ جب گھر کی باتیں عدالتوں میں اچھالی جائیں۔ طاہر لغاری کو عدالت کی دھمکی ہی کافی ہوگی۔ معاملہ عدالت کے باہر ہی نمٹ جائے گا''۔ اورنگزیب انسانی نفسیات کی کمزوریوں سے خوف واقف تھے۔ اُنہیں اتفاقاً ہی ایک ذریعے سے یہ بات پتہ چلی تھی کہ عمر زیب نے طاہر لغاری سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا۔ پھر اُس کے ذہن نے دو اور دو چار کے فلسفے پہ بہت کچھ خود تیار کر لیا تھا۔

''اچھا طاہر لغاری مان جائے گا پر اشعر لغاری کا کیا ہوگا۔ وہ دیکھنے میں ہی کسی اور طرح کا نظر آتا ہے''۔

''تم دیکھتی جاؤ۔ طاہر لغاری بیٹے کو خود راضی کر لے گا خلع کے لیے''۔ اورنگزیب کو بڑی امید تھی اُس کی امید بے جا بھی نہیں تھی۔

''میں پھر اپنے عاشر سے دریکتا کا بیاہ کروں گی جب ساری مشکلات اور رکاوٹیں دور ہو جائیں گی''۔ ''ارے آہستہ بول کسی اور نے سن لیا تو اچھا نہیں ہوگا''۔

اورنگزیب نے شریں کے لبوں پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں کسی سے ڈرتی ہوں۔ کسی نے سننا ہے تو سن لے''۔ ''کیوں بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو تم''۔ اورنگزیب نے غصے سے کہا تو شریں خاموش ہو گی۔

☆☆☆

عمر زیب حسب معمول دواؤں کے زیر اثر سو رہے تھے۔ یہاں دریکتا کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا وہ گھٹ گھٹ کے رو رہی تھی کہ آواز کمرے سے باہر نہ جائے۔ ''عمر کے سوئے ہوئے بے خبر چہرے کی طرف تکتے تکتے اُس نے کتنے شکوے کر ڈالے تھے۔ وہ ٹھیک ہوتے تو وہ اپنے سوالوں کے جواب حاصل کر کے رہتی۔ جو حقیقت نے اُس کے دماغ میں پیدا کر دیئے تھے۔ بڑی دیر بعد خود بہ خود ہی آنسو تھم گے۔ بظاہر اتنے مخلص اور مہربان نظر آنے والے طاہر انکل کی سرد مہری کی وجہ پپا کا فیصلہ تھا۔ اس سوچ نے اُس کے اندر خود سے نفرت اور بے زاری پیدا کر دی تھی۔

☆☆☆

شریں کا رویہ کافی حد تک بدل چکا تھا۔ وہ پہلے والی لاپروائی اُس نے اپنے وجود سے الگ کر دی تھی۔ دریکتا خوش تھی۔ ''تائی میں شہر اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ پپا کے ساتھ۔ میری تعلیم کا حرج ہو رہا ہے''۔ تائی شریں اُس کے کمرے میں اُس کے پاس بیٹھی تھی۔ دریکتا نے آخر کار بول ہی دیا۔ وہ چند ثانیے بالکل خاموشی سے زمین کی طرف دیکھتی

رہی۔ جیسے اس کشمکش میں ہو کہ کیا بولے کیا نہ بولے۔ ''میں نے تمہیں بتانا تو نہیں تھا کہ تم پریشان ہو جاؤ گی مگر تمہاری [illegible] سے مجبور ہو کر بتا رہی ہوں...... وہ اس کے بعد خاموش ہو گی''۔

دریکتا نے بے تابی سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے تائی آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ رُک کیوں گی ہیں''۔ ''رُک اس لیے گئی ہوں کہ نہ جانے تم میں سننے کا حوصلہ ہے بھی کہ نہیں''۔

وہ پھر کہتے کہتے رُک گی تو دریکتا بے قرار ہو گی۔ ''پلیز تائی مجھے بتائیں کیا بات ہے''۔

''تو سنو طاہر لغاری کے بیٹے اشعر لغاری نے شہر تمہارے گھر پہ فائرنگ کروائی ہے۔''

''تمہارے تایا اُن کے گھر گئے تھے کہ آپ لوگ بھول ہی گئے ہیں۔ رشتوں کی نزاکت کو۔ وہاں تھوڑی تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی۔ جس کے بعد انتقامی طور پہ اُس نے فائرنگ کروائی۔ شکر ہے کہ گھر میں ملازموں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ورنہ میرے سہاگ کو کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی......؟''

''خیر اس کے بعد بھی اگر تم اپنے گھر جانا چاہتی ہو تو جاؤ۔ میں خود تمہیں اور عمر بھائی کو بھجوا دوں گی۔ اورنگزیب تو وقتاً فوقتاً تمہاری خبر گیری کرتے رہیں گے۔ پھر تم خود ہی سنبھالنا سب کچھ۔ کیونکہ مجھے اپنے بیٹے اور سہاگ کی ضرورت ہے اُن کی سلامتی عزیز ہے۔ میں اُنہیں اس آگ میں کودنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ جو عمر بھائی کی بے وقوفی کی وجہ سے لگی ہے''۔ شریں غصے میں تھی۔ دریکتا وہیں سن سی ہو گئی۔ اُف یہ کیا کچھ ہو رہا تھا۔ تو کیا شہرا اُسے پپا کے ساتھ نوکروں کے رحم و کرم پہ اکیلا رہنا پڑے گا جو تائی خبر گیری کی بات کر رہی تھی۔

''میں تمہیں یہ سب بتا کے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پر تم شہرا اپنے گھر جانے کی ضد کر رہی ہو تو تب تمہیں بتایا ہے۔ میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گی۔ جب کہو گی۔''

''نہیں تائی اب اس کی ضرورت نہیں ہے''۔ اُس نے تیزی سے حوصلوں کی گرتی دیوار کو تھامنے کی آخری کوشش کی۔ شریں کا چہرا یکدم پُرسکون ہو گیا۔ وہ دریکتا کے سوچ میں ڈوبے چہرے کو دیکھتے ہوئے کوئی حساب لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری نے اپنے طور پہ عمر کے حلقہ احباب سے پتہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ کب امریکہ گیا ہے۔ اُسے اُس وقت سخت حیرت ہوئی کہ اُس کی طرح باقی لوگ بھی عمر زیب کی امریکہ روانگی سے لاعلم تھے۔ آخر عمر کو اتنے رازدارانہ طریقے سے امریکہ بھجوانے کی کیا وجہ تھی؟ طاہر لغاری کی توجہ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی طرف تھی۔ اُس کے ذہن میں سیدھی سیدھی ایک ہی بات آ رہی تھی کہ عمر اور دریکتا کسی سازش کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس سے آگے وہ کوئی بھی منفی خیال دل میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ جانے طاہر لغاری کے جی میں کیا سمائی کہ اشعر کے آفس پہنچ گیا۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ اُنہیں یہاں اپنے آفس میں دیکھ کر اُسے حیرانی ہوئی کیونکہ اس سے پہلے وہ یہاں ایک بار بھی نہیں آئے تھے۔ وہ اپنی سیٹ سے [illegible] گیا اور ٹیبل کے پیچھے سے باہر آ گیا۔ ''خیریت پپا آپ اور یہاں''۔

طاہر لغاری کوئی اور وقت ہوتا تو اُس کی حیرت سے لطف اندوز ہوتے۔ پر ابھی پریشانی سے مسکرا دیئے۔ بے جان مسکراہٹ۔ ''ہاں خیریت ہی ہے بس آج میں نے عمر کے ملنے جلنے والوں سے پوچھا کہ وہ کب امریکہ گیا۔ سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں اس وجہ سے تمہارے پاس آیا ہوں''۔ ''میرے پاس اس وجہ سے کیا مطلب''؟ ''تم [illegible]

کا پتہ چلاؤ''۔ وہ جھنجلا سے گئے تو اشعر اُنہیں دیکھ کر رہ گیا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ عمر زیب اور دریکتا کے بارے میں ہم سے جھوٹ بولا جا رہا ہو۔ کچھ چھپایا جا رہا ہو۔ سازش ہے یہ عمر کے بھائیوں کی۔ وہ مجھے بتاتا رہتا تھا اپنے خاندان اور بھائیوں کے بارے میں۔ عمر اور اُس کی اولاد سے زیادہ اُنہیں عمر کی جائیداد اور بینک بیلنس سے زیادہ دلچسپی ہے۔ شاہ زیب کی شادی اور الگ گھر میں شفٹ ہونے کے بعد، اورنگزیب اور اُس کے بیٹے نے شاہ زیب کے کاروبار میں مداخلت شروع کر دی اور چند ماہ میں ہی سب کچھ ختم کر کے رکھ دیا۔ کاروبار کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ اب اُن کی نگاہیں عمر کے کاروبار کی طرف لگی ہوں گی۔ عمر ایک نیم پاگل بیٹے کے غم میں دیوانہ باپ۔ اُسے کیا پتہ کہ اُس کے گرد کیا ہو رہا ہے۔ اورنگزیب اور اُس کے دونوں بھائی عمر کی فیکٹری اور آفس میں ہی ہوتے ہیں۔

باقی رہ گئی دریکتا وہ ٹھہری ایک کمزور اور نازک سی لڑکی۔ دنیا کی چالبازیوں اور مکاریوں کا اُسے کیا پتہ۔ سو عمر کے رشتہ داروں کی بن آئی ہے۔ اپنے فائدے کے لیے اُن باپ بیٹی کو غائب کروا دیا ہے''۔

بولتے بولتے طاہر ہانپنے لگے تو اشعر نے شانے پہ دباؤ ڈال کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''اشعر تم کچھ کرو۔ عمر زیب میرا دوست ہے۔ اُس کی مدد کرنا میرا فرض بنتا ہے''۔ وہ لجاجت سے بولے۔ اشعر کچھ سوچ رہا تھا۔ ''ٹھیک ہے آپ گھر جائیں میں کرتا ہوں کچھ۔ آپ زیادہ پریشان مت ہوں''۔ اُس نے طاہر لغاری کو گھر بھجوا دیا۔ اور خود اپنے ماتحتوں کو بتا کے عمر زیب کے آفس پہنچ گیا۔

وہ پہلی بار یہاں آیا تھا۔ بڑا شاندار ویل ڈیکوریٹڈ آفس تھا۔ دل ہی دل میں اُس نے سراہا۔ اورنگزیب اور ہارون زیب دونوں بھائی اُدھر بیٹھے تھے۔ اورنگزیب کے ذہن میں اشعر کو دیکھتے ہی خطرے کی گھنٹی بجی۔ اُس نے اندرونی خوف پہ بڑی تیزی سے قابو پایا۔ اور اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ''آیئے سر کیسے آنا ہوا''۔ لہجہ اُس کا طنزیہ ہی تھا۔ اشعر نے نظر انداز کر دیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بجائے ڈائریکٹ دریکتا کے بارے میں پوچھا۔ ''مجھے اپنی منکوحہ سے بات کرنی ہے مجھے اُن کا کونٹیکٹ نمبر چاہیے''۔ ''اوہ ضرور بات کریں۔ لیں ابھی بات کریں''۔ اورنگزیب نے اُسے نمبر بتانے کے بجائے اپنا سیل فون نکال کر کوئی نمبر ملانا شروع کر دیا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ ''دریکتا بیٹا میں ہوں اورنگزیب، ہاں خیریت ہی ہے یہ اپنے اشعر لغاری صاحب تم سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ اُنہیں شائد کوئی شک ہے ہم پہ۔ تم انہیں بتا دو اپنے بارے میں کہ تم اور عمر بالکل خیریت سے ہو''۔ اورنگزیب نے فون کا اسپیکر آن کیا ہوا تھا۔ ایک ایک لفظ اشعر کی سماعتوں نے صاف طور پہ سنا تھا۔ ''مجھے اُن سے کوئی بات نہیں کرنی۔ اُنہیں بتا دیں۔ میں اس وقت پپا کے پاس ہوں''۔ اورنگزیب نے فاتحانہ نگاہوں سے اشعر کی طرف دیکھا۔ جس نے اپنا غصہ چھپا لیا تھا۔ ''یہ بات تم خود کہہ دو آفیسر سے''۔ اورنگزیب نے طنزیہ انداز میں سیل فون اشعر کی طرف بڑھایا۔ اُس نے کان سے لگایا اور اُس سے پہلے اسپیکر آف کیا۔ ''دریکتا میں اشعر لغاری بات کر رہا ہوں۔ پپا کچھ پریشان سے ہیں سو اس......'' اس سے پہلے کہ وہ بات پوری کرتا۔ دریکتا نے بولنا شروع کر دیا۔ ''میں نے آپ سے یا انکل سے کوئی بات نہیں کرنی۔ آئندہ مجھے کال کرنے کی زحمت مت کیجیے گا۔ مہربانی ہو گی آپ کی۔ اور انکل کو شکریہ بول دیجیے گا کہ وہ ہماری خاطر اتنا پریشان ہوئے''۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گی۔ اشعر کا جی چاہ رہا تھا کہ فون دیوار پہ دے مارے اتنی انسلٹ جیسے وہ کوئی گرا پڑا انسان ہو۔ اُس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ پپا خواہ مخواہ اُن کی خاطر اتنا پریشان ہو رہے تھے۔ جبکہ اُن محترمہ کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ کسی کی پریشانی کی فکر ہی نہیں تھی۔ اشعر اُسے لاپروا اور عام سی لڑکی تصور کرتا آیا تھا۔ پر یہ تو کچھ اور ہی نکلی تھی۔

''خیر دیکھ لیں گے محترمہ دریکتا صاحبہ آپ کو بھی''۔ وہ دل میں بولا تھا۔ ساتھ ہی سیل فون واپس اورنگزیب کی طرف بڑھایا۔ ''نمبر نوٹ کرلیں دریکتا کا۔ وہ پاکستان آئی ہوئی ہے عمر کے ساتھ۔ ہوسکتا ہے تھوڑے دن تک پھر جائے''۔ اُنہوں نے اس بار بڑے نارمل طریقے سے یہ جملے ادا کیے تھے۔ ''نہیں مجھے نمبر کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر کبھی۔ خیر چلتا ہوں''۔ اشعر آفس سے باہر آگیا۔ اپنے آفس روانگی سے پہلے اُس نے وہیں کھڑے کھڑے طاہر لغاری کو کال کی اور دریکتا سے ہونے والی گفتگو کا احوال بتایا۔ مگر اصل باتیں گول کر گیا بس اتنا کہا کہ عمر انکل اور دریکتا بالکل ٹھیک ہیں۔ وہ یہ بات بھی چھپا گیا کہ دریکتا اور عمر انکل پاکستان آگئے ہیں۔ طاہر اب خوش اور مطمئن تھے۔ اور اپنے بے جا خدشات پہ مسکرا رہے تھے۔

طاہر خوش تھے پر اشعر ایک ان دیکھی سی آگ میں سُلگ رہا تھا۔ پپا کو اصل بات بتا کر وہ پریشان نہیں کرنا چا رہا تھا۔ خود ہی سب کچھ دیکھنا معلوم کرنا تھا۔ دریکتا نے آئندہ کال کرنے بات کرنے سے منع کر دیا تھا پر اب اُس پہ ضد سوار ہوگئی تھی اَنا پرستی ہاتھ باندھ کے سر جھکا کے کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ اس بات کو پینے والا نہیں تھا۔ نہ برداشت کرنے والا تھا۔ طاہر لغاری نے عمر زیب کی مجبوریوں اور اُن کے رشتہ داریوں کو سوال بنا کے اُسے اپنے بیٹے کو بلیک میل کیا جذباتی طور پہ۔ اپنے بیٹے کو دوست کی مجبوریوں پہ قربان کر دیا۔ دوست کی مجبوریوں کی اہمیت بیٹے سے زیادہ تھی۔ مارے بندھے اُسے عمر انکل کی صاحبزادی سے نکاح کرنا پڑا۔ گویا پوری زندگی کا معاہدہ کرنا پڑا۔ اِدھر طاہر لغاری دوست اور اُس کی بیٹی کے غم میں اَدھ موئے ہوئے جا رہے تھے۔

اُنہیں اپنے دوست، اُن کی بیٹی اور پھر اُس سے وابستہ رشتے کا کتنا احساس تھا۔ پریشان ہوتے رہے۔ اور ان محترمہ کو کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔

عجیب روکھے سرد انداز میں بات کی اور پھر حکم بھی صادر کر دیا کہ آئندہ مجھے کال کرنے کی زحمت مت کیجیے گا۔ ایک لڑکی وہ بھی نازک اور کمزور سی لڑکی بقول طاہر لغاری کے۔ اُسے حکم دے رہی تھی۔ یعنی اشعر لغاری کی سراسر توہین کر رہی تھی۔ وہ اُسے بتائے گا بتا کے رہے گا کہ بی بی میں کوئی گلی یا سڑک سے گزرنے والا عام سا نوجوان نہیں ہوں اجنبی نہیں ہوں۔ تمہارا شوہر ہوں۔ جملہ حقوق محفوظ ہیں تمہارے میرے نام۔ تم اتنی اکڑ کس بات کی دکھا رہی ہو۔ کس بات کا زعم ہے تمہیں۔ مجھے تم سے بات کرنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

اشعر نے بڑے غصے میں گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی تھی۔ دو بار تو گاڑی فٹ پاتھ پہ چڑھتے چڑھتے بچی۔

☆☆☆

دریکتا نے فون بند کر کے صوفے پہ اُچھال دیا۔ جیسے وہ فون نہ ہو کوئی سانپ ہو۔ اور اُسے ڈس لے گا۔ تایا نے اچانک غیر متوقع طور پہ کال کی تھی کہ لو اشعر لغاری سے بات کرو اور اپنی خیریت سے آگاہ کر دو۔ دریکتا نے فون پہ کبھی اُس سے بات نہیں کی تھی۔ اس وقت اُس میں بے پناہ طاقت آگئی تھی اپنی بات کہنے کے لیے۔ اور اُس نے بڑے واضح انداز میں کہہ دیا کہ مجھے آپ سے بات نہیں کرنی۔ اُس نے اشعر لغاری کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ کوئی اور خوش ہوا ہو نہ ہو۔ اورنگزیب بہت مسرور ہو رہے تھے۔

دریکتا نے تو کمال کر دیا تھا۔ اشعر لغاری کی طبیعت صاف کر دی تھی۔ اُس کی اکڑفوں ہی نکال کے رکھ دی تھی۔ اب آئندہ کے لیے گراؤنڈ ہموار اور صاف تھا۔ اشعر اور طاہر لغاری کے دل میں اور دریکتا کے اس تلخ انداز سے بال تو آ ہی گیا ہوگا۔ اب اورنگزیب نے فائدہ اُٹھانا تھا۔ جب دریکتا رشتہ توڑنا چاہ رہی تھی تو اشعر لغاری کون تھا رشتہ جوڑ کے رکھنے والا۔ بہت جلد اورنگزیب نے طاہر لغاری اور اشعر سے ملنا تھا۔ تا کہ جلد از جلد یہ بوجھ بھی سر سے اُترے۔

☆☆☆

سائرہ اور دریکتا کا ایڈمشن ایک ساتھ ہوا تھا۔ دو ماہ فارغ رہنے کے بعد اُس نے پھر سے کتابیں کھولی تھیں۔ یہ وہی کالج تھا جہاں مائرہ نے شاہ زیب سے رشتہ طے ہونے اور اُن کے گھر سے واپسی پہ داخلہ لیا تھا۔ اُس میں بڑے کالجز والی بات نہیں تھی پھر بھی دریکتا نے کمپرومائز کر لیا تھا۔ کہ اسے اب گاؤں رہ کے اسی کالج میں تعلیم حاصل کرنی ہے۔ سائرہ شور کرتی تھی احتجاج کرتی تھی کہ اسے یہاں نہیں پڑھنا۔ پر اُس کے احتجاج کو کوئی خاطر میں لانے والا نہیں تھا۔ اُس کے برعکس اپنی قسمت پہ صابر و شاکر ہوگی تھی۔ شاہ زیب کی موت کے بعد تمام تر حالات اُس نے قسمت کے کھاتے میں ڈال دیئے تھے۔ اُس کا پپا کے ساتھ یہاں آنا، یہ انکشاف کہ پپا نے خود زبردستی اُس کا رشتہ طاہر انکل کے بیٹے کو دیا، اُن لوگوں کی سرد مہری، بے رُخی، پھر اُن کے گھر پہ اشعر لغاری کی فائرنگ، دریکتا نے سب کو قسمت کا لکھا تصور کر لیا تھا۔ وہ شہر اپنے گھر میں جانے کا اب سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ جہاں اشعر جیسے بے حس بے ضمیر شخص نے اُس کے پپا کے خوابوں کے محل کو تاراج کرنے کی کوشش کی۔ اُسے اپنی زندگی عزیز تھی۔ کیا خبر وہ اگر پپا کے ساتھ وہاں چلی جاتی تو اشعر لغاری پھر سے اپنے مذموم عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتا۔ پہلی بار وہ وہاں نہیں تھی بچ گی۔ لیکن ضروری تو نہیں تھا کہ دوسری بار بھی بچ جاتی۔ اُسے خود سے بھی زیادہ پپا کی سلامتی اور زندگی عزیز تھی۔ بے شک وہ پاگل تھے پر زندہ تو تھے ناں۔ لہو تو اُن کی رگوں میں گردش کر رہا تھا۔ وہ سانس لے رہے تھے۔ دریکتا کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ اس لیے گاؤں سے قریبی اس چھوٹے سے شہر کے کالج میں داخلہ لیتے ہوئے اُس نے کوئی چوں چرا نہیں کی تھی۔

زندگی ایک لگی بندھی ڈگر پہ رواں دواں تھی۔ جس میں صرف خوشی اور اُمید کی ایک ہی کرن تھی۔ اور یہ اُمید کی کرن شاہ زیب کے ہونے والے بچے کے حوالے سے تھی۔

وہ کالج جاتی تو عمر زیب کی دیکھ بھال دو ملازم کرتے۔ شریں تائی، نوید چچا، اور اُن کی بیوی کھڑے کھڑے عمر زیب کو دیکھ جاتے۔ عمر زیب زیادہ تر سوئے رہتے یا جاگ رہے ہوتے تو خلاؤں میں گھورتے، خود سے باتیں کرتے، خود ہنستے خود روتے۔ اس دوران اگر اُن پہ دورہ پڑتا تو ملازم اُنہیں سنبھالتے۔ نوید کے دل میں جانے کس طرح یہ خیال آیا تھا کہ عمر زیب کو کسی بہت ہی اچھے ڈاکٹر اور علاج کی ضرورت ہے۔ اورنگزیب نے اُسے بُری طرح جھڑک دیا تھا۔ ''وہ پاگل ہی ٹھیک ہے۔ جس دن ٹھیک ہوگیا صدمے سے اُس کا دل پھٹ جائے گا''۔ اورنگزیب نے پھر وہی بات دہرائی۔ تو نوید خاموش ہوگیا۔ لیکن اُس کا ضمیر کہتا تھا کہ عمر کا علاج ہونا چاہیے۔ اُسے ہوش مندوں کی طرح جینے کا حق ملنا چاہیے۔ ضروری تو نہیں ٹھیک ہونے کے بعد اُس کا دل صدمے سے پھٹ جائے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے ٹھیک ہونے کے بعد شاہ زیب کے بچے کو دیکھ کے وہ اپنے سب غم بھول جائے اور اسی بچے میں ہی کھو جائے۔

نوید اکیلے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تمام تر اختیارات بڑے بھائی کے سپرد تھے۔ پھر شریں بھابھی بھی شوہر کے ساتھ تھی۔ بلکہ اورنگزیب نے جو کیا تھا اپنی خواہش اور مرضی سے کم اور شریں کے ایما پہ زیادہ کیا تھا۔ نوید اور ہارون بھی چاہتے تھے کہ فائدے میں اُنہیں بھی حصہ ملے۔ دریکتا لڑکی ہے۔ شادی کے بعد پرائے گھر چلی جائے گی اُس نے بھلا اتنی دولت اور جائیداد لے کے کیا کرنا ہے۔ اس سے اچھا نہیں ہے کہ یہ دولت اُس کے تایا اور چچا اپنے فائدے کے لیے

استعمال کریں۔ مردوں کی ضروریات زیادہ ہوتی ہیں اور عمر کے پاس تینوں بھائیوں سے زیادہ دولت ہے۔ اگر وہ اُس میں سے کچھ لے لیتے ہیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ عمر کوئی غیر تو نہیں اُن کا بھائی ہے اور بھائی کے بھائی پہ سو حق ہوتے ہیں۔ یہ خیالات اورنگزیب نے ہی نوید اور ہارون کے دماغ میں ڈالے تھے۔

نوید تو اُن سے الگ ہی ہو گیا تھا اور اپنی بیوی کو بھی اچھی طرح باور کرا دیا تھا کہ ہمارے پاس جو کچھ اپنا ہے بہت ہے ہمیں عمر کے حصے میں سے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ وہ اپنی چوہدراہٹ میں خوش تھا اور عمر کا علاج بھی کروانا چاہ رہا تھا۔

اسجد ہوسٹل سے چھٹیوں میں گھر آتا تو نوید اُس سے مشورہ کرتے کہ باقی دونوں بھائیوں کو اس بات پہ کیسے آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ عمر کے علاج کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی جائے۔ یوں خود سے پرانی میڈیسن دینا اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ عمر کو کب تک نیند میں غرق رکھا جا سکتا تھا۔ جب وہ ان دوائیوں کا عادی ہو جاتا تو پھر اُسے سلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ تب وہ زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس بات کو اورنگزیب سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا نہ اس پہ دھیان دے رہا تھا۔ اور یہی اُس کی غلطی تھی۔ نوید کے خیال میں ضروری نہیں کہ اورنگزیب اس سے متفق ہوتا۔ اُس کے سامنے عمر کے علاج سے زیادہ اہم مسائل تھے وہ جو کبھی لڑ رہا تھا۔ اور ایک ایک بات کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا۔

☆☆☆

مائرہ کو بہت شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ زیبن نے دیکھا تو شریں کو بلا لیا۔ مائرہ کا ماتھا پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ شریں اُس کے سرہانے بیٹھ گی۔ ''امی مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے''۔ اُس نے شریں کے دونوں ہاتھ سختی سے پکڑ لیے تو وہ گھبرا گئی۔ ''میں ابھی ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہتی ہوں۔ اور زیبن تم سب ضروری چیزیں بیگ میں ڈالو۔ اور ہاں دریکتا کو میرے پاس بھیجو ابھی اور اسی وقت۔ کسی کام میں بھی دیر نہ ہو''۔ شریں کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ زیبن اُلٹے قدموں لوٹی۔ پہلے دریکتا کو بڑی بی بی کا بلاوا دیا اور پھر بیگ تیار کرنے لگی۔ اُس نے چند اَن سلے کپڑے ہی بیگ میں ڈالے اور یا مائرہ بی بی کا ایک سوٹ۔

کیونکہ شریں بی بی نے آنے والے ننھے مہمان کے لیے کوئی خریداری نہیں کی تھی اور نہ ہی گھر میں کچھ بنایا تھا۔ نہ چھوٹے چھوٹے لنگوٹ، نہ بچھونے نہ ننھی مُنی شرٹیں اور فراک نہ کچھ اور۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اللہ کی شان بے نیازی تھی۔ شاہ زیب کے ہونے والے بچے کے لیے کسی تیاری کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔

زیبن بیگ لے کے دوبارہ شریں کے پاس آ گئی اور بیگ میں رکھی چیزوں کی تفصیل بتائی تو وہ اُس پہ آگ بگولہ ہونے لگی۔ حالانکہ یہ کام نانیوں، دادیوں کے ہوتے ہیں وہ ننھے بچے کی آمد سے پہلے ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں تیار کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ شریں نے اس پہ کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ باقی رہ گی دریکتا وہ کنواری لڑکی تھی۔ اُسے ان چیزوں سے نہ واسطہ پڑا تھا اور نہ اُسے علم تھا۔ مائرہ نے بھی تو کوئی توجہ نہیں دی تھی اس پہ زیبن پہ گرجنے برسنے کے بعد شریں کو دریکتا کا خیال آیا جو ابھی تک کبھی شریں اور کبھی زیبن کو دیکھ رہی تھی۔ ''دریکتا مائرہ کی طبیعت خراب ہونا شروع ہو گئی ہے تم میرے ساتھ ہاسپٹل چلو گی۔ جاؤ کپڑے تبدیل کر آؤ''۔ شریں نے مائرہ کی تکلیف کا کچھ ایسے انداز میں ذکر کیا کہ دریکتا کو حیا سی آ گئی۔ شریں کو کسی شادی شدہ عورت تجربے کار عورت کو ساتھ لے کے جانا چاہیے تھا۔ نہ جانے دریکتا کو ساتھ لے جانے میں کیا مصلحت کارفرما تھی۔ فوزیہ بھابھی کو بھی خبر ہو گئی تھی۔ وہ شریں کے کہے بغیر ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گی۔ اُس نے دبے دبے الفاظ میں دریکتا کو ہاسپٹل ساتھ لے جانے پہ اعتراض کیا جسے شریں نے رد کر دیا۔

''میں اکیلی کس کس چیز کو دیکھوں گی۔ اچھا ہے یہ ساتھ ہو گی تو...... آخر کو شاہ زیب کے ہونے والے بچے کی پھوپھو ہے۔ اور اس رشتے سے اس پہ بڑے فرض عائد ہوتے ہیں۔ فوزیہ نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ شریں بھابھی سے بحث میں آگے نکلنا مشکل تھا۔

☆☆☆

فوزیہ نے مائرہ کو پکڑ کے سیٹ پہ بٹھایا۔ اُس کے چہرے سے شدید تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔ شریں اُس پہ سورتیں پڑھ پڑھ کے پھونکنے لگی۔ مائرہ کی تکلیف میں بجائے کمی کے اضافہ ہو رہا تھا۔ مائرہ کو دیکھ کے شریں کو ایک برسوں پرانی رات یاد آ گئی جب آنلہ اسی طرح درد سے تڑپ رہی تھی۔ شریفاں اُس کے پاس تھی پر کوئی افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ اب بالکل وہی منظر تھا۔ شریں کانپ سی گی۔ ''اے اللہ میری بیٹی کو سلامت رکھنا''۔ اُس کے دل سے دعا نکلی تھی۔ ساتھ ہی پرانی یادیں تازہ ہو گی تھیں۔ شریں نے جان بوجھ کے آنلہ کو ہاسپٹل لے جانے میں عمر کو فون کرنے میں دیر لگائی تھی۔ اُسے آنلہ کی تکلیف سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مگر اب جب اپنی بیٹی تڑپ رہی تھی کراہ رہی تھی شریں کو بے پناہ اذیت ہو رہی تھی۔ اللہ یاد آ رہا تھا۔ لبوں پہ فریاد تھی دعا تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔

☆☆☆

شریں کو ایک ایک لمحہ قیامت کی گھڑی کی طرح لگ رہا تھا۔ سفر ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ وقت جیسے تھم سا گیا تھا۔ مائرہ اب بالکل نیم جان ہو رہی تھی۔ طاقت ہی نہیں بچی تھی اُس میں۔

اورنگزیب نے سرکاری ہاسپٹل میں مائرہ کا نام لکھوایا تھا۔ ہاسپٹل تھا تو سرکاری پر مائرہ کے لیے وی۔ آئی۔ پی روم اور علاج تھا۔ کافی بڑا ہاسپٹل تھا ہر قسم کی جدید مشینری اور طبی آلات سے آراستہ۔ اورنگزیب نے شریں کے مشورے پہ اس ہاسپٹل میں مائرہ کا نام لکھوایا تھا۔ جہاں ایک الگ وارڈ وی آئی پی مریضوں کے لیے تھا بس پیسے دیں اور ہر قسم کی سہولت حاصل کریں۔ اورنگزیب نے اپنی بیٹی کے لیے بھی علاج کی مہنگی سے مہنگی سہولت حاصل کی ہوئی تھی۔ وہ ہاسپٹل لیبر روم میں پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹر نے سب سے پہلے اُس کا بی پی دیکھا اور چیک اَپ کیا۔ اُس کے چہرے پہ پریشانی سی تھی۔ ''ڈاکٹر صاحبہ کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے''۔ شریں ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات دیکھ کے رو پڑی۔ ''نہیں خطرے والی بات نہیں ہے آپ بس دعا کریں اپنی بیٹی کے لیے''۔ وہ اُس کے شانے پہ تھپکی دے کے آگے بڑھ گئی۔ شریں دل ہی دل میں آیت کریمہ کا ورد کرنے لگی۔ فوزیہ قریبی مارکیٹ سے ہونے والے بچے کے لیے ضروری اشیاء لے آئی۔ کیونکہ دریکتا نے فوزیہ چچی کو بتایا کہ شریں تائی نے کچھ نہیں خریدا ہے۔ نوکرانی پہ شور کر رہی تھیں۔ فوزیہ نے اپنے حساب سے خریداری کر لی تھی۔

شریں لیبر روم کے باہر کوریڈور میں اضطراب کے عالم میں چکر لگا رہی تھی۔

دریکتا اور فوزیہ اُس سے کافی دور بیٹھی ہوئی تھیں۔ دریکتا تو بالکل خاموش تھی۔

فوزیہ کو اچانک یاد آیا کہ چھوٹے بچے کے لیے خریدی گئی چیزیں وہ اُس کمرے میں ہی چھوڑ کے آ گئی ہے جہاں مائرہ کو ہاسپٹل لانے کے بعد تھوڑی دیر بٹھایا گیا تھا۔

''دریکتا جا کے وہ بیگ لے آؤ۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی اُٹھا کے لے گیا ہو۔ اگر ایسا ہو گیا تو سمجھو ہماری خیر نہیں ہے۔ شریں بھابھی کے ہاتھوں۔ میرے تو گھٹنوں میں درد رہتا ہے تمہیں پتہ ہے اس لیے جاؤ اور خود جلدی

سے لے آؤ''۔

وہ کمرا جس کا فوزیہ چچی بتا رہی تھیں یہاں سے کافی فاصلے پہ تھا۔ پر وہاں بیگ تھا جس میں چھوٹے سے نئے آنے والے مہمان کے کپڑے بھی تھے۔ سو دریکتا کو بیگ لانے میں تامل نہ ہوا۔ وہ دل میں دعا کرتی گئی کہ بیگ وہاں موجود ہو۔ اور خوش قسمتی سے بیگ وہاں ہی موجود تھا۔ وہ کمرا ریسپشن کے ساتھ تھا۔ اور بیگ ایک بنچ کی آڑ میں پڑا تھا۔ شاید اسی لیے کسی کی نظر نہیں پڑی تھی اُس پہ۔ اُس نے بیگ اُٹھایا اور تیز تیز قدموں سے چلتی اوپر سیڑھیاں چڑھتی جا رہی تھی جب کسی سے اُس کی زوردار ٹکر ہوئی۔ اور بیگ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اُسے ناک پہ تکلیف ہو رہی تھی اور آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

غلطی اُس کی اپنی تھی۔ اپنے خیالوں میں مگن اِدھر اُدھر دیکھے بغیر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی جا رہی تھی۔

اشعر اُسے دیکھ کر حیران تھا۔ وہ اپنے ایک کولیگ کی عیادت کرنے آیا ہوا تھا اور اب اُسے دیکھنے کے بعد واپس جا رہا تھا جب دریکتا سے اُس سے ٹکرائی۔ وہ بھی اُسے پہچان چکی تھی اور اپنی تکلیف پہ قابو بھی پا لیا تھا۔ بیگ اُٹھا کے وہ سائیڈ سے نکلنا چاہ رہی تھی جب اشعر نے اُس کا بازو تھام لیا۔ اس گرفت میں جارحانہ پن تھا غصہ تھا سختی تھی۔ وہ ڈر گئی۔

''چھوڑیں میرا بازو تائی میرا انتظار کر رہی ہیں۔ مائرہ بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے''۔ دریکتا اپنا بازو پکڑے جانے پہ روہانسی ہو رہی تھی۔ اشعر کو آس پاس سے گزرنے والوں کی جیسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ ''کہاں بیٹھی ہو چھپ کے تم۔ اُس کا پتہ میں بہت جلد چلا لوں گا''۔ وہ دانت پیستے ہوئے اُس کے کان میں جیسے غرایا اور بازو چھوڑ کر تیزی سے سیڑھیاں اُتر گیا۔ دریکتا سے کتنی دیر ہلا ہی نہیں گیا جیسے وہ اُسے ہپناٹائز کر گیا ہو۔

☆☆☆

فوزیہ نے اُسے بیگ سمیت آتے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ ''پر اُس کے چہرے پہ اُڑتی ہوائیاں دیکھ کر پوچھ بیٹھی ''کیا ہوا ہے''؟ ''وہ وہ ہاسپٹل میں مَیں نے اشعر لغاری کو دیکھا ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کے اِدھر آپ کی طرف آ رہی تھی کہ وہ نظر آ گیا اور......''۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی شریں تائی کوریڈور کراس کرتی اُن کی طرف آ گئی تو بے تابی سے پوچھا تو شریں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میری بچی کے لیے دعا کرو اُس کی مشکل جلد آسان ہو جائے''۔ شریں تائی کی آنکھیں بھیگی بھیگی سی لگ رہی تھی جیسے روتی رہی ہوں''۔ ''ارے بھابھی ہماری دعائیں مائرہ کے ساتھ ہیں۔ بس آپ سے غلطی ہوئی ہے۔ جب پتہ تھا کہ ڈلیوری نزدیک ہے تو تین چار دن پہلے ہی آپ کو مائرہ کو لے کر شہر آ جانا چاہیے تھا۔ ہم اس سفر اور تکلیف سے بچ جاتے جو مائرہ اکیلی برداشت کر رہی ہے''۔ فوزیہ نے پورے خلوص سے کہا۔ ''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو بس مت ماری گئی تھی میری۔ مائرہ کتنی دیر سے عذاب میں گرفتار ہے نہ جان چھوٹ رہی ہے نہ کچھ''۔ شریں ہاتھ ملتے ہوئے بولی تو فوزیہ مائرہ کا درد جیسے اپنے دل میں محسوس کرنے لگی۔ ''بس دعا کرو مائرہ خیریت سے فارغ ہو جائے۔ میری بچی جب سے اُمید سے ہوئی ہے۔ درد پہ درد جھیل رہی ہے''۔ شریں کہتے کہتے تلخ ہونے لگی۔ دریکتا کو اُن کی باتیں سن کے شرم سی آنے لگی۔ وہ اُن سے قدرے ہو کے بیٹھ گئی اور دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی۔

☆☆☆

اشعر تپا تپا سرخ چہرا لیے گھر میں داخل ہوا تو طاہر لغاری دیکھتے ہی چونک گئے کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ اشعر اُنہیں سلام کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ حالانکہ پہلے آفس سے آ کر وہ اُن کے پاس بیٹھا کرتا۔ دن بھر کا احوال

...نا تا۔ اُس نے آج صبح ڈیوٹی پہ جانے سے پہلے اُنہیں بتایا تھا کہ وہ آفس سے اُٹھ کے ہاسپٹل جائے گا۔ اُس کے ایک کولیگ کو گولی لگی تھی۔ اشعر نے اُسے دیکھنے جانا تھا۔

طاہر لغاری پوچھنے اُس کے کمرے میں چلے آئے۔ وہ چینج کر کے بیٹھا تھا اُسی وقت۔ آیئے پپا۔

اُس نے مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجالی تھی۔ ''تم ٹھیک تو ہو ناں۔ آندھی طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوئے اور سیدھے اِدھر چلے آئے۔ میرے پاس بیٹھے بھی نہیں''۔

''پپا میں ٹھیک ہوں۔ بس میرے کولیگ کی حالت ٹھیک نہیں۔ اس وجہ سے میں کچھ پریشان ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں سب چلتا ہے''۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ نارمل ہو کے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ طاہر لغاری کو اُس نے آج بھی دریکتا سے ہونے والے تصادم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ ذرا ذرا بات پہ پریشان ہو جاتے تھے۔ اگر اُنہیں پتہ چل جاتا کہ دریکتا اُن کی ہونے والی بہو اور عمر انکل پاکستان میں موجود ہیں تو اُنہوں نے اُسی وقت ضد پکڑ لینی تھی کہ مجھے ابھی لے کے جاؤ۔ اور محترمہ دریکتا جو فون پہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بھلا ملنے کے لیے کیسے راضی ہوتی۔ اور یہ جان کے طاہر لغاری کو جو شاک لگنا تھا وہ اُن کو اُس شاک سے بچانا چاہتا تھا۔ پہلے تو خود اُسے دریکتا سے ایک بھرپور ملاقات کر کے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ مجھ سے کیوں بات نہیں کرنا چاہتی۔ اُس جواب کے بعد اور ساری تفصیلات معلوم کرنے کے بعد وہ طاہر لغاری کو سب کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔ اُسے پہلے اُنہیں سب کچھ بتا کر وہ پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

ایک قیامت خیز انتظار کے بعد لیبر روم کا دروازہ کھلا اور سب سے پہلے نرسز اور اُس کے پیچھے ڈاکٹر باہر آئی۔ شریں بے تابی سے اُن کی سمت بڑھی۔ اُس کے پیچھے دریکتا اور فوزیہ تھی۔

''مبارک ہو آپ کی بیٹی نے خوبصورت اور صحت مند بیٹے کو جنم دیا ہے۔ مگر ابھی اُن کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ فی الحال آپ انتظار کریں وہ بے ہوش ہے۔ جیسے ہی اُن کی حالت سنبھلتی ہے آپ اُن سے مل لیجیے گا۔ ہاں آپ بے بی کو دیکھ سکتی ہیں''۔

وہ اُنہیں بتا کے دوبارہ لیبر روم کی طرف بڑھ گی۔ شریں کا جگمگاتا پُر امید چہرا پھر سے بجھ گیا۔ وہ برسوں کی بیمار نظر آنے لگی اور پھر سے ماضی میں پہنچ گی جب آنلہ نے درد اور کرب کے سمندر کو عبور کر کے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا اور خود داعی اجل کو لبیک کہہ گی تھی۔ اس کی دفعہ بھی ڈاکٹر نے یہی کہا تھا کہ اللہ نے بہت پیاری بیٹی دی ہے مگر ہم آنلہ کو نہیں بچا سکے۔

شریں کو یوں لگا جیسے یہ الفاظ معمولی سی تبدیلی کے ساتھ ابھی ابھی اُن کے کانوں میں کسی نے کہے ہوں۔ کہ ''مبارک ہو۔ اللہ نے بہت پیارا بیٹا دیا ہے۔ مگر ہم مائرہ کو نہیں بچا سکے ہیں''۔ اُف اُن کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں مسلا۔ وہ کوریڈور میں ہی سجدے میں گر گئی۔ ''اے اللہ میری مائرہ کو سلامت رکھنا۔ اُسے زندہ رکھنا۔ اُسے لمبی زندگی دینا''۔ یہ ایک بیقرار ماں کے سینے سے نکلی ہوئی پکار تھی۔ اس پکار میں درد تھا۔ اضطراب تھا۔ آہیں تھی، آنسو تھے۔ جو عرش [illegible] اونچی سے ٹکرا رہے تھے۔ مائرہ کی اکھڑی سانسیں رفتہ رفتہ معمول پہ آنے لگیں۔ شریں کی دعا ایک بیقرار ماں کے دل کی دعا رب نے سن لی تھی۔

مائرہ کی بے ہوشی رفتہ رفتہ ٹوٹنے لگی۔ دھند میں ڈوبا ذہن بیدار ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ اُس کی آنکھیں کھلیں۔ ڈاکٹر اُس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ مائرہ کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر اُس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

یہ پیاری سی لڑکی جو پہلی بار ماں بنی تھی۔ اس کا کیس بہت پیچیدہ تھا۔ ایک بار تو نرسیں اور ڈاکٹر بھی گھبرا گئی تھی۔ جو مائرہ کے کیس کو ڈیل کر رہی تھی۔

مائرہ نئی زندگی کو وجود میں لاتے ہوئے ادھ موئی ہوئی جا رہی تھی۔ اُس کی سانسیں اکھڑ گئی تھی۔ لیکن خدا نے کرم کیا تھا۔ مائرہ کو مکمل طور پر ہوش آ گیا تھا۔

☆☆☆

شریں بے تابی سے اندر مائرہ کی طرف بھاگی۔ فوزیہ اور دریکتا اُس کے پیچھے پیچھے تھیں۔ مائرہ کے چہرے پہ زردی کھنڈی ہوئی تھی پر وہ ماں کو دیکھ کے مسکرا دی۔ شریں نے اُس کے ماتھے پہ جھک کے پیار کیا۔ ’’میری بیٹی کیسی ہے۔ اب کیسا محسوس کر رہی ہو۔‘‘ ’’میں ٹھیک ہوں‘‘۔ مائرہ کی آواز میں نقاہت تھی۔ اتنے میں نرس ننھے منے وجود کو اپنے ہاتھوں میں اُٹھائے اُن کی طرف بڑھی۔ ’’بہت ہی خوبصورت بچہ دیا ہے اللہ نے آپ کو۔ شکر ادا کریں کہ آپ کی بیٹی اور نواسا بالکل ٹھیک ہیں‘‘۔ نرس نے بچہ شریں کی طرف بڑھایا۔ اُس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تب دریکتا نے آگے بڑھ کر بچے کو خود نرس کے ہاتھوں سے لیا۔ نرس کو نانی کے اس بیگانگی بھرے رویے پہ زیادہ دیر حیران ہونے کا موقعہ نہیں ملا۔ وہ خوبصورت سی لڑکی جس نے بچے کو اُس کے ہاتھ سے لیا تھا۔ بچے کو چومتے ہوئے روئے جا رہی تھی ساتھ کچھ بول رہی تھی۔ فوزیہ چچی نے تھوڑی دیر بعد بچہ دریکتا کے ہاتھوں لے سے لیا۔ ’’ماشاءاللہ بہت خوبصورت ہے لگتا ہے شاہ زیب نے دوسرا جنم لیا ہے۔ ہو بہو اُس کی کاپی ہے۔ بچپن میں شاہ زیب بالکل ایسا ہی تھا۔ دیکھیں تو شریں بھابھی اپنے نواسے کو ذرا‘‘۔ فوزیہ نے بچہ اُن کی طرف بڑھایا پر اُنہوں نے ہاتھ آگے نہیں کیے۔ ’’دریکتا کو دو اسے۔ میں مائرہ کے پاس ہوں۔ دیکھ نہیں رہی موت کی دہلیز کو چھو کے لوٹی ہے‘‘۔ وہ مڑ کے مائرہ کی طرف متوجہ ہو گی۔ فوزیہ نے سمجھ نہ آنے والے انداز میں کندھے اُچکائے۔ اتنے میں اُسی نرس نے بچہ دوبارہ اُن سے لے لیا تھا۔ فوزیہ اور دریکتا دونوں سائیڈ پہ آ کے بیٹھ گئیں۔ دریکتا تائی شریں کے رویے کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اُنہوں نے نواسے کو دیکھ کے کسی بھی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لاتعلقی سے مائرہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ دریکتا ہولے ہولے رو رہی تھی۔ فوزیہ نے اُسے کندھے سے لگا لیا۔ ’’اب کیوں روتی ہو۔ دیکھو کتنا خوبصورت بیٹا دیا ہے اللہ نے مائرہ کو اور تم پھوپھو بن گئی ہو۔ عمر بھائی جب دیکھیں گے تو ہو سکتا ہے کہ اُن کی ذہنی صحت پہ اچھا اثر پڑے۔ پر یہ شریں بھابھی کا رویہ میری عقل سے بالاتر ہے۔ نواسے کو دیکھ کے ذرا خوش نہیں ہوئی۔ ٹھیک ہے مائرہ نے بہت تکلیف اُٹھائی ہے پر......‘‘ فوزیہ چچی تاسف زدہ تھی۔ دریکتا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ تو اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی سوچ رہی تھی اگر شاہ زیب زندہ ہوتا تو اپنے بیٹے کو دیکھ کے کتنا خوش ہوتا۔ پپا اگر ٹھیک ہوتے تو وہ شاہ زیب کی نشانی کو پا کر اپنے سب دُکھ بھول جاتے۔ اُس کی زندگی میں کتنے ’’اگر‘‘ اور کتنے ’’کاش‘‘ جمع ہو گئے تھے۔

☆☆☆

نرس فیڈ کروانے کے لیے بچے کو مائرہ کے پاس لائی تو اُس کے پاس بیٹھی شریں نے دھیرے سے انکار میں سر ہلایا اور مائرہ کو آنکھوں میں اشارہ کیا ’’میری بیٹی کی حالت ابھی اس طرح کی نہیں ہے کہ فیڈ کروا سکے۔ آپ اسے فی الحال اوپر کا دودھ ہی دیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی‘‘۔ نرس کچھ بولنا چاہ رہی تھی پر شریں کا دوٹوک انداز دیکھ کر اُلٹے قدموں لوٹ گی۔ جب بچے کی ماں کو خود ہی بچے کی پروا نہیں تھی تو اُسے کیا پڑی تھی کچھ بتانے کی یا ماں کے دودھ کے فوائد گنوانے کی۔ ان بڑے لوگوں کے بڑے کام تھے بڑی بڑی سوچیں تھیں۔ جو اُن جیسے چھوٹے لوگوں سے نہیں ملتی تھی۔

☆☆☆

نرس کے جانے کے بعد شریں کچھ بڑبڑانے لگی۔ ’’ارے جسے دیکھو سر پہ چڑھا آ رہا ہے بچے کا یہ بچے کا وہ۔ اب تم نے پہلے ہی اتنی تکلیف اُٹھائی ہے۔ اب بچے کو فیڈ بھی کرواؤ۔ ان ہسپتال والوں کو تو کسی پہ بھی رحم نہیں آتا۔ انسان ہی نہیں ہے کوئی ان کی نظر میں۔ اب تم بھی بیوقوفی میں آ کے خود فیڈ کروانا شروع نہ کر دینا۔ اب اس دریکتا کو ہی دیکھ لو۔ ماں پیدا کرتے ہی مر گئی تھی۔ تو کیا اسے ماں کا دودھ ملا تھا۔ فیڈر پی کے بڑی ہوئی۔ اب بھرپور جوان اور صحت مند ہے۔ بچے کو ماں جب اپنا دودھ پلاتی ہے تو بچے کی محبت ماں سے بڑھ جاتی ہے۔ کل کو جدائی اور دوری کا ثنا عذاب لگنے لگتا ہے۔ اس لیے بچے کو گلے کا ہار مت بناؤ۔ اپنے بارے میں سوچو۔ اپنے آنے والے کل کے بارے میں سوچو۔ جو مائیں بچوں کے پیچھے اپنی زندگی تباہ کر دیتی ہیں۔ اُن کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ ارے یہ اولاد بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ پال پوس کے بڑا کر دو تو کبھی احسان کو نہیں مانتی۔ خاص طور پہ یہ لڑکے تو ماں کو خاطر میں لاتے ہی نہیں ہیں‘‘۔

’’تم نے ابھی زندگی کی خوشی دیکھی ہی کہاں۔ شادی ہوئی۔ سال بعد شاہ زیب تمہیں چھوڑ گیا۔ اُس کے جانے کے بعد تمہیں ماں بننے کا پتہ چلا۔ شادی کے ایک سال آٹھ ماہ بعد تم ماں بن گی۔ اس عرصے میں کیا خوشی دیکھی یا پائی تم نے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ ارے عورت کے لیے اُس کا شوہر اور اپنا گھر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اپنی گزشتہ زندگی بھول جاؤ۔ سب کچھ بھول جاؤ۔ صرف اور صرف خود کو یاد رکھو‘‘۔ شریں اپنا فلسفہ اُس کے دماغ میں اُنڈیل رہی تھی۔ مائرہ سر ہلا رہی تھی۔ شریں مطمئن تھی کہ اُس کی باتیں مائرہ کی سمجھ میں آ رہی ہیں۔

☆☆☆

عمر حسب معمول بیٹھے کسی غیر مرئی شے کو دیکھ رہے تھے۔ آج وہ بڑبڑا بھی نہیں رہے تھے۔ کافی دیر سے خاموش تھے۔ مائرہ ہاسپٹل سے گھر آ چکی تھی۔ زیبن نے چھوٹے بچے کو اُٹھایا ہوا تھا۔ مائرہ تو لیٹی ہوئی تھی۔ اُنہیں آئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی۔ مائرہ وہ تو آتے ساتھ ہی اپنے کمرے میں گھس گئی تھی۔ شریں بھی تھکن کی شکایت کر رہی تھی اُس نے زیبن کو اشارہ کیا کہ بچے کو یہاں سے لے جاؤ۔ وہ اُٹھا کے آ گئی۔ دریکتا نے دیکھا تو اُسے لے لیا۔ عمر خاموش تھے۔ دریکتا خوش فہمی کا شکار تھی کہ شاید پپا شاہ زیب کے بچے کو دیکھ کے خوش ہو جائیں اور جس طرح فلموں میں ہوتا ہے کہ کوئی حادثہ ایک پل میں ساری زندگی بدل دیتا ہے ہو سکتا ہے اس طرح وہ ایک دم ٹھیک ہو جائیں۔ اسی خوش فہمی اور ڈھیروں توقعات کے ساتھ وہ اس ننھے سے فرشتے کو لے کر پپا کے پاس آئی۔ جو بالکل گم صم سے تھے۔

’’پپا یہ دیکھیں شاہ زیب کا بیٹا‘‘۔ اُس نے بچے کو ذرا سا اُن کی طرف آگے کیا تاکہ وہ اُسے دیکھ سکیں۔ پر وہ اس طرف متوجہ ہی نہیں تھے۔ اُسی غیر مرئی نکتے کو گھورتے رہے جس طرح اُس کے آنے سے پہلے گھور رہے تھے۔ وہ کچھ دیر پُر امید نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھتی رہی کہ شاید خون کی کشش ہی اپنا اثر دکھا جائے۔ پر ایسا کوئی معجزہ نہیں ہوا۔ ہاں البتہ بچے نے کسمسا کے رونا شروع کر دیا۔ اُس کی آواز سے عمر زیب کا ارتکاز ٹوٹ گیا تب اُنہوں نے دریکتا اور بچے کی

طرف دیکھا۔ پر ان نگاہوں میں شناسائی یا پہچان کی کوئی رمق نہیں تھی۔ بلکہ اُن آنکھوں میں عجیب سی جارحیت در آئی۔ اُنہوں نے دریکتا کے کچھ سوچنے سمجھنے سے بیشتر تقریباً جھپٹ کے بچے کو اُس سے لے لیا۔ دریکتا نے گھبرا کے زور سے چیخ ماری۔ اُس کے چیخ مارنے کی دیر تھی۔ عمر نے بچے کو وہیں بیڈ پہ پٹخا اور خود دریکتا کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ بچے نے زور سے زور سے چلانا شروع کر دیا۔ یہ اُس کی تکلیف کا اظہار تھا۔ دریکتا نے بُری طرح چیخیں مارنا شروع کر دیں۔ عمر نے اُسے بالوں سے پکڑ لیا اور زوردار جھٹکا دیا۔ باہر سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئی۔ یہ ملازم اور زیبن تھی ساتھ سائرہ۔ بچے کے رونے کی آواز اور دریکتا کی چیخوں میں بے پناہ خوف اور درد تھا۔

دو ملازموں نے آ کے دریکتا کو عمر زیب سے چھڑایا اور زیبن نے بڑھ کے بُری طرح روتے بچے کو اُٹھایا اور تقریباً بھاگنے کے انداز سے نکلی۔

دریکتا کھانس رہی تھی۔ عمر اُس کا گلا دباتے رہے تھے۔ اُس کی گردن پہ نشان بنے پڑ گئے تھے۔ کوئی جا کے نوید کو بلا لایا تھا۔ اُنہوں نے عمر کو انجکشن لگایا تو وہ پُرسکون ہوئے۔ سائرہ دریکتا کو دیکھ کے ڈر گئی تھی۔ جب وہ آوازیں سن کے اِدھر آئی تو عمر دریکتا کا گلا دبا رہے تھے اور اُس کی آنکھیں جیسے باہر کی طرف اُبلی پڑ رہی تھی۔ سائرہ اُسے وہاں سے لے آئی۔

دریکتا کو حلق میں بہت درد ہو رہا تھا۔ عمر نے تو جیسے سارا غصہ اور طاقت اُسی پہ صرف کر دی تھی۔ ''تمہیں جب پتہ ہے کہ عمر چچا کو دورہ پڑتا ہے تم اُن کے پاس کیوں جاتی ہو۔ میں تو حیران ہوں کہ تم اُس کمرے میں رہتی کیسی ہو۔ تمہیں اپنی جان عزیز نہیں''۔ سائرہ حیرانی سے اُسے سوال کر رہی تھی۔ دریکتا کے چہرے پہ ابھی تک تکلیف کے آثار تھے۔ ''وہ میرے پپا ہیں میں اُنہیں کیسے چھوڑ دوں۔ اور مجھے کیا پتہ کہ اُن پہ دورہ پڑ جائے گا۔ میں تو شاہ زیب بھائی کا بیٹا اُنہیں دکھانے لے گئی تھی کہ ہوسکتا ہے اُن کی ذہنی حالت میں کوئی تبدیلی آ جائے۔ پر کیا پتہ تھا ایسا ہوگا''۔

''لو پاگلوں کا کیا بھروسہ کسی وقت کیا کر جائیں۔ تمہیں خود احتیاط کرنی چاہیے۔''

سائرہ نے بڑوں کی طرح نصیحت کی۔ ''ارے ہاں سنا ہے کہ ابو تمہارے سسرال جائیں گے اور خلع کی بات کریں گے کیونکہ اُن کا رویہ بہت خراب ہے''۔ سائرہ نے سنی سنائی بات اُس کے سامنے دہرائی تو دریکتا کے سارے اعصاب تن سے گے۔

''ویسے تمہارا ہزبینڈ بہت ڈیشنگ ہے دیکھنے میں تم سے سات آٹھ سال بڑا لگتا ہے پر اُس کی اس میچورٹی میں بہت اٹریکشن ہے۔ میں نے جھٹ سے دعا مانگ لی کہ مجھے بھی ایسا ہی لائف پارٹنر ملے۔ میں تمہیں بہت لکی کہتی تھی کہ اتنا ڈیشنگ ہینڈسم ہے۔ ہزبینڈ ہے پر اب افسوس ہوتا ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ دے گا۔''

میں نے سنا ہے کہ عمر چچا نے خود اُن لوگوں کو تمہارے رشتے کا کہا تھا۔'' سائرہ اُس کی دلی حالت سے بے خبر اپنی ہانکے جا رہی تھی اور دریکتا کو اپنے رخسار احساس توہین سے لال ہونے لگ رہے تھے''۔ گویا یہ بات سب کو پتہ چل گئی ہے۔ سائرہ اُس سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ پر ابھی اُسے اپنی اس کزن پہ بہت ترس آ رہا تھا۔ جسے اُس کا شوہر رخصتی سے پہلے ہی چھوڑنے والا تھا۔ اس بات سے اُسے عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ شریں نے کہا تھا کہ اُدھر اشعر لغاری سے خلع ملتے ہی وہ دریکتا کو اپنی بہو بنالیں گی۔ عاشر بھائی موٹے، غصیلے چڑچڑے، ذرا ذرا سی بات پہ آپے سے باہر ہو جانے والے۔ بھلا دریکتا اُن کے ساتھ کیسی لگے گی۔ وہ اکثر یہ تصور کرتی۔ امی نے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ اس بات کا

ذکر کسی سے مت کرنا ورنہ فوزیہ اور فرح چچی کا مزاج بگڑ جائے گا۔ وہ اُسی امید پہ اپنا کوئی حصہ نہیں مانگ رہیں کہ اورنگزیب دریکتا کو خلع دلوا کے اُس کے بیٹے کے ساتھ شادی کروائیں گے۔ اُنہوں نے دونوں بھائیوں سے کوئی بات کی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے قاسم یا اسجد میں سے دریکتا جس کی بھی بیوی بن جاتی اُس کے وارے نیارے ہو جاتے۔ باقی کا حصہ اورنگزیب کا تھا آخر وہ بھی تو عمر کے بھائی تھے۔ کچھ بُرا تو نہیں سوچ رہے تھے۔ دریکتا کی شادی اگر اپنے خاندان میں ہو جاتی تو اس میں کیا برائی تھی۔ آخر کو اپنے تھے۔ خاندان کی جائیداد بھی خاندان میں رہ جاتی۔

پر نوید اس دوڑ سے باہر ہو چکے تھے۔ اسجد نے صاف کہہ دیا تھا کہ دریکتا اُس کے لیے بہن جیسی ہے۔ میں کبھی بھی اُس سے شادی نہیں کروں گا۔ وہ اس بات پہ ماں باپ سے لڑا تھا کہ آپ کی سوچ کیسی ہے ایک بیٹی کو سازشوں سے خلع کروائیں گے۔ ایسے آپ کو کیا ملے گا۔ میری بھی دو بہنیں ہیں۔ کل کو اُن کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوسکتا ہے۔ اُس کے سمجھانے کا اثر کافی خوشگوار تھا۔ نوید باز آ گئے تھے اور اُنہوں نے اورنگزیب بھائی سے بھی صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے عمر بھائی کی دولت میں سے کچھ نہیں چاہیے۔ اُنہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اور باقیوں کو اُن کے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔

اورنگزیب تو خوش تھے کہ دریکتا کے اُمیدواروں میں سے ایک کی کمی ہو گی تھی۔ باقی قاسم رہ گیا تھا۔ اُنہوں نے بالا بالا ہی خلع کے بعد اپنے بیٹے عاشر کے ساتھ دریکتا کے نکاح کا پلان بھی مکمل کر لیا تھا۔

نکاح کے بعد کسی نے کیا بگاڑ لینا تھا۔

عمر زیب نے دریکتا کا نکاح خاندان سے باہر اپنے دوست کے بیٹے کے ساتھ کیا تھا۔ عمر کا فیصلہ کسی کو بھی پسند نہیں آیا تھا۔ اس ناپسندیدگی میں اورنگزیب بھی شامل تھے۔ وہ کوئی بُرا تو نہیں کر رہے تھے۔ اگر دریکتا کی شادی پھر سے خاندان میں کرنے کی سوچ رہے تھے تو آخر اُنہوں نے بھی تو مائرہ کی شادی خاندان میں ہی کی تھی۔ پھر عمر کیوں خاندانی روایات سے بغاوت پہ اُترا تھا۔ اس بغاوت کی سزا اُسے ملنا ضروری تھی۔

شریں کے دل میں زہر بھرا تھا اور اورنگزیب اُس کی ہر بات مانتا تھا۔ اب نہ آئلہ رہی تھی اور نہ عمر پہلے جیسا ہوش مند رہا تھا پر شریں کے دل میں وہی رنجش تھی۔ کہ عمر نے دو بار اُس کی بہن بینا کو ٹھکرایا۔ اور اس کی سزا اُسے قدرت سے مل رہی تھی۔ (شریں کے خیال میں)۔

☆☆☆

زیبن روتے دھوتے بچے کو اُٹھائے مائرہ کی طرف گئی تو شریں سے ٹکراؤ ہو گیا۔ ''کہاں جا رہی ہو''۔ اُس کی آواز میں کڑک تھی۔ ''جی مائرہ بی بی کی طرف لے کے جا رہی ہوں۔ یہ بہت دیر سے رو رہا ہے۔ جب سے سو کے اُٹھا ہے روئے جا رہا ہے''۔ ''تو مائرہ کیا کرے یہ رو رہا ہے تو...... جا کے دریکتا کے حوالے کرو۔ اور تم نہیں سنبھال سکتی چھٹانک بھر کے بچے کو۔ جھٹ مائرہ کی طرف بھاگتی ہو''۔ شریں نے چٹاخ سے ایک تھپڑ زیبن کے منہ پہ جڑا۔ تو اپنی جھونک میں وہ لڑکھڑا سی گی۔ ''حرام خور کس بات کے پیسے لیتی ہو۔ اسے سنبھالنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اس کی پھوپھی بھی ہے۔ اُس کا بھی کچھ فرض بنتا ہے۔ جب دیکھو مائرہ کے سر پہ سوار ہو جاتی ہو۔ جاؤ اسے فیڈر بنا کے دو۔ بھوکا ہوگا یہ۔ اس لیے رو رہا ہے۔ جاؤ شاباش''۔ آخر میں شریں نے خود ہی لہجہ نرم کر لیا تو زیبن کی جان میں جان آئی۔ ورنہ وہ تھپڑ کھا کے سہم گئی تھی۔

ابھی تک بچے کا نام نہیں رکھا گیا تھا اور نہ ہی کسی نے دلچسپی لی تھی۔ دریکتا نے خود ہی اُسے طیب کہہ کے بلانا شروع کر دیا تھا۔ آخر بچے کا کوئی نام ہونا تو ضروری تھا۔ زیبن کے لیے بھی آسانی ہوگئی تھی۔ اب وہ روتا تو وہ دریکتا کے پاس آ کے کہتی کہ طیب رو رہا ہے یہ کر رہا ہے وہ کر رہا ہے۔ وہ روتا بھی تو بہت زیادہ تھا۔ جیسے چیخ چیخ کے ماں کی بے رُخی کا احتجاج کر رہا ہو جس نے ابھی تک اُسے غور سے دیکھا تک نہ تھا۔ شروع میں ہاسپٹل سے آنے کے بعد کچھ دن طیب مائرہ کے کمرے میں ہی سویا۔ ساتھ زیبن بھی ہوتی۔ چار دن بعد شریں نے حکم صادر کر دیا کہ طیب کو مائرہ کے پاس لے جاؤ۔ زیبن کو مائرہ کے برابر والا کمرا دے دیا گیا۔ اب وہ طیب کے رونے پہ پہلے کی طرح مائرہ کی طرف نہیں بھاگتی تھی۔ خود ہی شانے سے لگا کے تھپکتی۔ یا پھر دریکتا کو بتاتی۔ وہ اُسے مائرہ بی بی کی طرح جھڑکتی نہیں تھی بلکہ طیب کو اُس کی گود سے لے لیتی۔ اور حیرت انگیز طور پہ طیب اُس کے پاس جاتے ہی اُس کے سینے سے لگ کے خاموش ہو جاتا اور زیبن کو تھوڑی دیر کمر سیدھی کرنے کا ٹائم مل جاتا۔

☆☆☆

بینا اُسے سینے سے لگائے کتنی دیر اپنی ممتا اُس پہ نثار کرتی رہی۔

باسط آ گیا تھا اس بار وہ کچھ دیر سے آیا تھا۔ اس لیے بینا بے قرار سی تھی۔ ”اس بار بڑے دن لگا دیئے“۔ وہ اُس کا چہرا ہاتھ میں تھامے دیکھ رہی تھی۔ ”امی اب میں نے وہاں اپنا کاروبار شروع کر دیا ہے ایک دوست کے ساتھ۔ اس لیے لیٹ آیا۔ اپنا کاروبار ہے اس لیے ذمہ داری بھی زیادہ ہے“۔ ”اللہ تمہیں اور ترقی اور کامیابی دے۔ خیر بیٹھو میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارے لیے چائے بناتی ہوں“۔

بینا جانے لگی تھی۔ باسط نے روک لیا۔

”امی اس وقت کسی چیز کا بھی دل نہیں ہے میرے پاس بیٹھیں کچھ دیر“۔ وہ اُسے نثار ہو جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں حمزہ احمد بھی چلے آئے۔ اور باسط کے باقی بھائی بہن بھی اُس کے گرد جمع ہو گے۔ اُس نے سب کو اُن کے گفٹ دیئے۔

”امی اب میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں دو گھنٹے بعد مجھے اُٹھا دینا۔ یہاں ایک بندے سے ملنا ہے اپنے کام کے سلسلے میں“۔ باسط نے صوفے سے اُٹھ کے کھڑے ہوتے ہوئے ایک زوردار انگڑائی لی۔ ”ہاں سو جاؤ میں دروازہ بند کر جاتی ہوں۔ ارے میں ایک بات بتانا بھول ہی گئی کہ مائرہ کے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے۔ بہت خوبصورت اور صحت مند ہے۔ میں ابھی تک اُسے دیکھنے جا نہیں پائی ہوں۔ میں اور تم دونوں اکٹھے چلیں گے“۔

بینا جاتے جاتے دروازے سے پلٹ آئی اور اُسے یہ اطلاع دی۔ وہ مائرہ کے گھر بیٹے کی پیدائش کا یوں خوشی خوشی بتا رہی تھی جیسے وہ بھی خوش ہو جائے گا۔ باسط کے دل میں ناپسندیدگی کی ایک لہر سی اُٹھی۔ جسے اُس نے مشکل سے دبایا۔ ”ہاں امی ضرور چلیں گے“۔ اتنا کہہ کے اُس نے چادر میں منہ چھپا لیا جیسے سخت نیند آ رہی ہو۔ حالانکہ اب اُس کی نیند اُڑ گئی تھی۔

بینا دروازہ بند کر کے جا چکی تھی۔

مائرہ کے گھر بیٹا۔ شاہ زیب اور اُس کی قربتوں، شدتوں کی یادگار جیتی جاگتی نشانی۔ اُس نے تکیہ دونوں بازوؤں میں دبا کے دہرا کر دیا۔ جیسے ساری نفرت، جلن، کڑھن اس تکیے پہ نکالنا چاہ رہا ہو۔

اب تو مائرہ سے ملنا بہت ضروری تھا۔ بہت ہی ضروری۔ اُس نے بڑا انتظار کیا تھا اس وقت کا۔ اور مائرہ کا پیچھا بھی اس بوجھ سے چھوٹ چکا تھا۔ اب باسط نے اپنی سوچوں کو اپنے خوابوں کو تعبیر کی صورت دیئی تھی۔

☆☆☆

اورنگزیب اور اُن کے گھر، حیرت کی بات تھی۔ اُن کے انداز میں کینہ پروری اور جارحیت تو اشعر نے اُسی دن محسوس کر لی تھی۔ جب عمر انکل کے آفس میں اُن سے ملاقات ہوئی تھی اور آج وہی کینہ پروری چہرے پہ سجائے وہ اُن کے گھر چلے آئے تھے۔ اخلاق کے تقاضے تو پورے کرنے تھے۔ بہر حال اُن کے تیوروں سے لگ نہیں رہا تھا کہ وہ کسی اچھی نیت سے اُن کے پاس آئے ہیں۔ ملازم نے فوراً ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلوا کے اُنہیں اندر بٹھایا اور موسم کی مناسبت سے کولڈ ڈرنک مختلف لوازمات سمیت اُن کے آگے لا کے رکھا۔

طاہر لغاری گھر میں ہی تھے اور یہ کیسے ممکن تھا کہ اُنہیں اورنگزیب کے آنے کی خبر نہ ہو پاتی۔ وہ تو سنتے ہی خوش ہو گئے اور جوتے پہن کے فوراً اُن کی طرف چلے آئے۔ حالانکہ دوپہر میں وہ کچھ دیر آرام کرنے کے عادی تھے اور اس آرام میں کسی کو مخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ اشعر نے خود اُنہیں اورنگزیب انکل کے آنے کا بتایا تھا۔ اُن کی باقیماندہ نیند اُڑ ہی تو گئی۔

بڑے خلوص سے اورنگزیب سے بغل گیر ہوئے۔ اُن کا رویہ قدرے سرد سا تھا۔ بالکل اُس کولڈ ڈرنک کی طرح جو اورنگزیب کے سامنے ٹیبل پہ پڑا تھا۔ اورنگزیب نے اُسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ طاہر نے خود گلاس اُن کی طرف بڑھایا۔ ”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے“۔ اُنہوں نے گلاس پرے کر دیا۔ ”کیسے آنا ہوا ہے“۔ طاہر کی خوش مزاجی اورنگزیب کی سرد مہری کے باوجود عروج پہ تھی۔

”میں بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔ سوچا تو کچھ اور تھا پر وہ مناسب نہیں لگا سو اس لیے آپ کے پاس حاضر ہو گیا“۔ وہ اتنا کہنے کے بعد خاموش ہو گے۔ طاہر بے تابی سے اُن کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگے۔

اورنگزیب نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اُنہیں حقیقی معنوں میں حیران و پریشان کر دیا۔ ”میں دریکتا کی خلع کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں“۔ وہ یوں کہہ رہے تھے جیسے عام سی بات ہو۔

اشعر کی کنپٹی کی دائیں رگ پھڑکنے لگی۔ جو اُس کے شدید غصے اور ردعمل کا اظہار تھا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں“۔ اشعر غصے میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ طاہر نے اُس کا بازو پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ اُنہیں صورتحال کی سنگینی اور اشعر کے غصے کا بھی پتہ تھا۔ ”میاں صاحبزادے آرام سے بیٹھو۔ آپے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود سے نہیں آیا ہوں اور نہ مجھے اس طرح آنے پہ کوئی خوشی ہے“۔ اورنگزیب کا لہجہ اب بالکل ہی بدل گیا۔ صورت حال کے مطابق اُس نے اپنے رویئے میں لچک پیدا کر لی تھی۔

”تو پھر آپ کس کے کہنے پہ یہاں آئے ہیں“۔ اشعر کے غصے میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔

”میں دریکتا کے کہنے پہ اُس کے زور دینے پہ اور مجبور کرنے پہ آپ کے پاس آیا ہوں۔ وہ خلع مانگ رہی ہے۔ اپنے شوہر کے ساتھ اس تعلق کو مزید برقرار رکھنا نہیں چاہتی۔ عاقل و بالغ ہے۔ بااختیار ہے کوئی اُسے روکنے والا نہیں ہے اور نہ وہ میری سن رہی ہے“۔ میں نے اپنی اولاد اور اُس میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ اُسے پیار سے کہا لاڈ سے کہا کہ یہ اچھا نہیں ہے۔ پر اُس کی ایک ہی رٹ ہے کہ اُسے خلع چاہیے۔ میں اس پہ بے حد شرمندہ ہوں۔ میری ایک بیٹی اور

بھی ہے۔اس کے علاوہ میرے دو بھائیوں کی بھی بیٹیاں ہیں۔ اگر اس خلع کے بدلے آپ اُن میں سے جس کا بھی رشتہ طلب کریں میں حاضر ہوں۔ کیونکہ وہ کسی طرح بھی نہیں مان رہی۔ اور میں یہاں مجبور ہوں"۔

اورنگزیب کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

وہ سچ مچ ایک مجبور باپ نظر آرہا تھا اور جس رعونت سمیت اُن کے گھر آیا تھا وہ اب کہیں سے بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

طاہر لغاری سر پکڑ کے بیٹھ گئے تھے۔ پر اشعر کے چہرے پہ چٹانوں کی سی سختی اور درشتگی تھی۔ وہ خاموش ہو کے بیٹھ جانے والوں میں سے نہیں تھا۔ "آپ کو دریکتا نے یہاں میرے پاس بھیجا ہے ناں تو سن لیں اور اُسے بھی جا کے بتا دیں کہ میں اُسے خلع نہیں دوں گا"۔ اُس نے ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا تو اورنگزیب نے ایک اور کوشش کی۔

"میرے سامنے کی بات ہے وہ تمہارے ساتھ بات تک نہیں کرنا چاہتی۔ جب ایک فریق راضی ہی نہیں ہے تو ایسے بندھن زبردستی جوڑے رکھنے کا کیا فائدہ"۔ "مجھے فائدے اور نقصان سے کچھ نہیں لینا بس اگر میں نے کہہ دیا ہے کہ میں خلع نہیں دوں گا تو نہیں دوں گا"۔

"تو ٹھیک ہے پھر آپ عدالت میں آجائیں آپ دونوں"۔ اورنگزیب نے کھڑے ہو کر طاہر لغاری سے کہا اور ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا پر اشعر نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔ "میں ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں کہ بات عدالت سے باہر ہی طے ہو جائے کیونکہ اُس نے مجھے کہہ کے بھیجا تھا کہ میں فیصلہ کن جواب لے آؤں۔ آپ بھی عزت دار ہیں اور ہم لوگ بھی روایتی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میری طرح طاہر صاحب آپ بھی نہیں چاہیں گے کہ گھر کی باتیں عدالت میں ڈسکس ہوں۔

"مجھے کچھ بھی بتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب سمجھتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ہم عزت اور غیرت کے پیچھے جان دینے والے لوگ ہیں۔ اور دریکتا صاحبہ کو معلوم نہیں ہے کہ اُس کا پالا کس شخص سے پڑا ہے۔ بہت جلد سمجھ جائے گی۔ میں خود آؤں گا اُسے سمجھانے"۔

طاہر لغاری پریشانی سے کبھی اورنگزیب کو اور کبھی اشعر کو دیکھ رہے تھے۔ اُنہیں بہت ساری باتوں کا کچھ پتہ ہی نہیں تھا اس لیے وہ اُلجھ رہے تھے۔ اشعر نے اُنہیں اس لیے نہیں بتایا کہ وہ پریشان ہوں گے۔ اب اورنگزیب کے ذریعے اُنہیں وہ باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ وہ اُسے پوچھنا چاہ رہے تھے کہ دریکتا اور عمر کب آئے ہیں واپس۔ مگر موضوع اس وقت اتنا گھمبیر طریقے سے زیرِ بحث تھا کہ وہ کوئی سوال کر ہی نہیں پا رہے تھے۔ یا اُنہیں موقعہ ہی نہیں مل رہا تھا۔

"اچھا میں چلتا ہوں اگر صلح و صفائی سے بات طے ہو جاتی تو اچھا تھا۔ پھر بھی میں انتظار کروں گا آپ کے مثبت جواب کا۔ کیونکہ میں جگ ہنسائی سے بچنا چاہ رہا ہوں"۔ جاتے جاتے اورنگزیب نے پھر کہا تو اشعر بھڑ گیا۔ "ہماری طرف سے کوئی مثبت جواب نہیں ہے آپ میرے گھر بیٹھ کے میری توہین کر رہے ہیں۔ آپ عمر انکل کے بھائی ہیں اس ناطے سے میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ آپ کی جگہ یہ بات کوئی اور کرتا تو میں اُسے شوٹ کر چکا ہوتا۔ بس بہت ہو چکا ہے۔ بات عدالت میں جائے یا کہیں اور۔ میں اپنی عزت اور اَنا کی خاطر کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ آئندہ میرے گھر میں دریکتا کے ترجمان بن کے مت آیئے گا اورنگزیب انکل۔ ورنہ پھر میں بھی آپ سے کسی اور طرح ملوں گا"۔ اشعر کا لہجہ کسی کمزور دل انسان کے لیے برداشت کرنا مشکل تھا۔ اورنگزیب بھی ایک ثانیے کے لیے سوچ میں پڑ گئے۔ پھر سر جھٹک کے اُس کی طرف دیکھا اور طاہر لغاری سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو گئے۔

وہ ابھی تک پریشانی سے نظریں جمائے ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں سے ابھی ابھی اورنگزیب نکل کے گئے تھے۔

"اشعر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ عمر واپس کب آیا مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ اور دریکتا یہ خلع کا مطالبہ کیوں کر رہی ہے"۔ طاہر لغاری حد سے زیادہ پریشانی کا شکار تھے۔ "پپا سب پتہ چل جائے گا کہ ایسا ویسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ اورنگزیب انکل جن کو اُن "محترمہ" نے ترجمان بنا کے یہاں بھیجا وہ در پردہ دھمکی دے رہے تھے عدالت جانے کی۔ میں عدالت سے نہیں ڈرتا"۔ "تم ذرا سکون سے مجھے بات کرنے دو خود دریکتا سے۔ اُس کے بعد دیکھا جائے گا"۔ طاہر لغاری کو تھوڑی اُمید کی روشنی نظر آئی۔ "نہیں پپا آپ کسی سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ جو کرنا ہے میں خود کروں گا۔ رشتہ آپ کی مرضی سے طے ہوا ہے اور اسے میں اپنی مرضی سے نبھاؤں گا۔ آپ کسی بات کی فکر مت کریں"۔ وہ بہت ضد کا شکار لگ رہا تھا۔ طاہر لغاری خاموشی سے کچھ سوچنے لگے۔

☆☆☆

جب سے عمر کو دورہ پڑا تھا آخری بار۔ اُس کے بعد نوید چچا نے دریکتا کو اپنا کمرا الگ کرنے کہا تھا۔ اُن کے سمجھانے اور اپنی حفاظت کے نقطہ نگاہ سے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد وہ راضی ہو گئی تھی۔ عمر اب اکیلے ہوتے تھے۔ دریکتا کو یہ بات پسند تو نہیں تھی پر مجبوری تھی۔ وہ پپا کے ساتھ ایک کمرے میں تھی تو اُسے خاموش سے تحفظ کا احساس تھا۔ جو الگ کمرے میں رہنے سونے سے ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اورنگزیب شریں تائی دونوں دریکتا کے اِردگرد موجود تھے۔ اورنگزیب نے آج کی ملاقات اُن کے گھر جانے کی تفصیل زیب داستان کے ساتھ شریں اور دریکتا کو بتائی تھی۔ "دریکتا تم میرے لیے سائرہ اور مائرہ کی طرح ہو۔ میں تمہارا بُرا نہیں سوچ سکتا۔ اشعر ایک کرپٹ پولیس آفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی لحاظ سے بھی نہایت گیا گزرا انسان ہے۔ آج جب میں اُن کے گھر گیا۔ طاہر لغاری اور اُس کے رویئے کا سبب پوچھنے تو مجھے بہت ذلیل کیا اُن لوگوں نے۔ میری تو کچھ عقل میں سما ہی نہیں رہا ہے کہ سب کیا ہو رہا ہے۔ عمر نے آخر یہ غلطی کیوں کی۔ اشعر لغاری نے عمر کا زیادہ حصہ ملک سے باہر گزارا۔ وہ وہاں کیا تھا کیا نہ کرتا تھا۔ کیسے رہتا تھا کیسے لوگوں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ اُس کی سوسائٹی کیسی تھی۔ عمر بھائی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ بس بے وقوفی کی جو جلدی میں تمہارا نکاح وہاں کر دیا۔ اُن باپ بیٹے کے ارادے کچھ اور ہی ہیں۔ اب تم بتاؤ میں کیا کروں؟ میں تمہیں تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے صرف تمہاری اجازت درکار ہے۔ کہ میں عدالت میں خلع کی درخواست دائر کر دوں"۔ دریکتا خاموش تھی۔ اُسے شریں نے دوبارہ پوچھا تو اُس نے ہولے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"تمہاری بھلائی اور بہتری کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ ورنہ اگر تمہاری مرضی یہ نہیں ہے تو میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کروں گا۔ دھوم دھام سے تمہیں رخصت کروں گا بیٹیوں کی طرح"۔ "نن نہیں تایا جان جو آپ کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے"۔ یکدم وہ بڑبڑا سی گئی جیسے اس خیال سے ہی گھبرا گئی ہو۔ اشعر کے ساتھ رخصت ہونے کے خیال سے ہی اُس کے پسینے چھوٹ گئے۔ اشعر کا غراہٹ بھرا لہجہ اور جنگلی گرفت اُس کی یادداشت میں تازہ تھی۔ اُسے کیا پڑی ہے ایک

فضول اور کرپٹ شخص کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کی۔ تایا جان اُس کے بھلے کی ہی بات کر رہے تھے۔ بڑے تھے بہتر جانتے تھے سب کچھ۔

اس کے ساتھ ساتھ ذہن کے کسی چور گوشتے میں کہیں کچھ غلط تو نہیں ہو رہا یہ سوال بھی کھلبلی مچا رہا تھا۔

☆☆☆

شوخ رنگ کی میرون شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس مائرہ نہا کے ابھی ابھی باتھ روم سے باہر نکلی تھی۔ گیلے بال سنوارنے کے بعد اُس نے کپڑوں کا ہمرنگ دوپٹہ اُٹھا کے شانوں پہ ڈالا اور خود کو آئینے میں غور سے دیکھا۔ آج کتنے عرصے بعد خود کو یوں دیکھا تھا۔

ورنہ بھدے، بے ڈول سراپے سوجھے ہاتھ پاؤں، زرد رخساروں سمیت خود کو دیکھنے سے اُسے ڈر لگتا رہا تھا۔ اب نہ تو اُس کا سراپا بے ڈول اور بھدا تھا نہ ہاتھ پاؤں سوجھے تھے اور نہ رخسار زرد تھے۔ اُس کا جسم پرانی سلم اور نرم حالت میں واپس آچکا تھا۔ نازک کمر، پیٹ پہلے کی طرح اندر اور اضافی چربی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اُس نے گھوم گھوم کے ہر زاویے سے خود کو دیکھا۔ کہیں سے بھی تو کوئی کمی نہیں لگ رہی تھی اور نہ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے دو ماہ پہلے کسی بچے کو جنم دیا ہے۔ ویسے ہی تنا ہوا کمان جسم اور وہی خدوخال تھے۔ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے اور ایک مغرور مسکراہٹ اُس کے لبوں پہ اُبھری۔

باسط ڈرائنگ روم میں آیا بیٹھا تھا۔ مائرہ کو اطلاع مل چکی تھی۔ پر ابھی تک وہ خالہ اور باسط سے جا کے ملی نہیں تھی۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ اُن کے سامنے جانا چاہ رہی تھی۔ باسط کی بے تاب نگاہیں اُسے ڈھونڈ رہی تھیں۔

وہ پُر غرور چال چلتی خالہ بینا کے سامنے جا رکی اور سلام کیا۔ اُنہوں نے کھڑے ہو کے اُس کا ماتھا چوما اور کتنی دیر سینے سے لگائے رکھا۔ مائرہ کو دیکھ دیکھ کے بینا کا کلیجہ جیسے خون ہو رہا تھا۔ اتنی کم عمری میں مائرہ کو یہ داغ لگ گیا تھا اور ایک بچے کی ماں بھی بن گی تھی۔ اُس کا دکھ بینا دل میں محسوس کرتی تھی۔ میرون کپڑوں میں ملبوس کھلے بالوں اور دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک بچے کی ماں بھی ہے۔ جب شاہ زیب پیدا ہوا تو مائرہ چند ماہ کی تھی۔

وہ اور شاہ زیب تقریباً ہم عمر تھے چند ماہ کا فرق تھا مائرہ شاہ زیب سے تین ماہ ہی چھوٹی تھی صرف۔ وہ بھی اتنی کم عمری میں یہ دنیا چھوڑ گیا اور مائرہ بھی یہ صدمہ برداشت کر گئی۔ اب آئندہ کے لیے اسے کوئی دکھ نہ دکھانا میرے رب ''بینا نے اُس کے لیے دل سے دعا کی تھی۔ مائرہ بینا خالہ سے ملنے کے بعد باسط کی طرف متوجہ ہوئی جو اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں میں شوق، وارفتگی، لگن اور ایک انجانا سا پیغام کتنا واضح تھا۔

اس خاموش پیغام کو مائرہ نے بہت جلد پڑھ لیا تھا۔ ''کیسے ہو باسط آپ۔ کب آئے ہو''۔ اُس کا انداز تخاطب بدل چکا تھا۔ باسط کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ مائرہ نے اُسے آپ کہہ کے مخاطب کیا۔ اُس کی سماعتوں کو دھوکا تو نہیں ہوا تھا۔ ''میں تو بالکل ٹھیک ہوں اور مجھے آئے ہوئے کافی سال ہو چکے ہیں''۔ وہ بہت شگفتہ لہجے میں بولا تو شریں کے ساتھ ساتھ بینا بھی ہنس پڑی۔ باسط تو ذرا بھی نہیں بدلا۔ حس مزاح ویسی ہی ہے''۔ شریں شہد آگئیں لہجے میں بولی۔ اتنے میں مائرہ باسط کے ساتھ قدرے فاصلے پہ بیٹھ گی۔ وہ اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ کھوج رہا تھا۔

شریں بینا کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ ''ارے مائرہ کا بیٹا کہاں ہے ابھی تک دیکھا نہیں ہے''۔

بینا کو خود ہی خیال آیا کہ اُنہیں آئے کافی دیر ہو گئی ہے مگر ابھی تک اُنہوں نے طیب کو نہیں دیکھا ہے۔ ''وہ سو رہا ہو گا میں زیبن سے کہتی ہوں لے آئے''۔ شریں آواز دینے لگی تھی کہ بینا نے روک دیا۔ ''رہنے دیں آپا جب جاگے گا میں دیکھ لوں گی''۔ ''چلو ٹھیک ہے''۔ شریں نے شکر ادا کیا۔

مائرہ کے بیٹے کے ذکر پہ باسط کا چہرا عجیب سا ہو گیا جیسے اُسے اچھا نہ لگا ہو۔

''آپا دریکتا کیسی ہے''۔ بینا نے جان بوجھ کے عمر کا نام لینے سے گریز کیا۔ ''وہ بھی ٹھیک ہے کالج گئی ہوئی ہے۔ میں آج کل بہت پریشان ہوں''۔ شریں نے اپنے تاثرات میں تاسف پیدا کر ہی لیا تھا۔ ''کیوں اُس کے کالج جانے سے آپ کیوں پریشان ہیں آپا'' بینا کو دریکتا کے کالج جانے اور شریں کی پریشانی کی وجہ میں کوئی تال میل محسوس نہیں ہوا تھا۔ ''ارے یہ کب کہا کہ میں اُس کے کالج جانے سے پریشان ہوں۔ بات اصل میں کچھ اور ہے۔'' شریں نے لہجے میں از حد پراسراریت بھر لی۔ ''کیا بات ہے آپا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں''۔ ''وہ دریکتا اپنے شوہر سے خلع مانگ رہی ہے''۔

شریں اپنی بات کہنے کے بعد اب بینا کے چہرے پہ اس کا ردعمل تلاش کر رہی تھی۔

''نہیں آپا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ دریکتا ایسی لگتی تو نہیں اور رخصتی سے پہلے ایسا کیا ہوا ہے جو وہ خلع مانگ رہی ہے''۔ بینا کی نگاہوں میں دریکتا کا حیران اور معصوم سا چہرا گھوم گیا۔ جس پہ وقت نے ابھی کوئی پختگی تحریر نہیں کی تھی۔ وہ دریکتا جس کی آنکھوں میں اب اُداسی نے ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ وہ کیسے اتنی بڑی بات کر سکتی ہے۔

''بس تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے''۔ شریں کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ اُس نے یہ جملہ بہت آہستہ آواز میں کہا۔ ''عمر نے کسی کو ٹھکرایا تھا اور آج کوئی اُس کی بیٹی کو ٹھکرا رہا ہے۔ عمر نے خود دریکتا کے رشتے کے لیے اپنے دوست سے کہا تھا۔ اور بیٹی اب خود ہی اپنے منہ سے خلع مانگ رہی ہے۔'' شریں نے اپنے تئیں جیسے کوئی عظیم انکشاف کیا تھا۔ بینا کو آپا کی یہ باتیں بُری لگی۔ اتنے برس گزر گئے وہ ابھی تک پرانی کڑواہٹوں کو دل میں رکھے ہوئے تھی۔ شکر تھا کہ باسط نے اُن کے وہ جملے نہیں سنے۔ جو آپا نے اُس کے اور عمر زیب کے حوالے سے کہے تھے۔ وہ مائرہ کے ساتھ باتوں میں لگا تھا جانے اُس پہ کیا اثر ہوتا۔ اُنہوں نے اپنے ماضی کے بدصورت باب کو اپنی اولاد سے پوشیدہ ہی رکھا تھا۔

بینا نے کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔ جانے کیا بات تھی جو بات خلع تک آ پہنچی تھی۔ ''ویسے آپا آپ کو سمجھانا چاہیے تھا اُسے کہ یہ حماقت نہ کرے''۔ ''خود مختار ہے دولت و جائیداد کا غرور ہے، فرح نے اپنے قاسم کے لیے اُمید لگائی ہوئی ہے کہ خلع ہو جائے تو وہ فائدہ اُٹھائے۔ ویسے ایک لحاظ سے ٹھیک ہی ہے۔ ارے وہ دریکتا کا شوہر کوئی اچھا نوجوان نہیں ہے۔ پولیس آفیسر ہے اور تمہیں تو پتہ ہے کہ پولیس والے کیسے ہوتے ہیں۔ پھر ہمارے خاندان کا بھی نہیں ہے۔ اچھا ہے دریکتا کو خلع مل جاتی ہے تو............''

بینا کو آپا شریں کے پل پل بدلتی باتوں پہ حیرت ہو رہی تھی۔ کہاں تو پہلے وہ خوش ہو رہی تھی اور اب دریکتا کو حق بجانب تصور کر رہی تھی۔ اُس نے شکر کیا کہ گفتگو کا موضوع تبدیل ہوا۔

عمر زیب بھی اسی حویلی میں تھا پر بینا کو جرأت نہیں ہوئی کہ اُسے ایک نظر دیکھ سکے۔ سب کہتے تھے وہ پاگل ہو گیا ہے دیوانہ ہو گیا ہے۔ شاہ زیب کی موت نے اُسے ہوش سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اُسے دُکھ ہوتا تھا۔ اُس میں اتنا حوصلہ

نہیں تھا عمر کو اس طرح اس حال میں دیکھنے کا۔ دل مسوس کر کے رہ گی۔

☆☆☆

باسط اور مائرہ باہر آ گئے تھے۔

باسط پرانی باؤلی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مائرہ کا کندھا اُس کے کندھے سے ٹکرا رہا تھا۔ دونوں اردگرد سے بے خبر تھے۔ ''پھر کیا سوچا ہے آئندہ کا''۔ بہت دیر کی چھائی خاموشی کو باسط نے ہی توڑا۔ ''میں کیوں سوچوں آئندہ کا۔ جس کا کام ہے وہ سوچے''۔ مائرہ شانے پہ آنچل درست کرتی اُس سے دور ہو کے بیٹھ گئی۔ ڈوبتے سورج کی الوداعی کرنیں اُس کے بالوں اور ماتھے کو بوسہ دے رہی تھی۔ باسط یک ٹک دیکھے گیا۔ کیا تھا اس چہرے میں کیسا سحر تھا اس وجود میں۔ جس نے کسی اور طرف دیکھنے ہی نہیں دیا تھا۔ نہ اتنی فرصت دی تھی کہ کسی اور کو سوچے۔ وہ پرائی ہو کے بھی پرائی نہیں تھی۔ باسط نے بارہا، خوابوں، خیالوں میں اُسے اپنے ساتھ دیکھا تھا۔ اُس کی لگن اُس کی چاہت کی شدت میں کچھ ایسا جنون کچھ ایسا خلوص تو تھا جو قدرت نے پھر سے باسط کے ساتھ مائرہ کے ملاپ کی راہ ہموار کر دی تھی۔

وہ اپنے جذبے پہ نازاں تھا۔

اپنی محبت پہ غرور تھا اُسے۔

وہ اُسے پھر سے حاصل کرنے جا رہا تھا۔

اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ جو اُسے مائرہ کے ساتھ ایک ہونے سے روک سکتی وہ اس پوزیشن میں تھا کہ سب رکاوٹوں کو عبور کر سکے۔ اب شریں خالہ کی بھی تو یہی آرزو تھی کہ مائرہ بیٹا کی بہو بن جائے۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ بیٹا کب اپنے منہ سے اس کا اظہار کرتی ہے۔ باسط کما رہا تھا اور اچھا خاصا کما رہا تھا۔ چھوٹی عمر میں ہی کماؤ پوت بن گیا تھا۔ اتنی سی عمر میں اُس نے بہت کچھ حاصل کر لیا تھا۔ دوسرے لڑکے اُسے حسد کرنے لگے تھے۔

خاندان کی عورتوں کے لیے وہ رول ماڈل تھا۔

''میں سوچ تو رہا ہوں''۔ ''کیا'' مائرہ بے تابی سے بولی۔ ''وہی جو مجھے کرنا چاہیے۔ میں اس بار اسی لیے آیا ہوں''۔ باسط نے واضح اشارہ دے دیا۔ مائرہ کا چہرہ کھل اُٹھا۔ ''اب میرے پاس سب کچھ ہے میں تمہیں حاصل کر سکتا ہوں''۔ اپنی خوشی میں مائرہ کو باسط کی حقارت بھری نظر کا احساس ہی نہیں ہوا۔

''اب تو شریں خالہ انکار بھی نہیں کریں گی بلکہ شکر کریں گی۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں''۔ باسط اُس کی طرف جھکا۔ مائرہ انکار ہی نہ کر سکی۔ بے بسی سے زمین کو تکنے لگی۔

آج باسط نے اپنی فتح کی طرف پہلا قدم بڑھا دیا تھا۔

مائرہ اب ناقابل حصول نہیں رہی تھی۔

ایک بچے کی ماں، جوان بیوہ، داغ لگا چاند۔

باسط کا جی چاہ رہا تھا۔ زور زور سے قہقہے لگائے۔ اُس کا پورا چہرہ ہلکی سی مسکراہٹ سے منور تھا۔

☆☆☆

طیب بہت بے چین تھا۔

زبین سے چپ ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ کندھے سے لگائے ٹہل ٹہل کے تھک گئی تھی۔ دریکتا اسامنٹ بنا رہی تھی۔ رات کو اُسے پڑھنے میں آسانی ہوتی تھی۔ طیب کے رونے کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ اُس نے پین بند کر کے رکھ دیا۔ اُسے طیب کے رونے سے عجیب سی بے قراری ہو رہی تھی۔

اُس نے زبین کے ہاتھوں سے طیب کو لے لیا تو اُس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ شل سی ہو رہی تھی۔ ''زبین طیب کیوں رویا ہے اتنا زیادہ''؟ ''چھوٹی بی بی اس کو بخار ہے ساتھ موشن لگے ہیں''۔ ''تو کوئی اسے ڈاکٹر کے پاس لے کے نہیں گیا''۔ دریکتا طیب کو تھپک رہی تھی۔

''میں نے شریں بی بی سے کہا کہ طیب کو بخار ہے۔ اُنہوں نے مجھے ڈانٹ دیا کہ میں کوئی ڈاکٹر ہوں جو مجھے بتا رہی ہوں۔ کوئی دوا دے دو۔ تو فریج میں جو سیرپ پڑا تھا وہ میں نے دے دیا''۔ زبین نے سادگی سے بتایا تو دریکتا سر پہ ہاتھ مار کے رہ گئی۔

''تو تم مائرہ بھابھی کو جا کے بتاتی ناں۔ خود سے اسے سیرپ دینے کی کیا ضرورت تھی''؟ دریکتا اُس پہ غصے ہو گی تو زبین نے نہ سمجھ آنے والی نگاہوں سے اُسے دیکھا کہیں وہ انجان بننے کا مظاہرہ تو نہیں کر رہی تھی۔

کیا اُسے اپنے گردونواح میں ہونے والی تبدیلیوں کی خبر نہیں ہے۔ ''مجھے شریں بی بی نے منع کیا ہوا ہے کہ طیب کے معاملے میں مائرہ بی بی سے کوئی بات نہ کی جائے۔ جب سے اُن کی بہن اور اُن کا بیٹا آیا ہے اُنہوں سے سختی سے کہا ہے کہ طیب کو مائرہ بی بی کی طرف نہ لایا جائے۔ اب اس میں میری کیا غلطی ہے''۔ وہ واقعی سچ کہہ رہی تھی۔ اس میں کیا دوش تھا ایک نوکرانی کا۔ وہ ایک معمولی سی تنخواہ پانے والی عورت تھی۔ مالکوں کو کیا کہہ سکتی تھی۔ اور مالک بھی بے حس انسانیت سے عاری۔ وہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی تھی۔ مائرہ نے طیب کو کبھی خود فیڈ نہیں کروایا تھا۔ رات کو وہ زبین کے پاس ہوتا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ اپنے بیٹے کو پیدا کر کے بھول گی ہے۔ ایسی بے حس ماں۔ اُس نے نہیں دیکھی تھی۔

''اچھا تائی شریں نے ایسا کہا ہے''۔ دریکتا نے خود کلامی کی۔ ''جی ہاں'' زبین نے اُس کی ہلکی سی بڑبڑاہٹ بھی سن لی تھی۔ ''طیب ساری ساری رات روتا ہے چپ ہونے میں ہی نہیں آتا''۔ زبین بے چارگی سے بولی۔ ''میں اسے خود سلاؤں گی۔ تم آرام کرو''۔ دریکتا طیب کو کندھے سے لگائے لگائے اسی طرح اپنے کمرے میں آ گی۔ زبین اُس کے پیچھے پیچھے طیب کا بستر بھی لے آئی۔ دریکتا نے طیب کی دیگر چیزیں بھی لانے کو کہا تو وہ خوش ہو گئی۔ کیونکہ طیب بہت چڑچڑا بچہ تھا۔ اپنی پیدائش کے وقت وہ موٹا تازہ اور سرخ سفید تھا۔

صرف دو ماہ میں ہی مرجھائے ہوئے پھول جیسا زرد ہو گیا تھا۔ اُوپر کا دودھ پینے سے اُس کا پیٹ خراب ہی رہتا۔ رات کو بستر گیلا کرتا تو زبین نیند کے نشے میں مدہوش ہوتی۔ کبھی پیمپر تبدیل کرتی کبھی سو جاتی۔ وہ روتا رہتا اور خود ہی تھک ہار کے نڈھال ہونے لگتا تو سو جاتا۔

زبین سب کچھ لے آئی۔ اس کی حرکات میں پھرتی تھی۔ ''اب یہ رات کو میرے پاس ہی رہے گا۔ ہاں دن کو تمہارے پاس ہوگا۔ اس کا اچھے طریقے سے خیال رکھنا۔ میں کل اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی میرے ساتھ چلنا''۔

''ٹھیک ہے میں ضرور جاؤں گی''۔ زبین نے سر ہلایا۔

☆☆☆

طیب اُس کی گود میں آتے ہی پُرسکون ہو گیا۔ دریکتا اُسے دیکھتے دیکھتے رو پڑی۔ اُس کے ایک ایک نقش میں شاہ زیب کی شباہت تھی۔ دریکتا کے بے آواز آنسو طیب کے معصوم چہرے پہ گرے تو وہ کسمسانے لگا۔ دریکتا نے اُنگلی کی

پوروں سے اُس کے چہرے سے آنسو صاف کیے تو وہ اپنی حیران آنکھیں کھولے اُسے تکنے لگا۔ دریکتا نے اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پہ رکھ دیئے۔ طیب اب ذرا بھی نہیں رو رہا تھا۔ کچھ منٹ بعد وہ بے خبر سو گیا تو دریکتا آہستگی سے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔

اُس کا رُخ برآمدے سے آگے باغ کی طرف تھا۔

اس وقت دل بے حد گھٹن کا شکار تھا۔ وہ کھلی فضا میں سانس لینا چاہ رہی تھی۔

صحن سے آگے برآمدے کے اختتام پہ دیوار تھی جس کے بیچوں بیچ چھوٹا سا لکڑی کا دروازہ بنا ہوا تھا۔ اس دروازے کی دوسری جانب باغ تھا۔ کبھی کبھی وہ اُدھر گھومنے چلی جاتی تھی۔ وہاں اُسے سکون ملتا تھا۔ مگر رات کے اس وقت وہ سکون سے وہاں بیٹھ کے کچھ سوچنا چاہ رہی تھی۔

دروازہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ اُس نے زیادہ غور نہیں کیا اور دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی آگے بڑھتی گی۔ کچھ فاصلے پہ سنگ مرمر کی بنچ بنی ہوئی تھی۔ وہ وہاں بیٹھ گئی اور سر پیچھے کی طرف جھکا دیا۔

کچھ دیر میں ہی اُسے احساس ہوا کہ اُس کے اِردگرد کوئی اور بھی موجود ہے۔ وہ اکیلی نہیں ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر دوڑ گی۔ ہلکی ہلکی آوازیں اُس کی سماعتوں سے ٹکرائیں ساتھ ہی قدموں کی آواز اُبھری۔ قدموں کی چاپ اسی طرف قریب آتی لگ رہی تھی۔ اُس کے جسم کے مساموں نے ٹھنڈا پسینہ اُگلنا شروع کر دیا۔

درختوں کے سائے سے دو ہیولے اُبھرے۔ قریب آنے پہ اُس نے پہچان لیا کہ یہ مائرہ اور اُس کا کزن باسط ہے۔ کل شام ہی تو وہ لوگ آئے تھے۔ اور دریکتا اُن سے ملی تھی۔ ثریں نے کچھ دن کے لیے یہیں رُکنے پہ اصرار کیا تھا۔ سو وہ لوگ اِدھر ہی تھے۔

مائرہ کا نقرئی قہقہہ دریکتا کی سماعتوں سے ٹکرایا تو وہ فوراً پیچھے ہو گئی۔ اُن دونوں کی نظر اُس پہ نہیں پڑی تھی۔ باتیں کرتے چلتے ہوئے دوسری سمت کی طرف مڑ گئے۔ دریکتا نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مائرہ کا کندھا چلتے ہوئے باسط سے ٹکرا رہا تھا۔ دونوں پاس پاس ہو کے ہی تو چل رہے تھے۔ دریکتا کی آنکھوں میں کچھ چبھنے لگا۔ دل پہلے بھی گھٹن کا شکار تھا۔ اب اور بھی بوجھل ہو رہا تھا۔ دُکھ، افسوس، حیرانی، بے چارگی، بے بسی، یا کچھ اور۔ وہ اس وقت اپنے احساسات کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھی۔

ہاں آنکھوں میں جیسے ریت چبھ رہی تھی۔

مائرہ اور باسط دوسری طرف مڑ گے۔ اُن کی پشت دریکتا کی طرف تھی۔ باسط کا ہاتھ مائرہ کی کمر پہ تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اُس نے بے دھیانی میں یہ فعل سرانجام دیا ہے اور مائرہ بھی بے خبر ہے۔

دریکتا کے دماغ میں جیسے ایک خیال خود بہ خود ہی پختہ ہو گیا کہ طیب نے باپ کے بعد ماں کو بھی کھو دیا ہے۔ یہ خیال کتنا سفاک اور بے رحم تھا کوئی دریکتا سے پوچھتا۔ اُس کی ٹانگوں نے تو اُس کا بوجھ ہی سہارنے سے انکار کر دیا۔ کتنی دیر سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔

کہیں طیب جاگ نہ گیا ہو۔ اس خیال نے اُس نے حوصلوں کی گرتی دیوار کو مضبوط کیا اور وہ اُٹھنے کے قابل ہوئی۔

طیب اُسی طرح بے خبری کی نیند سویا ہوا اپنے ساتھ ہونے والے ظلم اور ناانصافی سے لاعلم تھا۔

کبھی کبھی یہ لاعلمی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔

☆☆☆

طاہر لغاری فون کان سے لگائے دوسری طرف سے آتی آواز کو خاموشی سے سن رہے تھے۔

"طاہر بھائی میں اور آپ سے کیا کہوں۔ عمر میرا چھوٹا بھائی ہے اُس کے ناطے سے آپ میرے بھی چھوٹے بھائی ہو۔ اشعر میاں کو سمجھائیں کہ اپنی ضد چھوڑ دے۔ میں نے دریکتا کو بہت سمجھایا ہے۔ میں اُسے مار تو نہیں سکتا نہ اُس کے ساتھ زبردستی کر سکتا ہوں۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ دونوں خاندانوں کی عزت عدالت میں اُچھلے۔ اشعر خود ہی خلع دے دے۔ آپ بات کریں بیٹا ہے آپ کا"۔ اورنگزیب کی ایک ہی رٹ تھی۔

"میں خود دریکتا سے ملنا چاہتا ہوں۔ اُس سے ایک بار سبب معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہم سے بدظن کیوں ہو گئی ہے"۔ "طاہر بھائی وہ نہیں ملنا چاہتی بات تک نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے اسی لیے آپ کو فون کیا ہے۔ اشعر جذباتی ہے جوان خون ہے"۔

"میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اتنے چاؤ اور ارمانوں سے عمر نے یہ رشتہ نکاح کیا اور اب ہم اسے ختم کر دیں۔ آپ کس طرح کی بات کر رہے ہیں۔ یہ کوئی گڈی گڈے کا کھیل تو نہیں ہے"۔

میں اشعر سے کس طرح کہوں کہ وہ خلع دے دے۔ عمر اپنے حواسوں میں ہوتا تو اور بات تھی۔ دریکتا بے وقوف ہے اور آپ بھی اُس کی بے وقوفی میں اُس کا ساتھ دے رہے ہیں۔" طاہر قدرے غصے میں آ گئے تو دوسری طرف موجود اورنگزیب کے لیے بھی مزید اداکاری جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔"

"ٹھیک ہے پھر اب عدالت میں ہی ملاقات ہو گی۔ آپ گھر کی بات گھر میں نہیں رکھنا چاہتے تو مرضی آپ کی"۔ اُنہوں نے کھٹاک سے فون ہی بند کر دیا۔ شکر کا مقام تھا کہ اشعر نہیں تھا اور اُس نے کوئی بات نہیں سنی تھی۔ ورنہ اُسے سنبھالنا ایسا ہی تھا۔ جیسے کسی بپھرے ہوئے شیر کو واپس پنجرے میں داخل ہونے پہ مجبور کرنا۔

اُن کا ذہن مختلف سمتوں میں سوچ رہا تھا اور ہر سوچ ایک ہی بات پہ ختم ہو رہی تھی کہ خلع کا فیصلہ دریکتا کا اپنا نہیں ہے۔ اُسے مجبور کیا گیا ہے۔ یا تو دھمکی دی گی ہے یا کوئی اور بات ہوئی ہے جو وہ انتہائی قدم اُٹھانے پہ مجبور ہوئی۔ طاہر لغاری اب ہر صورت اُسے ملنا چاہ رہے تھے۔ وہ نہ صرف اُن کے عزیز دوست کی بیٹی بلکہ اُن کے بیٹے کی منکوحہ بھی تھی۔ کوئی اُنہیں ملنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ بس یہ بات اشعر کو معلوم نہیں ہونی چاہیے تھی کہ وہ دریکتا سے ملنے گئے ہیں۔

وہ گاؤں حویلی میں تھی اور گاؤں اتنا دور نہیں تھا۔ اشعر سے کوئی مناسب سا بہانہ کیا جا سکتا تھا۔

حالات خطرناک رُخ اختیار کر رہے تھے۔ "اللہ عمر اور اُس کے خاندان پہ رحم کرنا"۔ اُنہوں نے ہاتھ اُٹھا کے دعا کی۔

☆☆☆

طاہر لغاری جلدی جلدی ناشتہ کر رہے تھے۔ اُن کے برعکس اشعر آرام آرام سے کھا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے جاگنگ کر کے آیا تھا نہا کے فریش ہونے کے بعد ناشتے کی ٹیبل پہ آیا تو پاپا اُسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اُس کے آتے ہی

اُنہوں نے چائے کے لمبے لمبے گھونٹ بھرے۔اور سلائیس کے دوتین نوالے لیے۔

''پپا آج بہت جلدی میں ہیں کہیں جانا ہے''۔اشعر ہاتھ روک کے اُنہیں تکنے لگ گیا۔''ہاں میں نے سیالکوٹ جانا ہے۔اپنے ایک دوست سے ملنا ہے۔فاروقی صاحب سے۔ایکہ کام ہے۔ڈرائیور کے ساتھ جاؤں گا۔ اوررات تک آجاؤں گا۔ بلکہ پہلے لوٹ آؤں گا۔کون سا میں نے وہاں پہ قیام کرنا ہے''۔وہ نظریں چرائے چرائے بول رہے تھے۔

''اوکے پپا میں بھی نکلتا ہوں۔آفس کے لیے۔فاروقی انکل کو میرا بھی سلام کہیے گا''۔''ہاں بیٹا ضرور کہوں گا''۔''اوکے پپا اللہ حافظ''۔اُس نے ٹیبل سے موبائل فون اور گاڑی کی چابی اُٹھائی۔''خیریت سے جاؤ اور خیریت سے آؤ''۔لمبے چوڑے خوبرو سے بیٹے کو اُنہوں نے دل سے دعا دی۔

ڈرائیور طاہر لغاری کے انتظار میں تھا۔اشعر کے نکلتے ہی طاہر نے بھی اُسے گاڑی اسٹارٹ کرنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

شریں کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ طاہر لغاری گاؤں اُن کے گھر بھی آسکتے ہیں۔ نہ اورنگزیب نے اس حوالے سے اُسے گائیڈ کیا تھا۔اُنہیں سجے ہوئے خوبصورت ڈرائنگ روم میں بیٹھا چھوڑ کر وہ خود دریکتا کے پاس آگئی۔ اُسے بتانا اور پڑھانا ضروری تھا۔ورنہ ساری محنت پہ پانی پھر جانا تھا۔''اُٹھو دریکتا میرے ساتھ ڈرائنگ روم تک چلو۔ طاہر لغاری آیا ہوا ہے۔وہ تو لڑنے کے موڈ میں ہے۔تم نے بس یہ کہنا ہے کہ تمہیں خلع چاہیے۔اگر اس موقعے پہ تم نرم پڑ گی تو ساری زندگی روتی رہو گی اور یہ لوگ تمہیں طعنے دے دے کے مار ڈالیں گے۔ پہلے خود اُس کے بیٹے نے فائرنگ کروائی تمہارے گھر۔پھر اورنگزیب سے بدتمیزی کی اور اب لڑنے کے لیے گھر چلے آئے ہیں۔آؤ اپنا دل مضبوط کرو اور میں نے جو کہا ہے وہ سب طاہر لغاری سے کہہ دو۔تا کہ اُسے یقین آجائے کہ تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر رہا۔ورنہ یہ لوگ ہماری جان کو آجائیں گے''۔

شریں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑے ہوئے تھے۔ورنہ وہ اس قدر اور اتنی جلدی حواس باختہ ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔

''ٹھیک ہے تائی۔آیئے میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں''۔اپنی توہین کا احساس رگ رگ میں جاگ پڑا تھا۔ اُس کے قدموں میں تیزی تھی۔ طاہر لغاری اُسے دیکھ کے فرط محبت سے اُس کی طرف بڑھے۔ پر وہ بچتی، اُن سے گریزاں اُنہیں نظر انداز کرتی۔ جا کے دور بیٹھ گی۔

طاہر لغاری کے اُٹھے ہوئے ہاتھ اُن کے پہلو میں گر گئے۔''کیسی ہو بیٹا'' اُن کے دل کا دُکھ اُن کے لہجے سے جھانک رہا تھا۔دریکتا کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں مسلا۔اُسے لگا کہ جیسے وہ ٹھیک نہیں کر رہی ہے۔''ہاں بھائی صاحب دریکتا آگئی ہے۔جو کہنا ہے کہیں جلدی''۔شریں کا انداز اہانت آمیز تھا۔طاہر کو بڑی مشکل سے ہضم ہوا نظر انداز کر کے وہ دریکتا کی طرف متوجہ ہوئے جو سر جھکائے ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی یہاں ہوتے ہوئے بھی اس ماحول اور اس منظر کا حصہ نہیں لگ رہی تھی۔''بیٹا تمہیں مجھ سے یا اشعر سے کوئی شکایت ہے تو بتاؤ۔ میں تمہارے خلع کے مطالبے سے بہت اپ سیٹ ہوں اور اشعر بھی غصے میں ہے۔میں اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ شکوے شکایت تمہارے دل میں ہیں اُنہیں سنوں اور پھر دور کروں''۔وہ کتنی محبت سے بول رہے تھے۔نہیں نہیں طاہر انکل ایسے نہیں ہو سکتے جس طرح اُس نے سنا

اُس نے بے بسی سے سر دائیں بائیں جھٹکا۔شریں کی وارننگ دیتی نگاہ اُس سے ٹکرائی تو جیسے ہوش آگیا۔ساری ...یں فنا ہو گئیں یاد رہا بھی تو اتنا کہ طاہر انکل اور اشعر لغاری نے اُس کے گھر پہ فائرنگ کروائی۔اورنگزیب تایا کی بے ...ی کی۔اور اشعر کوئی اچھا انسان نہیں ہے۔اُس کی نسوانیت اور عزت نفس کے نازک شیشے کو کرچی کرچی کرنا چاہتا ہے۔ ...میں تو کوئی شک ہی نہیں تھا۔دوبار کا تصادم دریکتا کو ابھی تک یاد تھا۔

ہاسپٹل میں تو اُس نے صاف دھمکی دی تھی۔اس نے اسے سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔اُس کا رویہ ہی منہ ...ثبوت تھا۔

''جی انکل مجھے خلع چاہیے۔میں اس رشتے کو مزید آگے بڑھانا نہیں چاہتی۔میری طرف سے اسے آج ختم ...سمجھیں۔میرے ساتھ کسی نے زور زبردستی نہیں کی۔ یہ سراسر میرا اپنا ذاتی فیصلہ ہے''۔اس نے بہت صاف اور مضبوط ...لہجے میں کہا۔ایک ایک لفظ کا مفہوم واضح تھا۔کوئی ابہام نہیں تھا۔

اتنا کہہ کے دریکتا باہر آگئی۔اُسے ایسے لگا کہ اگر کچھ دیر اور وہاں بیٹھی تو طاہر انکل کے دھواں ہوتے چہرے کو ...نہیں پائے گی جہاں حیرت، بےیقینی ثبت ہو کے رہ گئی تھی۔

''بھائی صاحب آپ نے سن لیا ہے ناں دریکتا کی زبانی سب کچھ۔ وہ یہاں بہت خوش ہے۔ہم سب اُس کے اپنے ہیں۔اُس کے دکھ درد کے ساتھی۔ یہاں آکے وہ اپنے غم بھول گئی ہے۔اسے عمر بھائی کا فیصلہ اپنے لیے ...مناسب لگا تو اُس نے لب کھولے کہ مجھے خلع چاہیے۔یہ اُس کا حق ہے کہ وہ اپنے لیے جو بھی پسند کرے۔کوئی اُس کے ...ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا۔ہمارا مذہب اسلام بھی لڑکی کو اپنی پسند ناپسند بتانے کا بڑوں تک اپنی بات پہنچانے کا پورا پورا حق ...دیتا ہے۔یہ کوئی پرانا زمانہ نہیں ہے۔جب لڑکیوں کے ساتھ زبردستی کی جاتی تھی۔عمر بھائی نے اُسے بغیر پوچھے آپ کے ...بیٹے سے اُس کا نکاح کر دیا۔اب وہ اس بات کا اختیار رکھتی ہے کہ چاہے تو اس نکاح کو برقرار رکھنے چاہے تو ختم کر دے۔ پڑھی لکھی ہے سمجھدار ہے۔اُس کے انکار کی ایک وجہ اُس کی اپنی پسند بھی ہے......شریں کچھ دیر سانس لینے کے ...رکی تو طاہر لغاری بے تاب ہو گئے کہ جانے ان خاتون کے منہ سے کون سا انکشاف سامنے آئے۔

''وہ میرے بیٹے عاشر کو پسند کرتی ہے اور عاشر بھی''۔طاہر کے حواس تھرا گئے۔اس طرف تو اُن کا خیال کبھی ...گیا ہی نہیں تھا کہ دریکتا کسی کو پسند بھی کر سکتی ہے۔طاہر لغاری نے عمر زیب کے آفس میں ایک بار عاشر کو دیکھا تھا۔ ...چھوٹے قد کا موٹا سا لڑکا جو شکل سے ہی جھگڑالو اور تیز نظر آتا تھا۔اس میں کوئی ایسی خاص کشش نہیں تھی جو دریکتا اُسے ...پسند کرتی۔پر اُنہیں یقین دلایا جا رہا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔اُن کی طبیعت مکدر سی ہو گئی۔جلد از جلد وہ یہاں سے نکلنا چاہ ...رہے تھے۔مگر جانے سے پہلے وہ ایک نظر عمر کو دیکھنا چاہ رہے تھے۔ پر سامنے جو خاتون بیٹھی تھی وہ اس خواہش کو پورا نہیں کر ...سکتی تھی۔سو خاموشی سے حویلی کا آہنی گیٹ عبور کر کے باہر آگئے۔

ڈرائیور خلاف توقع اُنہیں اتنا جلدی آتا دیکھ کر الرٹ ہو کے بیٹھ گیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ طاہر خاموشی ...سے پچھلی سیٹ پہ نیم دراز ہو گئے۔جیسے میلوں دور سے پیدل چل کے آئے ہوں۔

واپسی کا سفر بڑی تکلیف دہ تھا۔آتے ہوئے اُمید کے ہزاروں ننھے مُنے جگنو اُن کی مٹھی میں تھے۔جو راستے ...میں کہیں رہ گئے تھے۔

اشعر کو کیسے بتائیں گے کیا دلائل دیں گے کس طرح وہ اُن کی بات مانے گا۔اب یہی پریشانی اُن کے دماغ

پہ سوار تھی۔

☆☆☆

دریکتا طیب کو کندھے سے لگائے ٹہل ٹہل کے سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آج پھر اُس کی طبیعت خراب تھی
اور وہ چڑچڑا ہو رہا تھا۔ صبح سے اُلٹیاں کر کر کے بے حال ہو رہا تھا۔ اُس نے تائی شریں کو بتایا تو اُنہوں نے لاپروائی
زیبن کے ساتھ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ مائرہ اُن کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ ''بھابھی آپ طیب کو پکڑیں
چادر اوڑھ لوں پھر جاتی ہوں ڈاکٹر کے پاس''۔ دریکتا نے طیب کو مائرہ کی جانب بڑھایا۔ اُس نے ہاتھ آگے کر کے طیب
گود میں اُٹھانے کے بجائے کہا یہاں صوفے پہ لٹادو۔ وہ اپنے ناخنوں کی تراش خراش میں لگی ہوئی تھی۔ دریکتا ناچار طیب
کو صوفے پہ لٹا کے چادر لینے آئی۔ وہ جیسے ہی اُسے لٹا کے گئی اُس نے پیچھے سے گلا پھاڑ پھاڑ کے رونا شروع کر دیا۔ مائرہ
نے روتے ہوئے طیب کو ایک نظر دیکھا۔ اتنے میں شریں نے زیبن کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔ وہ بھاگی بھاگی آئی
''طیب کو اُٹھاؤ رو رہا ہے''۔ اُنہوں نے شان بے نیازی سے حکم دیا۔ اتنے میں دریکتا واپس آگئی اور طیب کو زیبن سے
واپس لے لیا۔ مائرہ اُسی بے نیازی سے ناخنوں کے ساتھ مصروف عمل تھی۔ اس اعلیٰ درجہ کی بے حسی کے مظاہرے پہ دریکتا
دل ہی دل میں بل کھا کے رہ گی۔

جیسے اپنے ناخنوں کو شیپ دینے کے علاوہ کوئی ضروری کام ہے ہی نہیں۔

''دریکتا نے طیب کو اچھے طریقے سے سنبھال لیا ہے۔ زیبن بھی ساتھ دیتی ہے اس کا''۔ اُن دونوں کے جانے
کے بعد شریں تعریفی لہجے میں بولی۔ تو مائرہ سر ہلا کے رہ گئی۔ وہ دل ہی دل میں حساب لگا رہی تھی کہ باسط بینا خالہ کو کب
بھیجے گا۔ وہ وعدہ کر کے گیا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر امی رشتے کے لیے آئیں گی۔ اُسے گئے ہوئے پانچ دن ہو گئے
تھے۔ ''مائرہ تمہارا دھیاں کہاں ہے میں کتنی دیر سے بول رہی ہوں''۔ شریں نے اُس کی عدم توجہ محسوس کر لی۔ ''اوہو جی
امی، آپ نے کچھ کہا''۔ وہ ہڑبڑا کے اُن کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''کن سوچوں میں گم ہو''۔ ''وہ امی......'' مائرہ کہتے کہتے
دیر رُکی۔ ''باسط نے کہا تھا کہ جا کے امی کو بھیجوں گا رشتے کے لیے''۔ ''ہاں مجھے بھی اس نے ایسا اشارتاً کہا تھا۔ اگر ایسا
جانا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔ تمہارے تو نصیب کھل جائیں گے۔ باسط کا بزنس بہت اچھا ہے۔ پتہ نہیں حمزہ بھائی مانیں
گے کہ نہیں''۔ شریں بہنوئی کی طرف سے تھوڑا مایوس ہوئی۔ پہلے اُنہوں نے بہت چاؤ سے رشتہ مانگا تھا۔ اُس وقت شریں
نے بہانہ کیا کہ اورنگزیب اپنے بھائی کو زبان دے چکے ہیں ساتھ یہ کہ مائرہ ابھی پڑھ رہی ہے۔

تب شریں کے بہنوئی حمزہ نے کہا کہ باسط بھی تو پڑھ رہا ہے ابھی۔ ہم کون سا ابھی شادی کرنے والے ہیں
حمزہ بھانپ گیا تھا کہ اُس کی سالی بہانہ کر رہی ہے اب شریں کو اُسی بات کا ڈر تھا۔

''امی میرے دل میں بھی یہ بات تھی کہ ہوسکتا ہے حمزہ خالو نہ مانیں۔ پر باسط نے کہا ہے کہ اُس کی بات ٹالنے
کی جرأت گھر والوں میں نہیں ہے''۔ شریں کا مرجھایا چہرہ کھل سا اُٹھا۔ ''یہ تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔ آخر کو کما کے سب کو کھلا
ہے ہر سکھ دیا ہوا ہے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو۔ اور پھر تم میں کیا کمی ہے جو کسی کو اعتراض ہوگا۔ بیٹے کی ماں بنی اس
پہلے شاہ زیب فوت ہوا یہ اللہ کی طرف سے تھا اور تمہاری قسمت میں تھا۔ تمہارا بیٹا دریکتا سنبھال رہی ہے۔ کون سا تم
کے بعد اُسے ساتھ رکھو گی جو کوئی اعتراض کرے گا۔ بینا اور حمزہ آئے تو میں یہ بات اُن کے کانوں میں ڈال دوں گی
سے اچھا اثر پڑے گا''۔

مائرہ اپنی ماں کی عقل مندی پہ دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ کتنی معاملہ فہم اور دور اندیش تھی۔

☆☆☆

حمزہ احمد اور بینا حیرت سے باسط کی طرف دیکھ رہے تھے جس نے ابھی ابھی کچھ عجیب سی خواہش کا اظہار کیا
''ابو میں مائرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں وقت کم ہے میرے پاس۔ اس لیے آپ کو جلدی گاؤں جا کے بات کرنی
ہوگی''۔ اُس کا انداز دو ٹوک اور غیر لچکدار تھا۔

بینا کو یہ تو پتہ تھا کہ باسط کسی زمانے میں مائرہ کو پسند کرتا تھا۔ پر وہ پسندیدگی اور جنون ابھی تک برقرار تھا۔ اس
کا اندازہ آج سے پہلے اُسے نہیں ہوا تھا۔

''ایک بات بتا دوں۔ اگر مائرہ نہیں تو کوئی بھی نہیں میں انکار اور مخالفت برداشت نہیں کروں گا کسی بھی
صورت۔ اس لیے میری خوشی میں آپ بھی خوش ہو جائیں''۔ وہ نہ جانے اُن کی خاموشی سے کیا سمجھا تھا کہ تھوڑا تلخ ہو گیا۔

بینا نے حمزہ احمد کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی ہار تسلیم کر چکے تھے۔ باسط کا باپ ہونے کے ناطے اُس کی ضد سے
اچھی طرح واقف تھے۔ اور اب تو وہ ایسی پوزیشن میں بھی تھا کہ اپنی ضد منوا بھی سکے۔

یہاں قدرت بھی اُس کا پورا پورا ساتھ دے رہی تھی۔ سب راستے ہموار ہوتے چلے جا رہے تھے۔ کسی جگہ کوئی
رکاوٹ نہیں تھی۔

اُسے اپنی خوش قسمتی پہ ناز تھا۔ ایک خوشی کی اطلاع دوبئی سے اُس کے پارٹنر نے بھی دی تھی کہ اس دفعہ کا مال
مارکیٹ میں بہت اچھے داموں بکا ہے۔ اُنہیں اعلیٰ کوالٹی کی ہیروئن ضرورت سے زیادہ کم ریٹ پہ ملی تھی اور وہی ہیروئن بعد
میں اُن کے اندازے سے زیادہ مہنگے داموں فروخت ہوئی۔ باسط کی خوشی حد سے سوا تھی۔

اور اب امی ابو نے بھی خاموشی کی زبان میں اقرار کر لیا تھا کہ اُنہیں اُس کی خواہش اُس کی خوشی ہر چیز سے
عزیز ہے۔

وہ شریں خالہ کے گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ اُس کی خواہش کے عین مطابق۔
''کیا قسمت پائی ہے مائرہ نے بھی''۔ بینا اور حمزہ احمد اس وقت شریں اور اورنگزیب کے گھر موجود تھے اور اپنا
مدعا زبان پہ لا چکے تھے۔ شریں نے سب کا منہ میٹھا کرایا۔ فرح اور فوزیہ بیک وقت مائرہ کے بارے میں سوچ رہی
تھیں۔ شریں نے بڑے بڑے لڈو اُن دونوں کے منہ میں ٹھونسے تھے۔ ''اللہ اس بار مائرہ کے نصیب اچھے کرے''۔
فوزیہ نے پُرخلوص دعا دی تو شریں نے دل کی گہرائی سے آمین کہا۔ ''پہلی بار بھی مائرہ کے لیے شاہ زیب کا
رشتہ آیا اور اب باسط کا۔ کتنے اچھے نصیب پائے ہیں اس نے''۔ فرح چچی نے آہستہ آواز میں اظہار خیال کیا تو فوزیہ نے
اُنہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ شریں سن لیتی تو خواہ مخواہ نئی بحث چھیڑ جاتی۔
فرح ویسے بھی آج کل شریں اور نگزیب سے کبیدہ خاطر ہو رہی تھی نہ جانے کیوں اُسے اُن دونوں کی نیت پہ
شک ہو گیا تھا۔ ''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں جانے باسط کو کیسے قابو کیا ہے۔ اور خود مائرہ کو تو اپنے معصوم بیٹے کی کوئی پرواہ ہی
نہیں ہے۔ زیبن کے حوالے کیا ہوا ہے۔ ایسی ماں ہم نے تو نہیں دیکھی''۔ فرح نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔
فوزیہ دیکھ کے رہ گئی۔ کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہی تھی۔ مائرہ کو طیب کی ہوش ہی نہیں تھی۔ کبھی دریکتا تو کبھی زیبن کے پاس ہوتا۔
شریں کو بھی تو اُس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اُن ماں بیٹی پہ عجیب سی بے حسی طاری تھی۔ دریکتا ٹھہری ایک کنواری ناتجربہ کار

میں اچھا نہیں ہوگا''۔ باسط نے صاف اور دوٹوک بات کی۔ اُس کا خیال تھا مائرہ یہ بات سن کے روئے گی اُس کی منت کرے گی کہ نہیں نہیں مجھے میرے بچے سے الگ مت کرو۔ اُسے بہت دکھ ہوگا پر مائرہ بولی تو اُس کا لہجہ بہت نارمل سا تھا۔ جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ ''ٹھیک ہے باسط ایسا ہی ہوگا۔ طیب حویلی میں ہی رہے گا''۔

باسط کے ذہن سے یہ بوجھ بھی اُتر گیا۔ مائرہ نے خلاف توقع آرام سے اُس کی بات مان لی تھی۔

یہی بات باسط نے جب بینا کو بتائی تو کتنی دیر وہ خاموش رہی۔ اُس سے بولا ہی نہیں گیا۔ جیسے اُسے رنج ہوا ہو۔ ''باسط ایک بچے کو اُس کی ماں سے مت الگ کرو۔ اُس کا دل بچے میں ہی اٹکا رہے گا۔ وہ تمہیں خوش نہیں رکھ پائے گی۔ اُسے دو کشتیوں کا سوار مت بناؤ''۔

''امی پلیز، یہ میری زندگی ہے۔ مَیں اس پہ کسی اور کے بچے کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ نہ میرا ظرف اتنا بڑا ہے کہ میں مائرہ کے بچے کو باپ کا پیار دے سکوں۔ نہ میں اتنا عظیم ہوں اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اُنہیں بولنے سے روک دیا''۔

☆☆☆

نہ نہ کرتے ہوئے بھی اورنگزیب نے اچھے خاصے مہمانوں کو مدعو کر لیا تھا۔

مائرہ کی رخصتی میں صرف دو دن باقی تھے۔ اور ابھی بھی اُسے بہت سی وہ چیزیں یاد آ رہی تھی جن کی شاپنگ ضروری تھی۔ شریں نے آج نہ جانے کس طرح دریکتا کو مائرہ کے ساتھ جانے کا بول دیا۔ ''تم بھی جاؤ سائرہ بھی جا رہی ہے۔ اپنے لیے کپڑے وغیرہ لے لینا۔ جب سے تم گاؤں آئی ہو ایک بار بھی شاپنگ کے لیے نہیں کہا ہے تم نے سو ضروریات ہوتی ہیں۔ لڑکی ذات ہو۔ کوئی اچھا سا سوٹ لینا۔ مائرہ کی رخصتی پہ پہننے کے لیے''۔

وہ اُس کے دل کی حالت سے بے خبر بول رہی تھی۔ دریکتا نے نفی میں سر ہلایا پر شریں نے ہاتھ اُٹھا کے روک دیا۔ اُسے یاد آیا کہ طیب کو پرانے کپڑے کچھ تنگ تنگ اور چھوٹے چھوٹے ہیں۔ کیوں نہ طیب کے لیے کچھ خریداری کی جائے۔ اس خیال سے وہ اُن کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوئی۔ ورنہ دل اندر سے بے پناہ اُداس تھا۔ وہ مائرہ بھابھی کی خوشیوں سے حسد نہیں کر رہی تھی پرانی یادیں دل کو دکھی کر رہی تھیں۔ ایک دن مائرہ اسی طرح رخصت ہو کے شاہ زیب کے سنگ اُن کے گھر دولہن بن کے آئی تھی تو اُن کے گھر بھی خوشیوں، رنگوں اور چاہتوں کی بارات اُتری تھی۔ پپا نے بانہوں کے گھیرے میں لے کے مائرہ بھابھی کے سنگ دہلیز سے اندر پاؤں رکھا تھا۔ اُنہیں کالج کی نازک گڑیا کی طرح تھام کے گھر میں لائے تھے۔ اُن کا صدقہ اُتارا تھا۔ اور شاہ زیب بھائی کتنے خوش تھے اُس دن۔

اُن کا خوبرو چہرا خوشیوں کی جگمگاہٹ سے جھل مل کر رہا تھا۔

دریکتا کے پاس یادیں ہی تو تھی۔ اُس نے حال سے فرار ڈھونڈ لیا تھا۔

☆☆☆

مائرہ نے اپنے لیے سینڈل خریدے۔ سائرہ کو دو سوٹ پسند آ گئے اُس نے منہ مانگی قیمت دکاندار کو دی۔ دریکتا نے اندازے ناپ بتا کے طیب کے لیے کپڑے خریدے۔ کافی گھنٹے سے وہ سائرہ اور مائرہ کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ اُنسے اپنے لیے کچھ لینے کی آرزو نہیں تھی۔ مائرہ نے خود اُس کے لیے کچھ سوٹ پسند کیے اور پیک کروائے۔ آخر کو وہ طیب کی پھوپھو تھی۔ اُس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ اتنا تو اُس کا حق بنتا ہی تھا۔ دریکتا ناں ناں ہی کرتی رہی۔ مائرہ نے خود ہی اُس

لڑکی اُسے بچے پالنے یا سنبھالنے کا وہ خاص سلیقہ نہیں تھا جو قدرت کی طرف سے ایک ماں کو ودیعت کیا جاتا ہے۔

اپنی طرف سے وہ جو ہوتا کرتی تھی پھر بھی کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی تھی۔ طیب کبھی پیٹ کبھی کان کے درد سے روتا تو دریکتا کو سمجھ ہی نہ آتی۔ یہ سب ایک ماں ہی جان سکتی تھی اپنے بچے کی ادائیں، عادتیں، سونے جاگنے کے اوقات اور طیب کی ماں بے حس ہو چکی تھی۔

زیبن نوکرانی تھی رات میں دریکتا سنبھال لیتی۔ دن میں اُسے ہی دیکھ بھال کرنی پڑتی۔ طیب اُس کے پاس آتے ہی گلا پھاڑ پھاڑ کے رونے لگتا۔ وہ اُٹھا اُٹھا کے زچ پڑ جاتی۔ اُس کی کوٹھڑی میں افیم پڑی رہتی تھی جو اُس کا میاں استعمال کرتا۔ زیبن چپکے سے تھوڑی سی افیم طیب کو بھی چٹا دیتی۔ وہ بھی سکون سے سویا رہتا اور زیبن بھی فارغ ہو جاتی۔

شریں یا مائرہ میں سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کہ طیب اتنی اتنی دیر کیوں سویا رہتا ہے۔ جس دن دریکتا گھر ہوتی اُس دن زیبن طیب کو افیم نہیں چٹاتی تھی۔

☆☆☆

مائرہ شادی کی شاپنگ شروع کر چکی تھی۔ کبھی فوزیہ یا فرح چچی میں سے کوئی ساتھ جاتی اور کبھی شریں جاتی۔ زیادہ تر شریں ہی ساتھ جاتی۔ مائرہ بہت خوش تھی۔ ایک ایک چیز اپنی پسند سے دیکھ بھال کے لے رہی تھی۔ ٹائم بہت کم تھا کیونکہ باسط کو واپس بھی جانا تھا۔ وہ لمبے بکھیڑوں کے حق میں نہیں تھا چاہتا تھا سیدھے سیدھے نکاح کر کے مائرہ کو گھر لے آئے۔

پر بینا کے دل میں باسط کی چھوٹی دو بہنوں کے دل میں بڑے ارمان تھے۔ اُنہوں نے بڑے پروگرام بنا رکھے تھے بھائی کی شادی میں یہ کرنا ہے وہ کرنا ہے۔ مہندی، مایوں، ولیمہ سب دھوم دھام سے کرنا ہے۔

کارڈ چھپنے کے لیے دیئے جا چکے تھے۔

☆☆☆

کل باسط کی مہندی تھی۔ دوستوں رشتہ داروں کزنز نے خود ہی سب کچھ ارینج کیا تھا۔ اُس کے ذہن پہ فکر سوار تھی کیونکہ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اُس کا ایک کارندہ ایئر پورٹ پہ ہیروئن لے جاتے ہوئے شک کی بنا پہ پکڑا گیا تھا بعد میں تلاشی لینے پہ مشکوک اشیاء برآمد کر لی گئیں۔ اب وہ لاک اَپ میں تھا۔ اور پوچھ گچھ کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔ باسط کو خوف تھا کہ ایسا نہ ہو وہ اُس کا نام اُگل دے۔ اُس کے پارٹنر نے یقین دلایا تھا ایسا کچھ ہوا تو وہ سب سنبھال لے گا۔ پر باسط پھر بھی پوری طرح پُرسکون نہیں تھا۔

وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ آنکھ ہی نہیں لگ رہی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پہ اُس کا موبائل فون پڑا تھا۔ باسط کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وقت گزر ہی نہیں رہا تھا اور نہ ہی نیند آ رہی تھی۔ اُس نے مائرہ کو کال کر دی۔

وہ بھی اُس کی طرح جاگ رہی تھی۔ باسط بہت دن سے ایک بات کہنا چاہ رہا تھا پر وہاں مائرہ کے ہاں جانے کے باوجود اُس سے وہ بات کہنے کا موقعہ نہیں ملا۔ آج اور ابھی وہ مائرہ سے اپنی وہی بات کرنا چاہتا تھا۔

''مائرہ میں نے تمہیں تو اپنا لیا ہے مگر میں تمہارے بچے کو ہرگز نہیں اپناؤں گا تم نے میرے ساتھ رہنا ہے تو اپنے بچے کو وہیں چھوڑ کے آنا ہوگا۔ میں اُسے قبول نہیں کر سکتا۔ اُسے دیکھ کے مجھے بہت کچھ یاد آئے گا۔ جو تمہارے

کے لیے کافی کچھ خرید لیا۔

سائرہ کو ایک ایک چیز مشکل سے پسند آ رہی تھی۔ اب اُسے میچنگ سینڈل لینی تھی۔ کتنی دکانیں گھوم چکی تھی کوئی چیز اُس کی آنکھوں میں سما ہی نہیں رہی تھی۔ اس مہنگے اور اعلیٰ شاپنگ مال میں ریسٹورنٹ بھی تھا۔ مائرہ کو تو گھوم گھوم کے بھوک لگ رہی تھی۔ اُس نے سائرہ اور دریکتا کو اشارہ کیا۔ دونوں اُس کے پیچھے پیچھے تھیں۔

دریکتا کو بیٹھ کے قدرے سکون کا احساس ہوا۔

اُس نے اپنے لیے کولڈ ڈرنک اور برگر کا پڑ ر دیا۔

سائرہ اور مائرہ نے بھی اپنی اپنی پسند کا آرڈر ویٹر کو نوٹ کروایا۔

ویٹر کے دوبارہ آنے تک سائرہ نے ریسٹورنٹ میں بیٹھے لوگوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اچانک اُس کی نگاہ اپنے سامنے والی ٹیبل پہ بیٹھے اُس شخص پہ پڑی۔ جس کی پشت اُن کی طرف تھی۔ پولیس یونیفارم میں ملبوس اُس شخص پہ سائرہ کو اشعر کا گمان ہوا۔ اُس نے تھوڑا آگے ہو کے دیکھا تو یہ گمان یقین میں بدل گیا۔ وہ سو فیصد اشعر لغاری ہی تھا۔ چونکہ اشعر کی پشت اُن کی طرف تھی ورنہ وہ سامنے سے فوراً پہچان لیتی اور وہ بھی اُن کو دیکھ چکا ہوتا۔

سائرہ کو جانے کیوں ایک انجانی سی خوشی ہوئی۔ اُس نے کرسی پیچھے کی۔

''کہاں جا رہی ہو''۔ مائرہ نے اُس کے اچانک کھڑے ہونے پہ پوچھا۔ سائرہ کی نگاہوں سے خوشی جھانک رہی تھی۔ مائرہ کے سوال کا جواب دیئے بغیر وہ سیدھی اشعر کی ٹیبل کے پاس جا پہنچی۔

مائرہ نے اُس کے قدموں کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی تو پریشان ہو گی۔ وہ بھی اشعر کو پہچان چکی تھی۔ کیونکہ اب اُس کا رُخ بالکل اُن کی طرف تھا۔

''السلام علیکم آپ کیسے ہیں''۔ سائرہ نے پر جوش سلام جھاڑا تو اشعر کو اُسے پہچاننے کے لیے اپنی یادداشت پہ زیادہ زور نہیں دینا پڑا۔ وہ باتونی سی لڑکی جس کی نگاہوں میں مرعوبیت تھی اُسے یاد تھی۔

''وعلیکم السلام آپ کیسی ہیں سنائیں۔ میں تو آپ کے سامنے ہوں''۔

وہ دھیرے سے مسکرایا۔

سائرہ اُس کی شخصیت کے دل فریب پیچ وخم میں کھو سی گئی۔ مائرہ نے اُسے ملامتی نگاہوں سے گھورا اور اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں اشعر اُنہیں دیکھ چکا تھا۔ وہ اپنی کرسی سے اُٹھ گیا۔

دریکتا اُسے اسی طرف آتا دیکھ رہی تھی۔ کاش وہ کہیں چھپ سکتی۔ پتہ نہیں کیوں وہ خوفزدہ ہو رہی تھی۔

اشعر اکثر یہاں لنچ کرنے آتا تھا۔ اس کا آفس یہاں سے قریب ہی تھا۔ آج بالکل غیر متوقع طور پہ اورنگزیب انکل کی بیٹیوں سے اس ریسٹورنٹ میں سامنا ہو رہا تھا۔ اُن کے ساتھ وہ بھی تھی جس کا تصور کرتے ہی اشعر کا جی چاہتا کہ شوٹ کر دے۔

''کیسی ہیں آپ''۔ وہ اُس کے سر پہ کھڑا تھا۔ اُس کی مخاطب مائرہ اور نگاہیں دریکتا پہ تھی۔ جس نے ادھ کھایا برگر واپس پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔

''مائرہ کی شادی ہو رہی ہے ہم شاپنگ کرنے آئے ہیں''۔ سائرہ مسلسل بول رہی تھی۔ اُدھر مائرہ نے اخلاق کا تقاضا نبھایا اور بادل نخواستہ اُسے ہیلو ہائے کی۔ اشعر سائرہ کی خالی کی گئی کرسی پہ بیٹھ چکا تھا۔ اُس کی دائیں طرف دریکتا تھی۔ جس کا دل اس وقت پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ ''آپ نے پھر کسی کو ابھی تک بھیجا تک نہیں میرے پاس ترجمان بنا کے۔ خود ڈرتی ہیں مجھ سے بات کرتے ہوئے''۔

اب یقیناً اُس کا مخاطب دریکتا ہی تھی۔ اُس نے امداد طلب نگاہوں سے مائرہ کی طرف دیکھا۔

مائرہ نے نگاہ چرا لی۔ وہ خود اشعر سے خائف تھی۔ باقی لوگ بھی آہستہ آہستہ اُن کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔

''مجھ سے جو بات کرنی ہے ڈائریکٹ کریں محترمہ مجھے اپنے تایا کے ذریعے عدالتوں کی دھمکیاں مت دیں۔ میں ان سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ خیر یہاں ان باتوں کا موقعہ نہیں ہے۔ میں بہت جلد آپ کے پاس آؤں گا''۔

اشعر کی آواز دھیمی پر لہجہ بہت سخت تھا۔ دریکتا نے سہارے کے لیے مائرہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس کے چہرے پہ پھیلتی گھبراہٹ اشعر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھی مزید تماشہ بننے کے خیال سے اشعر وہاں سے اُٹھ گیا اور جاتے جاتے مائرہ کو شادی کی مبارکباد دی۔

سائرہ ابھی تک اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے جاتے ہی مائرہ سائرہ کو ڈانٹنے لگی۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی اُس کے پاس جانے کی۔ پپا بتا چکے ہیں کہ یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ تم پھر سلام کرنے پہنچ گی اُس کے پاس''۔

''اتنا ڈیشنگ ہے مجھے تو افسوس ہو رہا ہے''۔ سائرہ ذرا بھی اُس کی ڈانٹ کو خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔

دریکتا خوفزدہ تھی اور مسلسل واپسی کا کہہ رہی تھی۔ سائرہ کو غصہ آ گیا۔

''تم اتنا ڈرتی کیوں ہو۔ وہ کوئی خون آشام بلا تو نہیں ہے۔ ایک پولیس آفیسر ہی تو ہے۔ تمہارا نکاح ہوا ہے اس کے ساتھ۔ کچھ دنوں تک یہ نکاح ختم ہو جائے گا''۔ پھر بھی تم ڈرو گی؟

دریکتا بے بسی سے اُسے دیکھ کے رہ گی۔ سائرہ کو خوشی ہو رہی تھی۔ دریکتا کے خوف اور اشعر لغاری کے انداز پہ۔ ''کیا زوردار نوجوان ہے۔ ایک مرد کو ایسا ہی ہونا چاہیے''۔ مائرہ نے اُس کی طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔ ''تم اُس کی اتنی تعریفیں کر رہی ہو جیسے بہت متاثر ہو''۔ ''ہاں میں پہلی بار ہی متاثر ہو گئی تھی۔ مجھے دریکتا پہ حیرت ہے جو اُسے خلع لے رہی ہے''۔ سائرہ آہستہ آواز میں بولی پر دریکتا تو اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔ مائرہ نے اُس کا ہاتھ دبا دیا کہ بس کرو۔ دریکتا اتنی تعریفوں پہ کیا سوچے گی شریں تو عاشر کے لیے اُس کے حوالے سے خواب دیکھ رہی تھی۔ دریکتا کو خلع مل جاتی تو اشعر کے آسیب سے جان چھوٹ جاتی۔ عاشر سے شادی کے بعد طیب کی ذمہ داری کے بوجھ سے شریں ہلکی ہو جاتی۔ مائرہ نے شادی کے بعد تو باسط کے ساتھ چلے جانا تھا۔ ساری عمر کے لیے طیب کو کون سنبھالتا۔ ننھا سا بچہ تھا۔ اُس کی عمر کے ابتدائی چار پانچ سال بہت مشکل تھے۔ دریکتا شادی کے بعد اس گھر میں رہتی تو شریں کے لیے آسانی ہی آسانی تھی۔

☆☆☆

اشعر بہت غصے میں تھا۔ طاہر لغاری اُس کا مطالبہ سن کے چپ ہو گے تھے۔

دریکتا کو ریسٹورنٹ میں دیکھ کے اشعر کو جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ فوراً سے بھی بیشتر کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہا تھا۔

''پپا مجھے دریکتا کو اس گھر میں لانا ہے۔ میری بیوی ہے وہ''۔

اورنگزیب عدالت کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ دریکتا نے خود کہہ دیا تھا کہ میں اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہوں اور

اشعر اُسے گھر میں لانے کی بات کر رہا تھا۔

طاہر لغاری نے گاؤں جانے والی بات اشعر کو نہیں بتائی تھی کہ اُسے غصہ آئے گا اور بات بڑھے گی۔ لیکن اب چھپانے میں فائدہ نہیں تھا۔ "گڈ پپا! آپ مجھے اب یہ بتا رہے ہیں کہ آپ گاؤں گئے تھے۔ کیا ضرورت تھی بتانے کی۔ بہر حال میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ مجھے اپنی بیوی کو اس گھر میں لانا ہے۔ پپا اب یہ میری عزت، انا اور غیرت کا معاملہ ہے۔ میں کسی صورت پیچھے نہیں ہٹ سکتا"۔

"اشعر وہ لوگ نہیں مان رہے ہیں میں پہلے یہ سمجھتا رہا کہ دریکتا کو ڈرایا گیا ہے خوفزدہ کیا گیا ہے یہ سب کہنے کے لیے۔ میں اپنا شک دور کرنے گاؤں گیا۔ مجھے خود دریکتا نے کہا کہ وہ اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ بلکہ اُس نے یہاں تک کہہ دیا کہ میری طرف سے اس رشتے کو ابھی اور اسی وقت ختم سمجھیں۔ اب تم بتاؤ جب وہ خود راضی نہیں ہے تو تم کیوں اپنا خون جلا رہے ہو"۔

طاہر لغاری نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ اشعر نے ہٹا دیا۔ "پپا یہ رشتہ ختم نہیں ہو سکتا ہاں دریکتا ختم ہو سکتی ہے"۔ اشعر کا لہجہ بلا کا سفاک اور سرد تھا۔ طاہر لغاری دہل گئے۔

"تم پولیس ڈیپارٹمنٹ میں آ کے اتنے سفاک ہو گئے ہو۔ مجھے نہیں پتہ تھا"۔

"پپا آپ جو بھی سوچیں یہ رشتہ میری انا کے لیے زندگی موت کا سوال بن گیا ہے۔ میں ایک عورت کو اپنی مردانگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کسی قیمت پہ بھی نہیں"۔ اُس کے لفظ لفظ میں آہنی سختی تھی۔

☆☆☆

طیب کو دو دن سے بخار تھا۔ آج دریکتا شاپنگ سے واپس آئی تو طیب بخار میں تپ رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ سویا ہوا تھا۔ "زیبن طیب کب سویا ہے دوائی دی تھی اسے"۔ دریکتا نے فکرمندی سے طیب کے ماتھے پہ ہاتھ پھیرا۔ اور زیبن سے دریافت کیا جو کچھ اُلجھی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ "جی ہاں دوا دی تھی پینے کے بعد سو گیا تھا"۔ "اور کب دی تھی دوا"۔ "وہ تو جی آپ کے جانے کے بعد ہی دی تھی"۔

"تو کیا طیب اُس وقت سے سو رہا ہے" اُس نے حیرت سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ وہ شہر ساپنگ کرنے گئی وہاں سے واپس بھی آ گئی اور طیب سو رہا تھا"۔ "جی بی بی جی مجھ سے غلطی ہو گئی ہے"۔ زیبن کے چہرے پہ گھبراہٹ کے آثار تھے۔ "کیا غلطی ہوئی ہے"۔ دریکتا کھٹک گئی۔ "میں نے طیب کو تھوڑی سی افیم چٹا دی تھی بہت زیادہ رو رہا تھا ناں اس لیے........"

"اوہ گاڈ تم اسے وہی دیتی رہی ہو........" دریکتا نے انتہائی غصے سے اُس کی طرف دیکھا۔ "نکل جاؤ یہاں سے"۔ "بی بی جی معاف کر دیں۔ مجھ سے طیب کا رونا دیکھا نہیں جاتا تھا"۔ زیبن اُس کے پاؤں میں گر پڑی۔ دریکتا نے اُس سے اپنے پاؤں چھڑوائے۔ "اچھا جاؤ پلیز"۔ "شریں بی بی کو مت بتایئے گا۔ آئندہ میں یہ غلطی نہیں کروں گی"۔

"میں کسی کو کچھ نہیں کہوں گی بس جاؤ یہاں سے"۔ دریکتا نرمی سے بولی ساتھ ہی وارننگ بھی دی۔ "یہ پہلی اور آخری غلطی ہے جو میں طیب کے سلسلے میں معاف کر رہی ہوں۔ آئندہ ایسا نہ ہو۔ میرے بھائی کا خون لاوارث نہیں ہے"۔ دریکتا جذباتی سی ہو گئی تو زیبن حیرت سے دیکھنے لگی۔ ماں اور نانی کو طیب کی ذرا پرواہ نہیں تھی اس لیے اُس نے بھی توجہ نہیں دی تھی۔ پر سامنے بیٹھی نرم دل سی لڑکی جو ذرا ذرا سی بات پہ افسردہ ہو جاتی ہے جس کی آنکھیں نیر بہانے لگتی ہیں۔ وہ طیب سے اتنا پیار کیوں کرتی ہے۔ جس اللہ نے طیب کو پیدا کیا ہے۔ یقیناً اُس نے اس لڑکی کے دل میں طیب کی محبت ڈالی ہے۔ ورنہ اُس نے تو رو رو کے ہی ادھ موا ہو جانا تھا۔

شکر کا مقام تھا کہ طیب تھوڑی دیر بعد بیدار ہو گیا چٹکی بھر افیم کا اثر ختم ہو گیا تھا۔ زیبن طیب کے لیے دودھ کا تازہ فیڈر بنا کے لائی اور دریکتا نے طیب کو گود میں لٹا کے دودھ پلایا۔ پندرہ منٹ بعد دوبارہ دوائی دی۔ دوائی پیتے ساتھ ہی اُس نے قے کر دی۔ دریکتا کے سارے کپڑے بھر گئے۔ زیبن نے لپک کے طیب کو لے لیا اور پہلے اُس کے کپڑے تبدیل کیے۔

وہ حسب معمول رونا شروع کر چکا تھا۔

مائرہ شاپنگ سے تھکی ہاری تھی۔ آتے ہی لیٹی اور آنکھ لگ گئی تھی۔

طیب چیخ چیخ کے رو رہا تھا۔

مائرہ کی آنکھ کھل گئی وہ بستر سے اُتر آئی۔

طیب دریکتا کی گود میں تھا۔ مائرہ بھابھی اُس کے سامنے کھڑی تھی بکھرے بالوں سمیت اُسے حیرت سی ہوئی۔

"یہ کیوں رو رہا ہے"۔ مائرہ پوچھ رہی تھی۔ "بھابھی اسے بخار ہے بے چین ہے۔ شاید اس لیے رو رہا ہے"۔ "دوائی دو اور چپ کراؤ اسے"۔ اُس نے لاتعلقی سے مشورہ دیا اور واپس مڑ گئی۔

زیبن بھی دریکتا کی طرح حیران تھی۔ آج مائرہ نے غالباً پہلی بار طیب کا پوچھا تھا۔

"پتہ نہیں آج سورج کہاں سے نکلا تھا"۔ دریکتا نے زیبن کی ہلکی سی بڑبڑاہٹ نہیں سنی تھی۔ اب پتہ نہیں یہ اتفاق تھا یا سچ مچ طیب کی بے چینی کم ہوئی تھی۔ وہ مائرہ کے یہاں آ کے پوچھنے کے بعد خاموش ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اورنگزیب نے صرف قریبی رشتہ داروں کو ہی مائرہ کے نکاح میں مدعو کیا تھا۔ البتہ باسط اور حمزہ احمد کی طرف سے کافی مہمان بارات کے ساتھ آئے تھے۔ نکاح کے بعد باسط اور مائرہ کو اکٹھے بٹھایا گیا تو بینا کو مائرہ اور شاہ زیب کی شادی یاد آ گئی۔ جب وہ دونوں اسٹیج پہ اکٹھے بیٹھے تھے تو اُس کے دل نے بے اختیار خواہش کی تھی کہ کاش شاہ زیب کی جگہ مائرہ کے پہلو میں میرا باسط ہوتا۔ کاتب تقدیر نے شاید اسی وقت بینا کی دعا کو اُس کی حسرت کو قبولیت کے خانے میں درج کر لیا تھا۔

مگر اُس نے ایسا کب چاہا تھا کہ شاہ زیب مر جائے۔

بینا کی آنکھیں بھیگ گئی۔ شاہ زیب کا ہنستا مسکراتا چہرا تصور میں یکدم زندہ ہو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مائرہ کے پہلو میں ابھی بھی شاہ زیب ہی بیٹھا ہو۔ باسط کے چہرے پہ بھی تو خوشیوں کے وہی الوہی جذبے دمک رہے تھے۔ جن جذبوں سے کبھی شاہ زیب کا چہرا جگمگایا تھا۔

"اے اللہ میرے باسط کے چہرے اور دل کی خوشی سلامت رکھنا۔ میں نے شاہ زیب کا کبھی بھی بُرا نہیں چاہا تھا۔ اے میرے رب! تو تو میرے دل کی حالت اور نیت کو خوب سمجھتا ہے۔ میں نے کبھی عمر زیب کا بھی بُرا نہیں چاہا تھا۔ میں اپنے نصیب کے لکھے کو جان گئی تھی۔ پھر بھی مجھ سے کوئی بھول چوک ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ میرے باسط کو

سلامت رکھنا"۔

بینا دل ہی دل میں دعا گو تھی۔

دریکتا طیب کو گود میں اُٹھائے مائرہ اور باسط کے سامنے ہی بیٹھی تھی۔ طیب کی حیران نگاہ مائرہ کی چہرے کی طرف ہی تھی۔ جیسے وہ سب جان اور سمجھ رہا ہو۔ عاشر تصویریں بنا رہا تھا۔ اُس نے دریکتا کو بھی مائرہ اور باسط کے ساتھ تصویر بنوانے کا اشارہ دیا اور کیمرا سیدھا کر کے کھڑا ہو گیا۔ دریکتا چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی مائرہ کے برابر بیٹھ گی۔ طیب اُس کی گود میں ہی تھا۔

باسط کی نگاہ اُس پہ پڑی تو دل ہی دل میں اُسے شدید غصہ آیا۔ طیب نے مائرہ کا زرتار آنچل پکڑ لیا تھا۔ دریکتا فوٹو بنوانے کے فوراً بعد وہاں سے ہٹ گی۔ شریں تائی نے اشارہ کیا تھا کہ طیب کو لے کے سائیڈ پہ بیٹھ جاؤ۔ اُنہوں نے بھی باسط کے بگڑتے تیور ملاحظہ کیے تھے۔

☆☆☆

عاشر بھائی بھی کیمرا رکھ کے اُس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھ گئے۔ طیب حیران حیران نگاہوں سے لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "آج تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔ ان کپڑوں میں"۔ عاشر بھائی نے آج پہلی بار دریکتا کی یوں کھل کے تعریف کی تھی۔ وہ کان کی لوؤں تک سرخ پڑ گی۔ عاشر کے ساتھ اُس کا زیادہ آمنا سامنا ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ تایا کے ساتھ پپا کے آفس میں مصروف تھا کم ہی گاؤں آتا۔ "تھینکس عاشر بھائی"۔ اُسے تشکر کا اظہار کرنا ہی پڑا۔ "اس میں تھینکس والی کوئی بات نہیں ہے۔ اپنوں میں یہ بات نہیں چلتی۔ ویسے بھی بڑے کچھ اور سوچ رہے ہیں۔ تم بھی اب اپنی سوچ کا انداز تبدیل کرو"۔ وہ اُسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ دریکتا جھینپ سی گئی۔ پہلے تو کبھی اُنہوں نے اس پہ اتنی توجہ نہیں دی تھی۔ نہ اُن کی باتیں اُس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

"میں سمجھی نہیں عاشر بھائی"۔ اُس نے سوالیہ نگاہیں اُن کی سمت اُٹھائی۔ "ارے میں تمہارا بھائی نہیں ہوں۔ کزن ہوں۔ اور کزن بھائی نہیں ہوتا۔ تمہیں اُس "پولیسیئے" سے خلع مل جائے تو امی، ابو سب بتا دیں گے"۔ عاشر کا لہجہ اور انداز دونوں ہی معنی خیز تھا۔ دریکتا اُن سے دور ہٹ کے بیٹھ گی۔

فرح چچی کی نگاہ عاشر پہ ہی تھی۔

اُنہیں کھد بھد سی لگی ہوئی تھی۔ دریکتا دور ہٹی تو اُنہیں سکون ہوا۔ مائرہ کی رخصتی کے وقت طیب نے رو رو کے آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔ پھولوں سے سجی گاڑی میں بیٹھ کے مائرہ نئی منزلوں کی تلاش میں نئے ہم سفر کے سنگ رخصت ہو گی۔ اپنے پیچھے مسافرت کی گرد میں اٹی ایک نشانی چھوڑ کے۔

☆☆☆

یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ مائرہ اُس کے کمرے میں دولہن بنی بیٹھی تھی۔ سولہ سنگھار سے آراستہ کسی نوخیز کلی کی مانند۔ پر نہیں مائرہ نوخیز کلی کہاں تھی۔ اس کلی کو تو پہلے ہی کوئی پھول بنا چکا تھا۔ "کیوں گھونگھٹ کا تکلف کرتی ہو بہت بار دیکھ چکا ہوں پہلے بھی اس چہرے کو.........."

باسط کو خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیوں اتنا تلخ ہو رہا ہے۔ مائرہ نے حیران شکوہ کناں نگاہیں اُٹھا کے اُس کی طرف دیکھا۔ "ہاں دیکھا ہو گا میرے اس چہرے کو پہلے بھی کئی بار۔ لیکن اس رنگ میں اس رشتے سے تو پہلی بار دیکھ رہے ہوناں"۔ ناز تھا، انداز تھا، ادا تھی سب کچھ ہی تو تھا مائرہ میں۔ "اس رشتے میں اس رنگ میں مجھ سے پہلے بھی تو کوئی دیکھ چکا ہے"۔ باسط نے بے رحمی کی انتہا کر دی۔ اولین شب ملن کی اس گھڑی میں۔ مائرہ نے کب یہ سب سننے کی تمنا کی تھی۔ وہ خاموش ہو گی۔

باسط نے خود ہی اُس کا ہاتھ تھاما اور وہ خوبصورت سا بریسلیٹ اُس کی کلائی میں پہنایا۔ اُسے خود بھی اپنے رویئے کی بدصورتی کا احساس ہو چکا تھا۔ سب کچھ بھلا کے نئے رشتے کی طرف پلٹا اور مائرہ کو آغوش میں سمیٹ لیا۔ اُس کی آنکھیں گلابی ہو چلیں اُن میں نشہ سا اُتر آیا۔ باسط جو قربتوں کے فسوں خیز سمندر میں ڈوب اُبھر رہا تھا۔ یکدم کوئی اُس کے کان میں بڑے زور سے چیخا، برتی ہوئی عورت استعمال شدہ عورت......

اُس نے مائرہ کو ایک دم پرے دھکیلا۔ جیسے وہ آگ کا انگارہ ہو۔ چھوت ہو۔ اُس کے حلق میں کانٹے اُگ آئے۔ جی چاہ رہا تھا سمندر پی جائے۔ کسی صحراؤں کی سی پیاس اُس کے من میں پھیلتی جا رہی تھی۔

مائرہ بے چیناں سمیٹے تھک ہار کے سو گئی تھی۔ باسط بھی سگریٹ پھونک پھونک کے تھک چکا تھا۔ رات کے آخری پہر وہ سوئی ہوئی مائرہ کے اُوپر جھکا تو سب کچھ بھولنے کی کوشش میں تھا۔ وہ کچی نیند میں تھی۔ جاگ گئی۔ باسط کی نگاہوں میں طلب تھی۔ وہی پیاسی طلب بھری نگاہ جو کبھی مائرہ کے وجود سے لپٹی تھی تو وہ بھول ہی نہیں پائی تھی۔

باسط کے بازو سختی سے اُس کے گرد حمائل ہو گئے۔ مائرہ کی سانس ہی رکنے لگی۔

"تم صرف میری ہو۔ میری تھی، تمہاری زندگی میں صرف میں ہی ہوں اور کوئی نہیں ہے"۔ وہ دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

☆☆☆

برسوں عرصوں میں اب نیندوں میں جاگے ہیں۔
خواب، جو جاگے دنوں کی آنکھوں میں جیتے تھے
خواب جو کل بیداری میں بھی اپنے نہیں تھے
جواب نیندوں میں بھی اپنے نہیں ہیں

مائرہ رخصت ہو کے باسط کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کر چکی تھی۔ عمر زیب اُسی پرانی کیفیت میں تھے۔

نوید زیب اور نگزیب بھائی کے علم میں لائے بغیر ایک ڈاکٹر سے ملے اور عمر کا کیس ڈسکس کیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ گھر پہ اُن کا علاج نہیں ہو سکتا اُنہیں ہاسپٹل لانا ضروری ہے۔ نوید اس کوشش میں تھے کہ عمر کو ہاسپٹل لے جائیں۔

☆☆☆

دریکتا نے آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھولا۔

کمرے میں روشنی تھی۔ کیونکہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ عمر زیب کارپٹ پہ نیچے بیٹھے تھے۔ دریکتا کو وہ پہلے سے بھی زیادہ کمزور لگے۔ گالوں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں۔ اُن کی تیزی سے گرتی ہوئی صحت پریشانی کا اشارہ دے رہی تھی۔ دریکتا دروازے کے پاس ہی کھڑی رہی۔ "پپا" اُس کے لب ہلے۔ عمر نے آواز پہ سر اُٹھا کے خالی خالی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ اُس کا جی چاہا وہ بھاگ کے اُن کے پاس جائے اور سینے میں سر چھپا لے اور پھر اونچی اُونچی آواز میں روئے۔ اُنہیں اپنا ایک ایک دکھ ایک ایک غم بتائے۔ اُنہیں بتائے کہ مائرہ آپ کی بہو باسط کے سنگ نئے گھر میں چلی گی ہے۔

آپ کے لاڈلے شاہ زیب کا بیٹا ماں کی گود کے بغیر پل رہا ہے۔ آپ کی درکیتا کو اشعر لغاری زندہ درگور کرنے پہ تلا ہوا ہے۔ ننھے طیب کو باپ کی دائمی جدائی کے ساتھ ساتھ مائرہ بھابھی کی محبت بھی نہیں ملی ہے۔ پپا میں بہت اکیلی ہوں۔ آپ کے بغیر میں بہت کمزور ہوں۔ ہمارا گھر اکیلا اور خالی ہے۔ وہاں اشعر لغاری نے فائرنگ کروائی ہے۔ اُس کا رویہ میرے ساتھ بہت درشت اور خطرناک ہے۔ پپا وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ آپ کو پتہ نہیں تھا کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ تایا تائی ان سب کو پتہ ہے آپ کو کیوں نہ پتہ چلا پپا۔ آپ کیوں آنکھیں بند کر کے جیتے رہے اور سب کا اعتبار کرتے رہے۔ پپا میری زندگی مذاق بن کے رہ گی ہے۔

کاش پپا اُس کا دُکھ جان پاتے۔ پر وہ کیسے جانتے۔ خود تک سے بھی بے خبر تھے۔ کچھ دیر وہ وہیں کھڑی رہی اور پھر اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔ ڈھلتی شام اپنے پہلو میں اُداسیوں کے سبھی رنگوں کو چھپائے ہوئے تھی۔

طیب جاگ چکا تھا۔ زیبن کپڑے تبدیل کرا کے طیب کو اُس کے پاس لے آئی۔ درکیتا اُسے اُٹھائے اُٹھائے برآمدے سے آگے آ گئی اور گملوں کی قطار کے پاس خالی جگہ پہ بیٹھ گی۔ طیب اپنی موٹی موٹی آنکھیں کھولے اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ درکیتا نے بے اختیار اُس کی پلکوں کو چوما تو وہ کسمسانے لگا۔

وہ اُسے غور سے دیکھنے لگی۔ کتنا کمزور ہو گیا تھا وہ۔ پیدائش کے وقت سرخ و سفید اور موٹا تازہ تھا۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی طیب ہے۔

رو رو کے تو اُس نے اپنی جان ہی کھا لی تھی۔ اگرچہ اب وہ پہلے کی طرح نہیں روتا تھا پر پھر بھی رونے کا دورہ اُسے وقتاً فوقتاً پڑ ہی جاتا تھا۔ درکیتا اُسے گود میں لٹائے اُداس اُداس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وقت اور حالات کتنے ظالم ہیں۔ بہت سارے خونی رشتوں کے بغیر جینا سکھا دیتے ہیں۔ طیب کو دیکھتے ہوئے یہ بات اُس کے ذہن میں آئی تھی۔

☆☆☆

مائرہ باسط کے ساتھ باہر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ باسط نے کھانا ہوٹل میں کھانے کا پروگرام بنایا تھا۔ بلیک بارڈر والی میرون ساڑھی میں ملبوس بالوں کا جوڑا بنائے۔ زیورات سے آہستہ سجی بنی مائرہ نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔ طیب کی ماں بننے کے بعد اُس کا حسن دو آتشہ ہو گیا تھا۔ باسط لیٹا اُس کی تیاریوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ سب سے آخر میں مائرہ نے خود پہ پرفیوم اسپرے کیا اور گھوم کے باسط کی طرف دیکھا۔ ''اب چلیں میں تو تیار ہوں''۔

وہ خاموشی سے تکتا رہا۔ مائرہ اُس کے پاس آ گئی۔ ''کیا بات ہے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو''؟ ''تم پہلے سے زیادہ پیاری ہو گی ہو''۔ باسط نے تعریف کی اُس کی گردن کچھ اور بھی اکڑ گی۔ ''یہ سب تمہاری محبتوں کا کمال ہے۔ میں تمہاری محبت پا کر مغرور ہو گئی ہوں''۔ وہ اُس کے پاس بیٹھ گی اور سینے سے سر ٹکا دیا۔ ''تو کیا شاہ زیب تم سے محبت نہیں کرتا تھا''۔ پل بھر میں باسط کا موڈ بدل گیا اُس نے مائرہ کا سر اپنے سینے سے ہٹا دیا۔ جانے اُس کے اچھے خاصے موڈ کو کیا ہو جاتا تھا۔

یہاں پہ اُس کا کیا ذکر۔ ''اُس کا ذکر ہی تو ہو گا''۔ وہ زہر میں بجھے لہجے میں بولا۔ ''باسط وہ میرا ماضی تھا جو میں بھول چکی ہوں''۔ ''پر میں تو نہیں بھولا ہوں۔ اُس کی زندہ جیتی جاگتی نشانی تمہارے پاس موجود ہے۔ تم کیسے بھول سکتی ہو اُسے''۔ باسط کی آنکھوں سے شعلے لپکتے محسوس ہو رہے تھے۔ ''باسط میں تم سے محبت کرتی تھی کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ وہاں میرے گھر والوں نے شادی کی تھی۔ اُن کا فیصلہ تھا''۔ ''ہاہاہاہاہا'' باسط ہنستا چلا گیا۔ ''گھر والوں کا فیصلہ ہاہاہا..... شاہ زیب مجھ سے زیادہ امیر تھا۔ تم بھی اُس کی دولت گھر بار دیکھ کے قربان ہو گئی تھی۔ اور شریں خالہ نے اپنی بہن کے جذبات تک کا کوئی خیال نہیں کیا۔ صاف کہہ دیا کہ ہم نے زبان دے دی ہے۔ حالانکہ اُس وقت ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہم سے جھوٹ بولا گیا تھا۔ شریں خالہ نے اپنی بہن سے جھوٹ بولا۔ اور تب تم بھی شاہ زیب کے نام کی مالا جپ رہی تھی۔ بہت جلدی تمہارا اور خالہ کا غرور ٹوٹا ہے''۔ باسط بہت بے رحمی سے بول رہا تھا۔ مائرہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گی۔ باسط اُٹھا شوز پہنے اور غصے سے دروازہ بند کر کے باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اکیلا ہی جا رہا تھا۔ اُس نے مائرہ سے ایک بار بھی جانے کے لیے نہیں کہا۔ گاڑی کی چابی، موبائل فون اُٹھایا۔ مائرہ ایک تواتر سے رو رہی تھی۔ باسط نے ایک نظر تک نہ ڈالی۔ اُسے گویا مائرہ کے بہتے آنسوؤں کی کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔

باسط نے دوستوں کے ساتھ باہر ہی ڈٹ کے کھانا کھایا، ہلا گلا کیا اور رات بہت دیر سے گھر واپس آیا۔

سب گھر والے سو چکے تھے۔ باسط نے آرام سے اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ مائرہ کروٹ بدلے دراز تھی اور جاگ رہی تھی۔ بال بکھرے اور آنکھیں شدت گریہ سے سرخ۔ باسط نے ایک نگاہ دیکھا اور کپڑے بدلنے چلا گیا۔ واپس آ کے تکیہ اُٹھایا اور اُسے قدرے دور ہو کے لیٹ گیا۔ ''میں ان ڈراموں سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں۔ جاؤ منہ ہاتھ دھو کے آؤ اور پنک نائٹی پہنو۔ اس کے بعد میرے پاس آنا۔ اور یہ میرا حکم ہے۔ پانچ منٹ سے اوپر ٹائم نہ ہو''۔ باسط کے لہجے میں سختی تھی۔ مائرہ اُسی طرح لیٹی رہی جیسے سنا ہی نہ ہو۔ ''میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ کمرے کی دیواروں سے مخاطب نہیں ہوں۔ ٹسوے بہانا بند کرو اور جلدی کرو''۔ اس بار اُس نے مائرہ کا بازو بڑی زور سے ہلایا۔ مائرہ کو جرأت نہیں ہوئی کسی قسم کے احتجاج کی۔

اُس نے خاموشی سے منہ ہاتھ دھو کے بال سنوارے۔ پر آنسو جانے کہاں سے اُمڈے آ رہے تھے جیسے اُس کے اندر سیلاب آ گیا ہو اور سب بند ٹوٹ گے ہوں۔

ایک بار پھر اُس نے منہ پہ پانی کے چھپاکے مارے۔ اتنے میں باسط غصے میں اُبلتا باتھ روم میں آ گیا۔ ''میں نے کہا تھا ناں کہ پانچ منٹ سے اوپر نہ ہوں۔ تم یہاں کس کا ماتم کر رہی ہو''۔ وہ اُس کے کان کے قریب چیخا تو مائرہ کے آنسو رک گے۔ کتنا اجنبی اور سرد سا رویہ تھا اُس کا۔ وہ میکانکی انداز میں اُس کے ساتھ آئی۔

''سکون چاہیے اس وقت مجھے صرف سکون''۔ باسط کے بازو اُس کی کمر کے گرد حمائل ہو گے۔ وہ اپنے حق کا استعمال کر رہا تھا اور مائرہ کے اندر کوئی بیٹھا زور زور سے رو رہا تھا۔ ہاں اُس کی آنکھوں میں اب آنسو نہیں تھے۔

باسط نے کوئی معذرت نہیں کی نہ کسی شرمندگی کا اظہار۔

اُس میں مردانگی جو تھی وہ ایک مکمل مرد تھا جیسا ایک مرد کو ہونا چاہیے۔ کبھی یہ الفاظ مائرہ نے شاہ زیب کو کہے تھے۔ باسط اُس کے قریب تھا اور اُسے شاہ زیب سے کہی باتیں یاد آ رہی تھی۔ کبھی شاہ زیب اُس کے پاس تھا اور اُسے باسط کی مردانگی یاد آئی تھی۔

جذبات کا طوفان ختم ہونے کے بعد باسط کروٹ بدل کے سکون سے سو گیا۔ مائرہ نے قطرہ قطرہ اذیت اپنے

جسم و جان میں اُترتی محسوس کی تھی۔

☆☆☆

باسط اب واپسی کی تیاری کر رہا تھا۔

ضرورت سے زیادہ وقت پاکستان میں لگ گیا تھا۔

جانے سے پہلے اُس نے مائرہ کو جی بھر کے شاپنگ کروائی۔

کپڑے، اور زیورات اُس کے پاس پہلے سے موجود تھے۔ باسط نے اپنی پسند سے اور لے کر دیئے۔ روز اُسے کہیں نہ کہیں لے کے نکل جاتا۔ باہر کھانا کھلاتا، لانگ ڈرائیو کرتا۔ جب وہ کہتی باسط اب دیر ہو گی ہے گھر چلو وہ تب گاڑی واپسی کے لیے موڑتا۔ اُسے کہتا کہ میرے پاس بیٹھی رہو۔ کوئی کام مت کرو۔ میں یہاں سے تمہاری پیاری پیاری یادیں سمیٹ کے لے کے جانا چاہتا ہوں۔ وہ اُسے دیوانوں کی طرح تکتا جاتا۔ تب مائرہ اُس کی بے تابیوں، اور بے قراریوں پہ حیران ہو جاتی۔ اُس کے دھوپ چھاؤں ایسے مزاج کو وہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ وہ برسنے پہ آتا تو پور پور سیراب کر دیتا۔ اور جب روٹھتا تو سانسیں تک سینے میں روک دیتا جیسے ایسا ہی شعلہ شبنم تھا باسط۔

☆☆☆

مائرہ کتنی بار اپنے آنسو نظر چھپا کے صاف کر چکی تھی۔ باسط کل جا رہا تھا۔ جوں جوں وقت قریب آتا جا رہا تھا اُس کے دل میں عجیب سی گھٹن ہو رہی تھی۔ جی چا رہا تھا زنجیر بن کے باسط کے قدموں سے لپٹ جائے اُسے نہ جانے دے۔ ایسا نہ ہو وہ چلا جائے تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے اُس کی واپسی کا راستہ تکتی رہے۔ انتظار اُس کا مقدر بن جائے۔

وہ اُس کے سینے پہ سر رکھے لیٹی تھی۔ باسط ہاتھ کی اُنگلیوں سے اُس کے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ اپنی بے پناہ چاہت کا اظہار کر رہا تھا۔

''باسط کب آؤ گے واپس''۔ مائرہ نے ذرا سا سر اُٹھا کے اُس کی طرف دیکھا۔

''اب تو آنا جانا لگا رہے گا۔ تمہارے بغیر میں کہاں رہ پاؤں گا۔ زنجیر سی ڈال دی ہے تمہاری محبت نے میرے پاؤں میں''۔ ''دیکھو شادی کے بعد میں ایک پل ایک دن بھی تم سے دور نہیں ہوا ہوں۔ نہ تمہیں امی کے گھر جانے دیا ہے۔ لیکن مجبوری ہے جو میں تم سے دور جا رہا ہوں''۔ باسط کے لفظ لفظ سے محبت ٹپک رہی تھی۔

''باسط میں کیسے رہوں گی''۔ وہ پھر سے روہانسی ہونے لگی تو باسط نے اُسے بازوؤں میں چھپا لیا۔ ''میں جب واپس آؤں تو تمہاری طرف سے خوشخبری ملنی چاہیے مجھے''۔ وہ مائرہ کو اُسی طرح بازوؤں میں جکڑے جکڑے بولا تو وہ سمجھ ہی نہیں پائی کہ خوشخبری کا مطلب کیا ہے۔ ''خوشخبری سے کیا مراد ہے باسط''۔ ''ہماری قربتوں کی کوئی نشانی وجود میں آ جانی چاہیے۔ یہ خوشخبری سنانا مجھے جلدی''۔ وہ اُس کی ناک چھو کے بولا تو مائرہ شرما گئی اور اُس کے سینے میں سر چھپا لیا۔

باسط کو اُس کی شرمانے کی ادا بہت بھائی۔ وہ کنواری لڑکی کی طرح سرخ پڑ گی تھی۔

☆☆☆

اشعر میٹنگ کے بعد آفس سے اُٹھ آیا۔ شام دوستوں کے ساتھ ''جیم خانہ'' جانے کا موڈ تھا۔ اس لیے وہ جلدی آ گیا تھا۔

طاہر لغاری ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے اور بے انتہا سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ اشعر نے سلام کیا تو اُنہوں نے لفافہ اُس کی طرف بڑھایا جو اُن کی گود میں دھرا ہوا تھا۔ ''پپا کیا ہے یہ کس نے بھیجا ہے۔ وہ اُلٹ پلٹ کے دیکھتے ہوئے بولا۔

''خود پڑھ لو، دیکھ لو''۔ وہ اُسی سنجیدگی سے بولے تو اشعر کو محسوس ہوا جیسے اُن کی بے انتہا سنجیدگی کا تعلق اسی نے سے ہے......

دریکتا کے وکیل کی طرف سے خلع کا نوٹس تھا۔ اشعر نے پرزے پرزے کر کے فضا میں اُچھال دیا اور باہر نکل ... اُس نے کوئی بات نہیں کی تھی نہ کچھ بولا تھا۔ نہ کسی قسم کے غصے کا اظہار کیا تھا۔ اُس کی خاموشی بہت خطرناک تھی اور ہر کھل رہی تھی۔

☆☆☆

''میں نے وکیل کے ذریعے خلع کا نوٹس بھجوا دیا ہے۔ بہت اُچھل رہا تھا کہ خلع نہیں دے گا''۔ اورنگزیب ہیں آئے تھے اور دریکتا کے ساتھ ساتھ شریں کو بھی اپنی حالیہ کارکردگی کا بتا رہے تھے۔ جواباً دریکتا نے کسی قسم کی رائے ہیں دی۔ وہ جانے کیا سمجھے اُس کے پاس آ کے بیٹھ گئے۔ ''تم پریشان مت ہو وہ خلع دے دے گا۔ میرا تو نہیں خیال کہ شعر عدالت میں آ کے اپنے مقدمے کی پیروی کرے گا۔ وہ عدالت کی طلبی پہ حاضر ہی نہیں ہو گا اور عدالت تمہارے حق یں فیصلہ دے دے گی۔ میں طاہر لغاری کی نفسیات کو جان چکا ہوں۔ عزت دار لوگ ہیں۔ عدالتوں کے چکر میں پڑنے والے ہیں ہیں۔ پیشی پہ کوئی عدالت میں آئے گا ہی نہیں''۔

دریکتا کو اُن کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ مارے بندھے سن رہی تھی۔ اُسے عدالت کے نام سے ہی ریشانی ہو رہی تھی کہ وہاں جانا پڑے گا۔ اور یقیناً وہاں پہ اشعر لغاری اور طاہر انکل بھی تو ہوں گے۔ اشعر لغاری سے اُسے یسے بھی ڈر لگتا تھا اور طاہر انکل کو وہ کیسے فیس کرے گی۔

تایا اورنگزیب اُسے چند پیشیوں میں ہی فیصلہ اپنے حق میں ہونے کی خوشخبری سنا رہے تھے۔ وہ کسی بات سے ئی تو خوش نہیں ہو پا رہی تھی۔ حالانکہ اُسے خوش ہونا چاہیے تھا کہ اُسے خلع ملنے والی ہے یہ خوشخبری کوئی اور نہیں تایا نگزیب اُسے سنا رہے تھے۔

''اپنے دل کو مضبوط رکھو کچھ نہیں ہوتا۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے بس تمہارے نصیب میں یہی لکھا تھا۔ گر کہ اشعر لغاری اور اُس کے خاندان کی حقیقت پہلے ہی کھل گی ہے۔ بعد میں پتہ چلتا تو کیا ہوتا''۔ شریں تائی بھی ردی کا اظہار کرنے میں تایا اورنگزیب سے پیچھے نہیں تھی۔

''میری کب سے آرزو تھی کہ تمہیں بیٹی بنا کے اپنے گھر میں لاؤں۔ اللہ نے میری یہ خواہش سمجھو پوری کر دی ہے۔ بس اشعر والا قصہ ختم ہو تو میں بھی تیاری شروع کروں''۔ شریں تائی اُسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ اُن کی باتوں کا مطلب بہت واضح تھا۔ دریکتا دودھ پیتی بچی نہیں تھی جو سمجھ ہی نہ پاتی۔

اُس کا دم اُلجھنے لگا۔ ایک دم سے جی چاہا اُٹھ کے دور بھاگ جائے۔ مزید یہاں بیٹھی رہتی تو پریشان ہوتی۔ اموشی سے اُٹھ آئی۔

''شرما گئی ہے''۔ اُس کے جانے کے بعد شریں نے تبصرہ کیا تو اورنگزیب نے فاتحانہ نگاہوں سے اُس کی

طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ اب منزل دور نہیں ہے ہم سے۔

عین اُس وقت اورنگزیب کا سیل فون گنگنانے لگا "ہیلو" وہ کال ریسو کرتے ہی اپنی مخصوص گونجدار آواز میں بولے۔ دوسری طرف اشعر لائن پہ تھا۔ اُس نے رسمی تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

"مجھے نوٹس مل گیا ہے میں نے اس لیے کال کی ہے"۔ اشعر دلی جذبات کو چھپا کے بات کر رہا تھا "پھر کیا سوچا ہے کیا عدالت میں جانا ہے یا عدالت کے باہر معاملہ طے کرنا ہے"۔ اورنگزیب اشعر کی فون کال کو اپنے لیے بہت بڑی کامیابی تصور کر رہے تھے۔ اس لیے اکڑ سے گئے تھے۔ "معاملہ جو بھی ہے آپ کو پتہ چل جائے گا۔ میں نے یہ پوچھنا ہے کہ کیا اس خلع میں آپ کی مرضی بھی شامل ہے"۔ "دریکتا نے خود اپنی زبان سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اُسے خلع چاہیے۔ جب وہ راضی نہیں ہے تو اس میں کوئی بھی راضی نہیں ہے۔ ہم سب یہی چاہتے ہیں کہ دریکتا کو خلع مل جائے۔ اس کے بعد میں اپنے خاندان میں ہی اُس کی شادی کرواں گا۔ پہلے بھی سب کی مرضی یہی تھی مگر عمر زیب نے اپنی مرضی کی۔ خیر وہ ماضی کی باتیں ہیں۔ میں اب دریکتا کی شادی اپنے بیٹے عاشر سے کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کی بھی یہی خواہش ہے"۔ وہ اپنے دھن میں بڑے جوش سے بتا رہے تھے۔ دوسری طرف اشعر نے اپنے کھولتے جذبات کو بڑی مشکل سے قابو کیا تھا۔ "آپ بھول رہے ہیں کہ دریکتا ابھی میرے نکاح میں ہے اور آپ فی الحال ایسا نہیں کر سکتے"۔ وہ چبا چبا کے بولا۔

"دریکتا کو تمہارے نکاح کی قید منظور نہیں ہے"۔ اورنگزیب نے اُسے کچھ یاد کرایا۔

"میں اُسے اس قید سے کبھی رہائی نہیں دوں گا بے شک وہ زندگی کی قید سے رہائی پا جائے"۔ اشعر کا لہجہ سنگدلی کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔

اور رابطہ منقطع کر چکا تھا۔

کچھ دیر پہلے اورنگزیب اپنی فتح کے شعلے کے احساس سے ہی سرشار ہو رہے تھے اور اب پریشانی سے سر پکڑے بیٹھے تھے۔

اشعر گلے کی ہڈی بن چکا تھا۔

☆☆☆

باسط سب سے مل کے آخر میں بینا سے ملا تو ہمیشہ کی طرح اُس کے آنسو نکل آئے۔ اُس نے بھیگی آنکھوں سمیت باسط کا ماتھا چوما اُسے دعائیں دیں بالکل اپنے سگے بیٹے ایاز کی طرح۔ اُسے کبھی احساس نہیں ہوا اتنے برسوں میں کہ باسط اُس کا بیٹا نہیں ہے اُس نے بینا کی کوکھ سے جنم نہیں لیا ہے۔

عمر زیب سے رشتہ ٹوٹنے کے بعد حمزہ احمد کے گھر والوں نے رشتہ مانگا۔ حمزہ کی بیوی ایک حادثے میں اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ باسط اُس وقت دو سال کا تھا۔ بینا کی شکل وصورت شریں کے مقابلے میں واجبی ہی تھی۔ اُوپر سے رشتہ بھی ٹوٹ چکا تھا ایسے میں حمزہ احمد کے رشتے کو گھر والوں نے غنیمت تصور کرتے ہوئے فوراً ہاں کر دی۔ بینا بہت روئی، پر اُس کی ایک نہ چلی۔ شروع شروع میں اُس کی حمزہ کے ساتھ لڑائیاں بھی ہوئیں پر آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ وہ حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھ گی۔ حمزہ احمد نے شادی کے پہلے دن ہی اُسے کہا تھا کہ باسط کو کبھی معلوم نہ ہونے پائے کہ تم اُس کی سگی ماں نہیں ہو۔ اس کڑوے جھوٹ کو بینا نے میٹھے سچ کی طرح پیا۔ ایاز گود میں آیا تو اُسے باسط کی محرومی بھی سمجھ بھی آ گئی اور

نے کھلے دل، اور ماں کی آغوش کی طرح باسط کو سمیٹ لیا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بینا اپنے گھر کی خاطر بچوں کی خاطر سب کچھ بھول گئی۔ باسط سے اُس کی محبت کسی ریا اور دکھاوے پہ مبنی نہیں تھی۔ اور حمزہ احمد نے تمام ں کا اعتراف کیا۔

"امی آپ تو ایسے روتی ہیں جیسے میں کبھی واپس نہیں آؤں گا"۔ باسط نے ہنستے ہوئے اُسے چھیڑا تو اُس نے ے باسط کے لبوں پہ ہاتھ رکھ دیا"۔ "آئندہ یہ بات مت کرنا۔ میں سہہ نہیں پاؤں گی"۔ "امی نہیں کہوں گا ی کر دیں مجھے نہیں پتہ تھا آپ اتنی ڈرپوک اور بزدل ہیں"۔ "مائیں ایسی ہی ڈرپوک اور بزدل ہوتی ہیں جس ح میں ہوں اس لیے اب زبان سے کوئی ایسا حرف نہ نکالنا"۔ بینا نے وارننگ دی تو باسط نے بڑی سعادت مندی سر ہلایا۔

باسط اپنے پیچھے مائرہ کے دل میں بہت ساری بے چینیاں چھوڑ گیا۔ وہ پل پل اُسے یاد کرتی۔

☆☆☆

باسط کے جانے کے بعد مائرہ کا دل کہیں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ بینا نے اُسے پریشان یا تو چند روز کے لیے میکے جانے کا مشورہ دیا۔ مائرہ خود بھی یہی چاہ رہی تھی۔ چنانچہ اگلے دن حمزہ احمد اُسے گاؤں چھوڑ گئے۔

حویلی میں قدم رکھتے ہی پرانی اپنائیت جاگ پڑی۔ وہ سب رشتے یاد آ گئے جنہیں اتنے دنوں سے باسط کی ت میں بھولی ہوئی تھی۔ شریں، سائرہ، اُسے دیکھ کے بہت خوش ہوئیں۔ ہاں دریکتا سے ملتے ہوئے اُس نے ان ی گرمجوشی محسوس نہ کی اُسے دیکھ کر جیسے بادلِ نخواستہ مسکرا رہی ہو۔ "کیا بات ہے پریشان سی لگ رہی ہو"۔ اس سے چھا اور دریکتا کی بجائے جواب شریں کی طرف سے آیا۔ "پریشان کیوں نہ ہوگی بیچاری۔ دو دن بعد عدالت میں پیشی اور اُس اشعر لغاری نے کال کر کے تمہارے ابو کو بہت دھمکیاں دی ہیں اس کے بارے میں بھی اُلٹا سیدھا کہا ہے۔ یہ لیے رونی صورت بنائے بیٹھی ہے"۔

"اوہ اچھا دو دن بعد پیشی ہے"۔ مائرہ اُسے دیکھ کے رہ گئی پھر جیسے اچانک اُسے بھولے بسرے طیب کا خیال یا تو اُس کا پوچھ بیٹھی۔ "طیب کیسا ہے کہاں ہے"۔

"وہ ٹھیک ہے سو رہا ہے"۔ دریکتا آہستہ سے بولی۔ "اُس کی فکر مت کرو۔ بالکل ٹھیک ہے۔ بہت اچھے طریقے سے اُس کی پرورش ہو رہی ہے"۔ شریں نے اُسے کوئی اور بات ہی نہیں کرنے دی۔ مائرہ بھی اِدھر اُدھر کے قصوں میں لگ گی۔

☆☆☆

ابھی اتنی رات نہیں ہوئی تھی پر مائرہ جلدی لیٹ گی تھی۔ سیل فون کے ساتھ لگی ہوئی تھی کہ باسط کی کال آ گئی۔ ے خوشگوار حیرت ہوئی۔ "جی جناب کیسی ہیں ہماری بیگم صاحبہ"۔ باسط کا تروتازہ لہجہ کانوں سے ٹکرایا تو اُس کی ساری ی اور کلفت اُڑنچھو ہوگی۔

"میں ٹھیک ہوں تم سناؤ"

"ہماری کیا پوچھتی ہو۔ تمہاری جدائی میں تڑپ رہے ہیں"۔ "تو پھر گئے کیوں تھے مجھے چھوڑ کے"۔ "مجبوری

تھی مگر جلدی آؤں گا نہ فکر کرو۔'' ''آ و جاؤ ناں ابھی''۔ مائرہ بے چارگی سے بولی تو وہ ہنسنے لگا۔ ''اس طرح نہ بلاؤ میں سچ مچ آ جاؤں گا پھر پتہ ہے ناں میرا.....'' وہ شرما گئی۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ باسط نے ہی خاموشی کو توڑا۔

''خالہ کی طرف آئی ہو۔ امی نے بتایا تھا گھر بات ہوئی تھی میری۔ اور ہاں ایک بات یاد رکھنا تم اپنے بیٹے کی طرف مت جانا۔ ایسا نہ ہو یہاں آ کے تمہاری ممتا جاگ پڑے۔ میں برداشت نہیں کروں گا۔ تم نے ساری محبت میرے بیٹے میری اولاد کے لیے محفوظ رکھنی ہے۔ اگر میری زوجیت میں رہنا ہے تو''۔ باسط کے لہجے میں یکا یک خودغرضی در آئی۔ مائرہ کچھ بول ہی نہ پائی۔

باسط نے کچھ دیر بعد ایسی مزید ہدایات کے ساتھ فون بند کر دیا۔

وہ سیل فون رکھ کے اُس کے رویے کے بارے میں سوچنے لگی۔

جانے وہ اُس کے ماضی اور اُس سے وابستہ طیب سے اتنا بیزار کیوں تھا۔

☆☆☆

درکیتا کی آج عدالت میں پیشی تھی۔

تائی شریں، تایا اورنگزیب اُسے مسلسل سمجھانے، بجھانے میں لگے ہوئے تھے۔ پر نہ جانے کیوں اُس کا دل وسوسوں اور گھبراہٹ کا شکار تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ طوفان سے پہلے والی مخصوص خاموشی طاری تھی۔ کسی انہونی کا اشارہ تھا۔ درکیتا نے طیب کو ڈھیر سارا پیار کیا۔ اس سے اُس کے آنسو بہہ نکلے۔

''زیبن طیب کا خیال رکھنا میں آ جاؤں گی جلدی''۔ آنسو پونچھتے ہوئے اُس نے زیبن کو پھر یاد دہانی کروائی تو سائرہ مائرہ کی طرف دیکھ کے ہنس پڑی۔ ''بہت دکھ ہو رہا ہے اپنے ہزبینڈ سے علیحدگی کا''۔ وہ بہت عجیب سے لہجے میں بولی تو شریں نے ڈانٹا۔ ''کیا ہر وقت فضول باتیں کرتی رہتی ہو۔ ہم جا رہے ہیں کم از کم خیال کرلو اس کا۔ وہ اُدھر ہی بُرا سا منہ بنا کے چپ ہو کے بیٹھ گئی۔

شریں نے درکیتا کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا۔ اورنگزیب اور عاشر دوسری گاڑی میں تھے دونوں گاڑیاں ڈرائیور چلا رہے تھے۔

درکیتا سر جھکائے مسلسل اپنے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔ شریں باہر کے مناظر میں گم تھی۔

☆☆☆

طاہر کی طبیعت کچھ خراب تھی اس لیے اشعر نے منع کر دیا تھا کورٹ جانے سے ''پپا رہنے دیں آپ مت جائیں ریسٹ کریں۔ آپ کو ریسٹ کی ضرورت ہے۔ میں جا رہا ہوں آپ کو کال کر کے وہاں کی سچوایشن بتا دوں گا پھر آفس جاؤں گا''۔ وہ شوز پہن رہا تھا۔

طاہر نے بادل نخواستہ سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے مجھے بتا دینا جو بات بھی ہوئی''۔ ''او کے پپا، ڈونٹ وری''۔ اُس نے مڑ کے طاہر کو دیکھا اور اپنے کمرے میں آیا۔

اپنا پسٹل الماری سے نکالا اور کھول کے اُس کا چیمبر چیک کیا۔ ریوالور پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ اُس نے سیفٹی کیچ ہٹا دیا اور اُسے بیلٹ کے نیچے اڑس لیا۔ اشعر کے لبوں پہ پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

طاہر دیکھ لیتے تو آج ضرور اُس کے ساتھ جاتے۔

اُس نے پپا کے سامنے بے مثال صبر وضبط کا مظاہرہ کیا تھا اپنے لہجے اور کسی بھی انداز سے اپنے ارادوں کا اظہار ہونے نہیں دیا تھا۔ وہ نارمل نظر آنے میں پوری طرح کامیاب رہا تھا۔ تب ہی تو طاہر پُرسکون تھے۔

☆☆☆

اشعر عدالت کے احاطے میں پہنچا تو وہاں ابھی اتنی زیادہ رش نہیں تھا۔ درکیتا کے وکیل نے پیش کار کے ساتھ مل کے اپنے کیس کا پہلا نمبر لگوایا تھا تب ہی اشعر جلدی آیا تھا۔ اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی وہ لوگ ابھی نہیں پہنچے تھے۔ اشعر دوبارہ کورٹ سے باہر آ گیا۔ گاڑی اُس نے سائیڈ پہ پارک کی ہوئی تھی۔

وہ بار بار ریسٹ واچ دیکھ رہا تھا۔ اُن لوگوں کو اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ دس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد اورنگزیب کی گاڑی آتی نظر آئی۔ اشعر کو انہوں نے دیکھ لیا تھا۔ ڈرائیور نے اورنگزیب کے کہنے پہ گاڑی کا انجن بند کر دیا۔

اورنگزیب اور عاشر دونوں نیچے اُتر آئے۔ اُن کے پیچھے ہی شریں کے گاڑی کے ڈرائیور نے بھی ایسا ہی کیا۔ ''کیا بات ہے لگتا ہے تمہیں عقل آ گئی ہے تب ہی یہاں کھڑے ہو''۔ اورنگزیب نے دوستانہ انداز میں اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ اتنے میں شریں بھی گاڑی سے اُتر کر اُن کے پاس آ کے کھڑی ہو گئی۔ ''درکیتا تم بھی آ جاؤ''۔ جانے کیا سوچ کے شریں نے گم صم پریشان بیٹھی درکیتا کو اشارہ کیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے نیچے اُتری۔ پہلے دایاں پاؤں باہر رکھا پھر بایاں۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ اُسے ایسا کرنا چاہیے بھی کہ نہیں۔

''اُس کا فیصلہ ابھی ہو جائے گا''۔ اشعر نے نرمی سے اورنگزیب کا بازو کندھے سے ہٹایا۔ درکیتا شریں کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ اشعر نے دائیں ہاتھ سے ریوالور بیلٹ کے نیچے سے نکالا اور شریں کی اوٹ میں کھڑی درکیتا کو بائیں ہاتھ سے اپنی طرف کھینچا۔ یہ دونوں کام اُس نے انتہائی پھرتی سے کیے۔ ریوالور دیکھ کے اورنگزیب اور عاشر بھی پیچھے ہٹ گئے۔ اُن میں سے کسی کے پاس بھی اسلحہ نہیں تھا۔ یہ شوق صرف نوید کو تھا باقی کوئی بھی سر عام اپنے ساتھ نہیں رکھتا تھا۔

''میں اسے اپنے ساتھ لے کے جا رہا ہوں کسی کو اعتراض ہے تو بولے''۔ اُس کا لہجہ بلا کا سفاک تھا۔ درکیتا اس اچانک وار کے لیے تیار نہیں تھی بُری طرح ہراساں ہو گئی۔

اشعر نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کے درکیتا کو فرنٹ سیٹ پہ دھکا دیا اور خود بجلی کی تیزی سے اُس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اورنگزیب اور عاشر اور دونوں ڈرائیور ہکا بکا دیکھ رہے تھے۔ ''بہت بُرا کروں گا میں اشعر لغاری تمہارے ساتھ''۔ اورنگزیب نے دانت پیستے ہوئے اشعر کو غائبانہ دھمکی دی۔ وہ اپنے پیچھے گرد چھوڑ کر جا چکا تھا۔

☆☆☆

درکیتا بالکل خاموش تھی۔ کافی دیر اُسے اسی پوزیشن میں بیٹھے گزر گئی تھی۔ اُس کا سر گھٹنوں پہ دھرا تھا اور سرمو حرکت کا احساس تک نہ تھا۔

اشعر شہر کو کافی پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ اب وہ مضافاتی علاقے سے گزر رہا تھا۔ ''ایک بار ہی منزل پہ پہنچ کے دیکھیں گے آپ کو درکیتا صاحبہ''۔ وہ اُس کے بے سدھ وجود کو غور سے تکتے ہوئے خود سے بولا۔

اگلے پندرہ منٹ میں وہ فارم ہاؤس پہنچ چکا تھا۔ یہ فارم ہاؤس اشعر کے دوست کا تھا۔ کبھی کبھار پکنک کا ارادہ ہوتا تو سب دوست یہاں آ جاتے۔ کوئی فنکشن یا پارٹی ارینج کرنی ہوتی تو اُن دوستوں کا سب سے پہلا انتخاب فارم ہاؤس

ہی ہوتا تھا۔ اشعر نے اپنے اقدام کے بارے میں اپنے دوست کاشف کو اعتماد میں لے کے بتا دیا تھا۔ اُس نے خلوص سے ہر طرح کی مدد کی یقین دہانی کروائی تھی۔

اشعر چاہتا تو دریکتا کو براہ راست گھر بھی لے کے جا سکتا تھا پر اُس نے جان کے ایسا کرنے سے گریز کیا تھا۔

گیٹ کھلا ہوا تھا اور چوکیدار وہاں موجود تھا۔ کاشف کے حکم پہ چوکیدار اشعر کے یہاں آتے ہی چلا گیا۔ کاشف نے اندرونی داہنی جانب کے دونوں کمرے صاف کروا دیئے تھے۔ اشعر نے گاڑی اندر لا کر روکی۔ اپنی طرف کا دروازہ کھول کے اُترا اور دریکتا کی جانب آیا۔ اُس کا سر سابقہ پوزیشن میں گھٹنوں پہ دھرا تھا اور وہ گٹھڑی سی بنی ہوئی تھی۔ اشعر کو عجیب سا احساس ہوا۔ اُس نے جھک کے دریکتا کا سر سیدھا کیا تو وہ پھر ڈھلک گیا۔ بے اختیار وہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔ دریکتا جانے کب سے بے ہوش تھی۔

اشعر نے اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر نیچے اُتارا۔ وہ اُس کے اوپر آ رہی۔ اُس نے کندھے پہ اُٹھا لیا۔ دریکتا کے بالوں کی چوٹی اشعر کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ اور چادر زمین پہ ساتھ ساتھ گھسیٹ رہی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ یہ کیا مصیبت ہے''۔ وہ جھنجھلا سا گیا۔

اُس نے دریکتا کو صوفے پہ لٹا دیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ اشعر نے زور زور سے ہلایا پر اُس میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ اُس نے پھر دریکتا کا ناک اور منہ اپنی ہتھیلی سے بند کر دیا۔ یہ کوشش کارگر ثابت ہوئی۔ اُس کی آنکھیں دھیرے سے کھلیں۔ وہ ہوش میں آ رہی تھی۔ اشعر دور ہٹ کے کرسی پہ بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کے منہ میں دبائی۔

اُس کا رخ اور نگاہیں دریکتا کی جانب ہی تھیں۔ اُس نے پوری آنکھیں کھول کے پہلے چھت کو دیکھا۔ اجنبی در و دیوار تھے۔ اُس کی ساری بے ہوشی دم توڑ گئی۔ اور وہ تڑپ کے اُٹھ بیٹھی۔ اشعر اُس کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ صوفے سے ٹانگیں نیچے لٹکاتے ہی وہ وہیں ساکت ہو گئی۔ اُس نے اشعر کو دیکھ لیا تھا۔ وہی پرانا خوف عود آیا جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوئی تھی۔ اشعر کچھ بھی نہیں بول رہا تھا۔ اپنی گہری نگاہوں سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اور بھی ڈسٹرب ہو رہی تھی۔

اسی اثناء میں اُس کا سیل فون گنگنانے لگا۔ ''آپ کے تایا کی کال ہے''۔ اُس نے عام سے انداز میں اُسے انفارم کر کے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اورنگزیب بغیر دعا سلام کے شروع ہو گئے۔ ''میں تم پہ دریکتا کے اغوا کے جرم میں پرچہ کٹوا دوں گا''۔ اشعر ہنسنے لگا۔

آپ مجھے اپنی منکوحہ کو ساتھ لے جانے کے جرم میں اندر کروائیں گے۔ ہاہاہا۔ یہ شوق بھی پورا کر لیں۔ ''ویسے مجھے یہ نہیں پتہ کہ اگر کوئی اپنی منکوحہ کو ساتھ لے جائے تو اُس پہ کون سی دفعہ لگتی ہے۔ آپ نے پرچہ کٹوانا ہے تو شوق سے کٹوائیں۔ فی الحال میری بیوی میرے پاس ہے''۔ اشعر نے سرشار انداز میں بولتے ہوئے اچانک رابطہ منقطع کر دیا اور موبائل بیڈ پہ اُچھال دیا۔ دوسری طرف اورنگزیب بے بسی سے ہاتھ میں پکڑے اپنے فون کو دیکھنے لگے۔

☆☆☆

''میں ابھی جا رہا ہوں پپا کے پاس رات تک آ جاؤں گا۔ اگر آپ کا دل رونے اور چیخنے چلانے کو کر رہا ہو تو شوق سے کریں۔ یہاں ایک چوکیدار ہے اور وہ بھی اس وقت رہائشی حصے سے دور ہے۔ گونگا بہرا ہے اُس پہ اثر نہیں ہو گا۔ یہ فریج پڑا ہے اس میں پانی، پھل اور بریڈ پڑی ہے۔ بھوک لگے تو اُسی سے کام چلائیں۔ کھانا میں اپنے ساتھ رات کو لے آؤں گا۔ تب تک ریسٹ کریں یا اچھی طرح رو دھو لیں''۔ اشعر اُسے دیکھ تک نہیں رہا تھا۔ باہر نکل کے اشعر نے دروازہ لاک کر دیا اور چابی جیب میں ڈال لی۔ اُس کے باہر نکلتے ہی دریکتا نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ وہ ساتھ ہی بچاؤ بچاؤ کی آواز بھی بلند کر رہی تھی۔ اشعر کو اُس کی بیوقوفی پہ ہنسی آ گئی کیوں کہ اس ویرانے میں دور دور تک اُس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ سوائے چوکیدار کے۔ وہ بھی اس وقت یہاں سے دور اپنے کوارٹر میں تھا۔ کاشف نے پہلے ہی اُسے کہہ دیا تھا کہ اشعر کے کسی کام میں مداخلت نہیں کرنی۔

سیٹی پہ شوخ سی دُھن بجاتے ہوئے اُس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اُس کا پورا وجود فتح کے نشے سے سرشار تھا۔

دریکتا اب اُس کے رحم و کرم پہ تھی۔

اورنگزیب کی کال پھر آ رہی تھی۔ اُس نے دھیان نہیں دیا۔

طاہر لغاری کو نائیٹ ڈیوٹی کا بول کر اشعر نے اپنی غیر موجودگی کا اچھا جواز ڈھونڈا تھا۔ خود اُس نے پپا کے ساتھ کھانا کھایا اور دریکتا کے لیے ایک ریسٹورنٹ سے پیک کروایا۔ کافی ٹائم ہو گیا تھا۔ اُس نے گاڑی کی اسپیڈ بتدریج بڑھا دی۔

چوکیدار اپنے کوارٹر میں تھا کیونکہ اُس کا گیٹ پہ رہنے کا جواز نہیں تھا۔ صاحب نے کہا تھا اُسے وہ مزے سے آرام کر رہا تھا۔

کمرے والی بی بی خود ہی رو پیٹ کے چپ ہو گئی تھی۔ چوکیدار کو تجسس تو تھا پر اُس نے زیادہ کرید مناسب تصور نہیں کیا۔

☆☆☆

صبح سے رات ہو گئی تھی۔ طیب رو رو کے بے حال ہو رہا تھا۔ زیبن اُسے پہلے افیم دے کے سلاتی رہی تھی پر آج دریکتا کی غیر موجودگی میں اُس نے پھر وہ غلطی نہیں دہرائی۔ سب گھر والے انتہائی پریشان تھے۔ اُدھر طیب نے رو رو کے جان عذاب میں ڈالی ہوئی تھی۔ چھوٹا بچہ تھا دریکتا کے لاڈ پیار سے مانوس تھا اور اُس کی غیر موجودگی سے بے چین۔ شیریں جھنجھلا رہی تھی۔ ''ارے کریں فون اشعر کو اور پوچھیں کہاں لے گیا ہے دریکتا کو''۔ ''ہاں جیسے وہ بتا دے گا ناں۔ اسی انتظار میں بیٹھا ہے وہ ہم پوچھیں اور وہ بتا دے''۔ اورنگزیب بُری طرح اُسی پہ بگڑ گئے تو شیریں اپنا سا منہ لے کے رہ گی۔

زیبن دوبار طیب کو مائرہ کے پاس لائی تو شیریں اُس پہ غصہ ہونے لگی وہ بے چاری چپ ہو گی۔ طیب اُس سے چپ ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

دریکتا دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے قالین پہ بیٹھی تھی۔ وہ رو رو کے نڈھال تھی طیب کس طرح رہا ہو گا اُس کے بغیر۔ اور باقی سب خاندان والے کس قدر پریشان ہوں گے۔ کیا سوچ رہے ہوں گے۔ پپا کا کیا حال ہو گا۔ پورے گھر پہ کس قدر پریشانی طاری ہو گی۔ واقعی اشعر لغاری اچھا آدمی نہیں ہے۔ اگر اچھا اور باکردار انسان ہوتا تو اُسے کبھی بھی اس طرح نہ لاتا یہاں۔ دریکتا اُسے ریوالور نکالتے دیکھ کر ہی خوفزدہ ہو گی تھی اور گاڑی میں اُس کے حواس اُس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ یہاں آبادی سے دور لے آیا تھا۔ جہاں اُس کی فریاد پہ کوئی کان دھرنے والا تک نہ تھا۔ وہ اس جگہ اکیلی تھی۔ اور

اشعر لغاری کو اُسے یہاں بند کر کے جاتے ہوئے ذرہ بھر رحم تک نہ آیا کہ وہ ایک کمزور اور نازک دل لڑکی ہے۔ کہیں خوف کے مارے مر ہی نہ جائے۔

درریکتا نے دروازے اور کھڑکیوں پہ زور آزمائی کی تھی پر اُسے ناکامی ہوئی کیونکہ دروازہ اور کھڑکیاں مضبوط لکڑی سے بنی تھیں اور اُن میں ایک دراڑ تک نہ تھی۔ تھک ہار کے وہ بیٹھ گی اور سب گھر والوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اب آنسو نئے سرے سے اُمنڈے آرہے تھے۔

اچانک باہر کسی گاڑی کے ٹائر چر چرائے۔ درریکتا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ یہاں سے بھاگنا چارہی تھی اور ابھی اُس کے پاس ایک موقعہ تھا۔ گاڑی میں آنے والا یقیناً اشعر لغاری تھا۔ کیونکہ اُس نے کہا تھا میں رات کو آؤں گا۔ درریکتا کے ذہن میں ایک منصوبہ آیا۔ اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے ٹیبل لیمپ پڑا تھا۔ اُس نے ہاتھوں میں اُٹھا لیا۔ اچھا خاصا بھاری تھا۔ وہ دروازے کی اُوٹ میں کھڑی ہوگئی کہ جیسے ہی اشعر اندر آئے وہ بے خبری میں اُس کے سر پہ دے مارے اور یہاں سے بھاگ نکلے۔ اشعر لغاری کے تیور اُسے چھوڑنے والے نہیں لگ رہے تھے۔ اگر وہ اپنے ارادے میں ناکام ہو بھی گئی تو اُسے یہ دکھ تو نہیں ہوگا ناں کہ اُس نے کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

good

گاڑی کا دروازہ کھول کے پیک کیا ہوا کھانا اشعر نے ایک ہاتھ میں پکڑا۔ اُس کے دوسرے ہاتھ میں کمرے کی چابی تھی۔ اُس نے اسی طرح ایک ہاتھ سے چابی، کی ہول میں گھمائی۔ درریکتا دروازے کے پیچھے دونوں ہاتھوں میں وزنی لیمپ پکڑے کھڑی تھی۔ دروازہ کھلا درریکتا کا ہاتھ کسی خوف کے احساس سے کانپا اور لیمپ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اشعر بال بال بچ گیا پر درریکتا کے لبوں سے نکلنے والی آوازیں بہت دردناک تھی۔ وزنی لیمپ اُس کے پاؤں پہ لگا تھا۔ دروازے کے پاس ہی لڑکھڑا کے گری۔

اشعر اندر کا منظر دیکھتے ہی بغیر کہے سنے سب کچھ جان گیا تھا۔ درریکتا کے پاؤں سے خون نکل رہا تھا۔

اشعر نے کھانا وہیں رکھا اور بیٹھ کے اُس کا پاؤں بغور دیکھا۔ بظاہر کوئی گہری چوٹ نظر نہیں آرہی تھی۔ پر خون تیزی سے نکل رہا تھا۔ یہاں بینڈیج کا سامان موجود نہیں تھا البتہ باتھ روم کی کیبنٹ میں ٹنکچر آیوڈین اشعر کو مل گئی۔

اُس نے زخم صاف کیا اور پھر درریکتا کی ہی چادر کے کونے کو پھاڑ کر پٹی سی بنا کے اُس کے پاؤں پہ باندھی۔ اُٹھیے بیڈ تک چلیئے۔ کافی سزا مل گی ہے آپ کو اپنے کیے کی۔ اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں آپ خود ہی گر گئی ہیں۔ اُس کی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ درریکتا نے نظر انداز کر دیا تو اُس نے بُرا نہیں منایا۔ بلکہ کرسی پہ مزے سے بیٹھ گیا۔ خود ہی کسی نہ کسی طرح اُٹھی اور صوفے تک جانے میں کامیاب ہوگی۔

اشعر نے کھانا پلیٹوں میں نکالا اور اُس کے سامنے رکھ دیا۔ ''کھالیں کھانا۔ آپ نے یقیناً صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے میں اتنے میں چوکیدار سے پین کلر کا پوچھ لوں اگر مل جائے تو''۔

وہ اس بار دروازہ لاک کیے بغیر باہر گیا۔ اُسے سو فیصد یقین تھا درریکتا زخمی پاؤں کے ساتھ کہیں نہیں جا سکتی اُس کا یقین بے جا نہیں تھا۔

خوش قسمتی سے پین کلر مل گئی چوکیدار کے کوارٹر میں فریج میں پڑی تھی۔ اشعر اُسے لے آیا وہ خود جان بوجھ کافی دیر لگا کے آیا تھا کہ اُس کی غیر موجودگی میں درریکتا اچھی طرح کھانا کھالے۔

درریکتا نے کھانا کھایا تو تھا پر برائے نام۔ لگتا تھا کھانے کو جیسے چکھا گیا ہے بس۔

''یہ پین کلر لے لیں آرام آجائے گا۔ اُس نے دو گولیاں درریکتا کے سامنے رکھ دیں۔ اُس نے میکانکی انداز میں اُٹھا کے پانی کے ساتھ نگل لیں۔''

''فی الحال آپ زخمی ہیں مزید کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ابھی صرف سونے کا ہی کہوں گا۔ سو جائیں۔ باقی حساب کتاب پھر ہوں گے۔ بڑے اُدھار آپ کی طرف نکلتے ہیں''۔ اشعر طنزیہ انداز میں بولا۔ اُس نے شوز اور موزے اُتار کے بیڈ کے نیچے رکھے۔ اس سے پہلے کہ وہ شرٹ اُتارتا۔ اورنگزیب کی کال آ گی۔ اشعر کے ماتھے پہ بل پڑ گے۔ اُس نے سیل آف کر کے رکھ دیا۔

اُسے سخت نیند آرہی تھی۔ آج کا پورا دن بھاگ دوڑ میں گزرا تھا۔ اب وہ تھکا ہوا تھا۔ جسم آرام مانگ رہا تھا۔

وہ تو سو گیا پر درریکتا کچھ تو پاؤں کی تکلیف اور کچھ اپنی تکلیف دہ سوچوں کی وجہ سے بھی جاگتی رہی۔

☆☆☆

طیب رات بھر وقفے وقفے سے روتا رہا۔ وہ روتا بھی تو بہت بلند آواز میں تھا۔ سب کی نیند ڈسٹرب ہو ہی رہی تھی۔ اس لیے شریں صبح کچھ اُکھڑی اُکھڑی سی تھی۔ اُس نے اورنگزیب کو مشورہ دیا کہ طاہر لغاری کو فون کریں اور اُسے اشعر کے کارنامے کا بتائیں تا کہ وہ درریکتا کے سلسلے میں اُس پہ دباؤ ڈال سکیں۔

پر اورنگزیب اس تجویز سے متفق نہیں تھا۔ اشعر نے اپنی من مانی کرنی تھی۔ درریکتا اُس کے پاس تھی۔ بھلا طاہر لغاری کیا کر سکتے تھے۔

اورنگزیب کی لاکھ کوشش کے باوجود اُسے ناکامی ہوئی تھی درریکتا کی تلاش میں جانے اشعر نے اُسے کہاں رکھا ہوا تھا۔

یہ بات تو طے شدہ تھی کہ درریکتا اس وقت اشعر کے گھر میں موجود نہیں تھی۔ اورنگزیب نے پتہ بھی کروالیا تھا اُس کے گھر کے بارے میں۔

باقی اُن کے ذہن میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں وہ درریکتا کو رکھ سکتا تھا۔ طیب کی وجہ سے اور درریکتا کے اغوا کی وجہ سے عجیب سے حالات پیدا ہو گے تھے۔ سارا بنا بنایا کھیل بگڑ کے رہ گیا تھا۔ اُنہوں نے جو سوچا تھا ویسا ہوا ہی نہیں۔ درریکتا کو اشعر طلاق دے دیتا تو اورنگزیب اُس کی شادی عاشر سے کر دیتے۔ درریکتا کا شوہر ہونے کے رشتے سے سب کچھ عاشر کا ہو جاتا۔ پھر اُنہیں کوئی الزام نہیں دے سکتا تھا کہ اُنہوں نے ظلم و زبردستی سے درریکتا کی جائیداد پہ قبضہ کیا ہے۔ سب کچھ قانونی ہوتا۔

یہ بات تو طے تھی کہ اُنہوں نے آسانی سے ہار نہیں مانی تھی۔ مگر اس کے لیے درریکتا کا جلد از جلد بازیاب ہونا ضروری تھا۔ اُسے گھر سے غائب ہوئے بلکہ اغوا ہوئے ایک دن اور ایک رات گزر چکی تھی اور نیا دن چڑھ آیا تھا۔

اس وجہ سے مائرہ نے بھی اپنے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اب نہ درریکتا کا کچھ پتہ چل رہا تھا اور نہ طیب کے چڑچڑے پن میں کمی ہو رہی تھی۔ اسی حساب سے شریں کا پارہ ہائی ہو رہا تھا وہ اشعر لغاری کو کوسنے دے رہی تھی۔

وہ اتنی آسانی اور آرام سے اُن کے سامنے درریکتا کو ساتھ لے گیا وہ کچھ کر ہی نہیں پائے۔ شریں طعنہ دیتی تھی اورنگزیب کو کہ آپ کو مسلح ہو کے جانا چاہیے تھا ورنہ اشعر کبھی بھی درریکتا کو ساتھ لے جانے میں کامیاب نہ ہوتا۔ وہ غصے، میں

شریں کو ناقص العقل عورت کا خطاب دیتے۔

اُن دونوں کی اپنی کھٹ پٹ شروع تھی۔ اورنگزیب یکسوئی سے کچھ بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ شریں بے صبری ہو رہی تھی۔ اُس کا سارا زور اسی بات پہ تھا کہ جلد از جلد دریکتا کو لے کے آئیں۔ اورنگزیب اُسے غصے سے دیکھ کر رہ جاتے۔ وہ ایسے ہی تو شریں کو ناقص العقل نہیں کہتے تھے ناں۔ کتنے آرام سے حکم دیتی تھی کہ دریکتا کو لے آئیں۔ جیسے شادی کے بعد بیاہ کے اپنے سسرال گئی ہوئی ہے۔ اشعر لغاری انا پسند اور غیرت مند نوجوان تھا بھلا وہ اپنی بیوی کو اُن کے پاس دوبارہ واپس آنے دے گا کبھی بھی نہیں۔ وہ پولیس میں ابھی تک اس واقعے کی رپورٹ تک درج نہیں کروا پائے تھے۔ اشعر ٹھیک ہی کہتا تھا وہ کیا ایف آئی آر درج کروائیں کہ اشعر لغاری اپنی منکوحہ کو زبردستی گن پوائنٹ پہ ساتھ لے گیا ہے۔ اس واقعے کا اُن کے ڈرائیور، عاشر اور شریں کے علاوہ کوئی عینی گواہ نہیں تھا۔ وہ زیب داستان کے اضافے کے ساتھ ایف آئی آر درج کروا بھی دیتے تو کیا ہوتا۔ وہ ایف آئی آر میں درج کرواتے کہ اُس کے پاس اسلحہ تھا اور اُس نے سرعام ہمیں ڈرایا دھمکایا تو اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھا۔ وہ پولیس آفیسر تھا اُس کے پاس اسلحہ ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی وہ دریکتا کو عین سڑک سے اُٹھا کے اپنے ساتھ لے گیا اس بات کی بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ دانت پیسنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بس ایک بار دریکتا کسی طرح اُس کے شکنجے سے آزاد ہو جاتی تو پھر اشعر قیامت تک اُس کی گرد بھی نہیں پا سکتا تھا۔ اُنہوں نے انتہائی حد تک سوچ رکھا تھا۔

☆☆☆

ملجگا ملجگا سا اُجالا تھا جب دریکتا کی آنکھ کھلی۔ اشعر کونے میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ دریکتا کا دل تنفر سے بھر گیا۔ ''ہونہہ دکھاوے کی نماز پڑھتا ہے یہ دو نمبر انسان''۔ اُس نے دل میں خود سے کہا۔ اشعر نے نماز پڑھ کے مصلے اُٹھایا۔ دریکتا نے رُخ پھیر لیا۔ وہ اُس کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ اشعر نے دروازہ کھول دیا۔ باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ چوکیدار کو ناشتے کے لیے کہنے چلا گیا۔ اس وقت فارم ہاؤس میں چوکیدار کے علاوہ کوئی اور ملازم نہیں تھا چنانچہ اُلٹا سیدھا ناشتہ اُسی نے بنایا اور ساتھ یہ بھی خوشخبری سنائی ایک دو گھنٹے تک گل زرین اور اُس کی بیوی بھی آ جائے گی پھر کھانے پینے کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ وہ دونوں بھی اِدھر ہی کام کرتے تھے۔ کچھ دن کی چھٹی پہ گاؤں گئے تھے۔

چوکیدار نے چائے کے ساتھ ٹوسٹ سینکے تھے ساتھ انڈے تھے۔

اشعر خود ناشتے کی ٹرے لیکر واپس آیا۔ دریکتا کمرے میں کہیں نہیں تھی۔ صوفے کے پاس اُس کا صرف ایک جوتا پڑا تھا۔ اشعر نے کل جب اُسے اپنے ساتھ زبردستی گاڑی میں بٹھایا تھا تو اُس کا ایک جوتا وہیں کہیں اُتر گیا تھا اور ایک پاؤں میں رہ گیا تھا۔ اس ایک اکلوتے جوتے کی مالک کمرے سے غائب تھی۔ زخمی پاؤں کے ساتھ وہ کہاں جا سکتی تھی اتنی صبح۔ اشعر نے یہی سوچتے ہوئے باتھ روم کے دروازے کو چیک کیا تو وہ اندر سے بند تھا۔

وہ واپس آ کے بیٹھ گیا۔ دریکتا منہ ہاتھ دھو کے باہر نکلی اور صوفے پہ لاتعلق سی ہو کے بیٹھ گئی۔ ''ناشتہ کر لیں میں آپ کے منہ میں نوالے ڈالنے والا نہیں ہوں''۔ اُس نے اپنے کپ میں چائے ڈالی اور گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ وہ اُسی طرح بیٹھی رہی۔ کل رات بھی اُس نے برائے نام کھایا تھا اور اب بھی اُس کا موڈ کچھ ایسا ہی نہ کھانے والا لگ رہا تھا۔

اشعر نے دوسرے کپ میں اُس کے لیے چائے ڈالی دو توس اور ایک انڈا پلیٹ میں رکھا اور اُسی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''ناشتہ شروع کریں۔ میں اپنی بات تیسری مرتبہ دہرانے کا عادی نہیں ہوں''۔ دریکتا کا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا پر سامنے ساتھ بیٹھے اشعر لغاری کا لہجہ نظر انداز کرنے والا نہیں تھا۔

اُس نے آنسوؤں کے ساتھ چائے حلق میں اُتاری اور آدھا توس بمشکل کھا پائی۔ اشعر نے اورنگزیب انکل کا نمبر ملایا اور دریکتا سے بات کرنے کے لیے کہا۔ وہ خود فون اُسے دے کر اُس کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔ دریکتا بات کرتے ہی رو پڑی۔

''تایا پلیز مجھے لے جائیں اپنے ساتھ''۔ دوسری طرف سے طیب کے رونے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ وہ زیبن کی گود میں تھا اور حسبِ عادت گلا پھاڑ پھاڑ کے رو رہا تھا۔ دریکتا کی حساس سماعتوں تک اُس کی آواز بخوبی پہنچ رہی تھی۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا وہ جھپٹ کے طیب کو سینے سے لگا لے۔ وہ اُس کا رونا اُس کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

وہ اس تھوڑے سے عرصے میں اُس کے معصوم اور بے ضرر وجود کی عادی ہو گئی تھی۔ اور اس دُکھ سے بھی اس کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھتی تھی کہ مائرہ نے بھی شادی کر لی تھی۔ طیب کا وجود اُس کے شوہر اور خود شائد مائرہ کو بھی گوارا نہیں تھا۔

''تم کہاں ہو دریکتا آرام سے بات کرو میرے ساتھ''۔ اورنگزیب کی ہیجانی آواز اُبھری۔

''مجھے نہیں پتہ میں کہاں ہوں''۔ وہ پھر سے رو پڑی۔ اشعر نے اُس کے ہاتھ سے اپنا سیل فون لے لیا اور آف کر دیا۔

''آپ فی الحال ریسٹ کریں میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ دروازہ لاک کر جاؤں گا کیونکہ مجھے آپ پہ اعتبار نہیں ہے''۔ اُسے روتے دھوتے چھوڑ کے وہ خود چلا گیا۔

کچھ ضروری کام تھے جو اُس کی موجودگی میں ہی ممکن تھے۔

☆☆☆

طیب کی حالت بگڑ گئی تھی اُسے تیز بخار تھا۔ زیبن اُسے سنبھال سنبھال کے خاموش کروا کروا کے خود بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ مائرہ کو جانے کیسے رحم آ گیا تھا۔ زیبن نے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے کہا تو وہ راضی ہو گی۔ دل میں یہ احساس جاگزیں تھا کہ طیب میری اولاد ہے۔ دریکتا نہیں ہے جو اس کا خیال رکھے۔ بے چارہ رو رو کے نڈھال ہو رہا ہے۔ زیبن نے ہی طیب کو اُٹھایا تھا وہ صرف اُس کے ساتھ گئی تھی۔

جلدی میں مائرہ سیل فون ساتھ لے جانا بھول گی۔

باسط کی کال آئی تو سائرہ نے ریسیو کر کے پوچھنے پہ مائرہ کا بتا دیا کہ وہ طیب کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہے۔

باسط نے کہا جب وہ آ جائے تو مجھے کال کر لے اُسے کہہ دینا۔

گھر آنے پہ سائرہ نے باسط کا پیغام اُسے پہنچا دیا۔

مائرہ کے دل میں اُتھل پتھل ہونے لگی جانے اُس کا ری ایکشن کیا ہونا تھا۔ سائرہ بے وقوف نے کیوں بتایا تھا بھلا اُسے کہ وہ طیب کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہے۔

مائرہ نے اسی خوف کے ساتھ باسط کو کال کی۔ وہ سلام دعا کے بغیر برسنا شروع ہو گیا۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا ناں ماضی بھول جاؤ۔ اور اپنی محبت اپنا مامتا میرے بچوں کے لیے محفوظ رکھو۔ تمہیں

میری بات سمجھ نہیں آتی۔ مجھے نفرت ہے شاہ زیب کے بچے سے۔ میں جب اُن لمحات کا تصور کرتا ہوں جب تم اُس کے ساتھ ہوتی تھی تو میرا دل پھٹنے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے میں ریزہ ریزہ ہو کے فضا میں بکھر جاؤں گا۔ میرا روم روم جلتا ہے۔ اب تم اِدھر ہی بیٹھو اپنی ماں کے گھر اور اپنے ماضی کی نشانی کو سینے سے لگا کے رکھو۔ میرے گھر آنے کی ضرورت نہیں''۔

باسط نے اس کے بعد کھٹ سے فون بند کر دیا۔ مائرہ نے بے تابی سے دوبارہ نمبر ملایا۔ باسط نے بزی کر دیا اُس نے دس بارہ بار ایسے ہی کیا پر باسط کال ریسو ہی نہیں کر رہا تھا۔ مائرہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے وہ سائرہ پہ چڑھ دوڑی۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی باسط کو یہ بتانے کی میں طیب کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہوں''۔ ''اگر بتا دیا تو اس میں اتنا غصہ ہونے والی کیا بات ہے۔ اُنہوں نے پوچھا میں نے بتا دیا۔ پتہ نہیں آپ سب سچ کا سامنا کرنے سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں۔ اپنی اولاد کو آپ باسط بھائی کے ڈر سے سینے سے نہیں لگا تیں اُدھر امی ہیں وہ چاہتی ہیں کہ دریکتا طیب کو سنبھالے اور آپ آرام سے زندگی گزاریں۔ اور اُدھر دریکتا اپنے شوہر سے ڈرتی ہے۔ مجھے تو آپ سب کی سمجھ نہیں آتی۔ سائرہ نے لااُبالی پن سے بڑی گہری بات کر دی تھی۔

''بند کرو اپنی تقریر۔ میری خوشیوں سے تو تمہیں کوئی سروکار ہی نہیں ہے''۔ مائرہ اونچا اونچا رونا شروع ہو گئی تو شریں حواس باختہ بھاگتی آئی کہ جانے کیا ہو گیا ہے جو مائرہ یوں رو رہی ہے۔ سائرہ ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اور مائرہ رو رہی تھی۔

''ارے کیا ہوا ہے مجھے بھی تو بتاؤ''۔ اُنہوں نے سائرہ کے کندھے جھنجھوڑے۔

''ہونا کیا ہے باسط کی کال آئی تھی اور......'' مائرہ الف تا بے بتانے لگی۔

شریں سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ ''یہ مصیبت میرے سر آ کے رہنی تھی۔ ارے مر کے بھی شاہ زیب تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ رہا ہے۔ میں نے تمہیں کتنی بار کہا کہ طیب کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ارے جن کا خون ہے سنبھالیں۔ ہم نے ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے پرائی اولاد پالنے کا''۔ وہ یہ بات کہتے ہوئے بھول گئی تھی کہ شاہ زیب عمر کا بیٹا ہے اور عمر اورنگزیب کا بھائی ہے۔

''میں تمہیں خود چھوڑ کے آؤں گی باسط ہوتا کون ہے میری بیٹی کو یہ بات کہنے والا میں حمزہ بھائی سے کہوں گی اپنے لاڈلے کو سمجھائے''۔ شریں کبیدہ ہو رہی تھی۔

''آپ بینا خالہ سے کہیں باسط خالہ کے بہت قریب ہے''۔

مائرہ بولی ''ارے قریب کیوں نہ ہو گا میری بہن نے جان لڑا دی ہے پرائی اولاد کے لیے۔ اپنا بیٹا بنا کے رکھا لاڈ کیا''۔ بے خیالی میں شریں کے منہ سے نکل تو گیا پر اب پچھتا رہی تھی۔ شریں کے پاس مائرہ قریب ہو کے بیٹھ گئی۔ امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں باسط اور پرائی اولاد۔ وہ حیران تھی۔ ''ہاں مائرہ باسط حمزہ بھائی کی پہلی بیوی سے ہے۔ یہ دو سال کا تھا جب وہ فوت ہوئی۔ حمزہ کراچی جا کے سیٹل ہو گیا۔ سب رشتہ داروں سے دور اور بینا سے بھی کہا کہ باسط پہ یہ راز کھلنا نہیں چاہیے کہ تم اس کی سگی ماں نہیں ہو۔ میری بہن پہ آفرین ہے اُس نے پرورش کا حق ادا کر دیا''۔

شریں نے سب کچھ بتا دیا۔ بات اُن کے منہ سے نکل گئی تھی اب چھپانے کا فائدہ نہیں تھا۔ ویسے اُن کے خیال میں حمزہ بھائی کو یہ بات چھپانی نہیں چاہیے تھی باسط سے۔ زندگی کے کسی موڑ پہ کسی ذریعے سے اُسے یہ راز پتہ چلتا تو اُسے ٹھیس لگنی تھی لازمی۔

خیر یہ حمزہ بھائی کا اپنا مسئلہ ہے۔ شریں کے سامنے ابھی مائرہ اور اُس کی خوشیاں تھیں۔

''تم کل تیاری رکھنا میں خود تمہیں گھر چھوڑ کے آؤں گی ساتھ حمزہ بھائی سے بات بھی کروں گی باسط کو جھاڑیں''۔

شریں نے مائرہ کو ساتھ لگا کر تسلی دی تو کچھ سکون ملا اُسے۔ مگر یہ جاننے کے بعد کہ باسط بینا خالہ کا بیٹا نہیں ہے۔ اُس کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔ وہ آج سے پہلے تک یہی سمجھتی آئی تھی کہ باسط بینا خالہ کا بیٹا اور اُس کا کزن ہے۔

''بینا خالہ بڑی ہمت والی ہیں پرائی اولاد کو اپنا لیا''۔ مائرہ نے حیرانی سے سوچا۔ اور خود باسط کیا تھا کسی اور عورت کا بیٹا۔ اُن کی سوتن کا بیٹا جسے خالہ نے سگی اولاد سے بڑھ کے چاہا۔ جانے باسط کا دل اتنا تنگ کیوں تھا جو طیب کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔

مائرہ یہی سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

سب کچھ ٹھیک تھا۔ طاہر لغاری کو کچھ پتہ نہیں تھا اور نہ ہی اورنگزیب یا عاشر میں سے کسی نے اُنہیں اطلاع دی تھی۔ اشعر نے دریکتا کے لیے کچھ کپڑے خریدے۔ دو دن سے وہ ایک ہی سوٹ میں ملبوس تھی اور چادر کا کونا بھی پھٹا ہوا تھا۔ ایک جوتا بھی نہیں تھا۔ اشعر نے اندازے سے اُس کے لیے سینڈل لیے۔ زنانہ شاپنگ کا اُسے کوئی خاص تجربہ نہیں تھا بس جو سامنے آیا اُس نے لے لیا۔

اُس کی واپسی مختلف کاموں کو نپٹاتے ہوئے رات کو ہی ہوئی۔ دریکتا بیٹھی ہوئی تھی۔ دو دن سے اُس نے بالوں میں کنگھی نہیں کی تھی۔ نہ اُس کا جی چاہتا تھا۔ عجیب اُجڑے فرار جیسی حالت تھی اُس کی۔

کل کی طرح اشعر آج بھی کھانا پیک کروا کے ساتھ لایا تھا۔ ''آپ کا پاؤں ٹھیک ہے''۔ اُس نے آتے ساتھ ہی پوچھا۔ دریکتا نے کوئی جواب نہیں دیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔ اشعر نے دوبارہ نہیں پوچھا۔ ''کھانا کھا کے کپڑے بدل لیں یہ میں ساتھ لایا ہوں اور اپنا حلیہ ٹھیک کریں۔ میں نفیس ذوق کا مالک ہوں''۔ اشعر کا اشارہ اُس کے بکھرے بالوں کی جانب تھا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے''۔ اُس نے پہلی بار خود سے بات کی تھی۔ ''او کے نہ کھائیں بھوک نہیں ہے تو...... خیر آپ کے تایا جان کی کالز سارا دن آتی رہی ہیں۔ آپ سے کوئی بات کرنا چاہ رہے ہیں یہ لیں بات کریں میں ذرا فریش ہو لوں''۔ وہ اپنا سیل فون اُس کی جانب اُچھال کے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

دریکتا کو نمبر معلوم تھا تایا اورنگزیب کا۔ اُس نے نمبر ڈائل کیا۔ پہلی بیل پہ ہی کال ریسو کر لی گئی۔ تایا اورنگزیب خود ہی تھے۔ دریکتا بات کرتے ہوئے رو پڑی۔

''طیب کی حالت بہت خراب ہے آج بھی ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ تم اشعر سے کہو اُسے بتاؤ طیب کی حالت کا۔ کسی طرح اُسے راضی کر لو۔ طیب کسی سے بھی چپ نہیں ہو رہا ہے''۔ تایا اورنگزیب بتا رہے تھے۔ وہ اُسے کچھ ہدایات دے رہے تھے وہ چپ ہو کے سن رہی تھی۔

اتنے میں اشعر نہا کے آ گیا اور سیل فون اُس کے ہاتھ سے لے لیا اور کان سے لگا لیا۔ ''اُس کی منت کرو۔ بتاؤ

طیب کا"۔ اُنہیں نہیں پتہ تھا کہ اب فون اشعر کے پاس ہے۔ وہ بولا تو اُنہیں پتہ چلا۔ "دریکتا کو واپس چھوڑ جاؤ۔ سارے خاندان میں بدنامی ہو رہی ہے ہماری کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہم۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں۔ اُسے چھوڑ دو۔ ہمارے گھر میں مسائل بڑھ رہے ہیں۔ دریکتا عمر کی دیکھ بھال کرتی تھی وہ مانوس تھا اب کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ تمہیں ہم سب پہ رحم نہیں آتا کیا"۔ وہ جذباتی بلیک میلنگ پہ اُتر آئے تھے۔

"آپ کی بدنامی کیوں ہو رہی ہے کیوں آپ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ دریکتا میری بیوی ہے میں اُس کا جائز، شرعی شوہر ہوں میرے پاس ہے وہ۔ کسی غیر کے پاس نہیں جو آپ کی بدنامی ہو رہی ہے۔ باقی اب آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ کے مسائل ہیں جس طرح بھی اُن کو حل کریں۔ مجھے ڈسٹرب نہ کریں"۔ اشعر نے جھنجھلاتے ہوئے کال بند کر دی اور اپنے گیلے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ دریکتا نے اچانک ایک ایسی حرکت کی جس کی توقع اشعر نہیں کر پا رہا تھا۔

اُس نے گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے اشعر کے پاؤں پکڑ لیے۔

"پلیز مجھے گھر چھوڑ آئیں۔ طیب بہت سخت بیمار ہے۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مائرہ بھابھی بھی شادی کر کے اپنی دنیا میں مگن ہو گئی ہیں۔ کوئی اُس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔ پپا وہاں اکیلے پڑے ہیں۔ میری ذمہ داری ہیں۔ پلیز آپ کو خدا کا واسطہ مجھے جانے دیں۔ مجھے یہاں اس طرح بند کر کے آپ کو کیا ملے گا۔ طیب کو کچھ ہو گیا تو......" اُس کے بعد دریکتا کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اُسے کوئی اور بات کی ہی نہیں جا رہی تھی۔

اشعر نے اُس کے ہاتھوں سے اپنے پاؤں چھڑوائے۔ "اوپر بیٹھ کے بات کریں۔ میں یہ سب پسند نہیں کرتا جس طرح ابھی آپ نے کیا ہے"۔ اشعر کا اشارہ پاؤں پکڑنے کی جانب تھا۔ "میں خلع کا کیس واپس لے لوں گی۔ رخصت ہو کے آپ کے پاس آ جاؤں گی۔ بس ایک بار مجھے یہاں سے جانے دیں"۔

اُس کی آنکھوں سے اشک باری ختم ہو گی تھی۔ اب وہ اُمید بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اُسے یقین ہو اس بار وہ انکار نہیں کرے گا۔

"آپ کو میں یہاں سے جانے دوں تاکہ آپ پھر میرے خلاف عدالت میں کھڑی ہو جائیں اپنے تایا کے ساتھ۔ میری مردانگی کا مذاق اُڑائیں سرِعام۔ نہیں میں نہیں ہونے دوں گا"۔ آپ پلیز میرا یقین کریں میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گی۔ میں خلع کا کیس واپس لوں گی اور رخصت ہو کے آپ کے پاس آ جاؤں گی"۔ وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

"مجھے آپ کا آپ کے تایا کا اعتبار نہیں ہے ہاں آپ اگر اسٹامپ پیپر پہ مجھے یہ لکھ دیں تو میں سوچ سکتا ہوں آپ کی واپسی کا۔ ورنہ نہیں۔ آپ میرے پاس ہی رہیں گی"۔ "میں لکھ کے دینے کے لیے تیار ہوں جو آپ کہہ رہے ہیں بس مجھے چھوڑ آئیں"۔ لجاجت کوٹ کوٹ کے بھری تھی اس سے اُس کے لہجے میں"۔ "خیر کل اسٹامپ پیپر مل جائے گا۔ سائن کر دیجیے گا اپنے مزید اضافے کے ساتھ کہ اگر آپ کے تایا یا خاندان کا کوئی فرد آپ کے نکاح اور رخصتی کی راہ میں حائل ہوا تو آپ کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لائیں گی اور میرا یعنی اپنے شوہر کا ساتھ دیں گی"۔ مجھے منظور ہے ہر بات۔ وہ جلدی سے یوں بولی جیسے اشعر اپنا ارادہ بدل دے گا۔ "آہم آہم خاص فرمانبردار قسم کی بیوی ہیں آپ۔ کل بتاؤں گا اتنی جلدی نہ کریں۔ سوچ لیں۔ میں کچھ بھی منظوری کے لیے دے سکتا ہوں"۔ اشعر کے لبوں پہ معنی خیز

مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

دریکتا اس مسکراہٹ کو کوئی نام نہ دے پائی۔

"اب آپ مطمئن ہیں تو کھانا کھا لیں۔ کل واپس چھوڑ آؤں گا آپ کو۔"

"سچ" اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کیا واقعی وہ اُسے کل چھوڑ آئے گا۔ یعنی وہ پھر سے اپنوں کے پاس ہوئی۔ یہ تصور ہی کتنا سرور آگئیں تھا۔ اُس کی بھوک مارے خوشی کے اُڑ گئی پھر بھی اُس نے اشعر کی وجہ سے کھانا کھایا۔ عجیب سا آدمی تھا کہیں اپنا ارادہ بدل ہی نہ دیتا اگر وہ اُس کے کہنے پہ کھانا نہ کھاتی تو......"

اُس نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔

اشعر غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی خوشی میں اتنی مگن تھی کہ محسوس ہی نہ کر پائی۔ اشعر اُسی بیڈ پہ سو گیا۔ دریکتا بہت دیر بعد سوئی۔ کل کا دن اُس کے لیے خوشی لے کے آنے والا تھا۔

☆☆☆

دریکتا کے ہاتھ میں اسٹامپ پیپر تھا۔ اُس پہ لکھی تحریر اُسے حرف بہ حرف ازبر ہو گی تھی۔ اُس نے کتنی بار پڑھا تھا۔ "اچھی طرح سوچ کے سائن کیجیے گا بعد میں سوچنے کی گنجائش نہیں ہو گی آپ کے پاس"۔ وہ پیچھے سے جھک کے بولا۔ دریکتا کرسی پہ بیٹھی تھی۔ اشعر عین اُس کے پیچھے کھڑا تھا۔ "میں نے سوچ لیا ہے۔ پین دیں میں سائن کر دوں"۔ وہ دانستہ طور پر اور بھی آگے کی طرف ہو گئی۔ اشعر نے اُسی پوزیشن میں پین جیب سے نکال کے اُس کے ہاتھ میں دیا۔ دریکتا نے لرزتے ہاتھوں سے پین کو اچھی طرح دبا کے سائن کر دیئے۔ اشعر اُس کے کندھوں پہ جھکا ہوا اُس کے ہاتھوں کی حرکت کو بغور دیکھ رہا تھا۔

دریکتا نے دونوں کاغذوں پہ سائن کر دیئے۔ اشعر پیچھے سے اُس کے سامنے آ گیا ایک اسٹامپ پیپر اُس نے اپنے پاس جیب میں ڈال لیا اور نقل دریکتا کی طرف بڑھائی۔ "یہ آپ رکھ لیں۔ اپنے تایا جان کو دکھا دیجیے گا اصل میرے پاس رہے گی"۔ اُس نے لے کر رکھ لیا اور کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اشعر اُس کے سامنے کھڑا تھا اُسے بغور تکتا۔ اُس نے اچانک دریکتا کو بانہوں میں بھر لیا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایک ہلکی سی چیخ اُس کے لبوں سے نکلی۔ "نہیں" اشعر نے اُس کے ہونٹوں پہ اُنگلی رکھ دی۔ "میں نے سائن کرنے سے پہلے پوری طرح سوچنے کا موقعہ دیا تھا۔ آپ نے کہا تھا مجھے سب منظور ہے تو اب یہ احتجاج کیسا"۔ اُس نے اپنے اور دریکتا کے درمیان موجودہ فاصلے کو کچھ اور بھی کم کر دیا۔ "نہیں نہیں" دریکتا نے اُسے خود سے دور کرنا چاہا۔ "یہ ضروری ہے تاکہ آپ کو اپنا وعدہ یاد رہے"۔ "مجھے یاد رہے گا سب کچھ"۔ دریکتا کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔ "اوکے پھر ٹھیک ہے اگر یاد رہے تو............" اشعر کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی ہو گی۔ وہ تڑپ کے دور ہوئی اور اپنی اُتھل پتھل ہوتی سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

اشعر نے پھر کوئی مزید بات نہیں کی اور گاڑی کی چابی اُٹھائی۔ دریکتا بہت تیزی سے سائیڈ پہ ہوئی۔ اس حد درجہ احتیاط پہ اشعر مسکرا دیا۔ "اتنا بُرا ہوں میں"۔ وہ مصنوعی تاسف سے خود کو دیکھتے ہوئے بولا۔

دریکتا نے جان بوجھ کے دروازے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

"چلیں آئیں میں گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوں"۔ اس بار اُس کے قدموں میں بجلی کی سی تیزی تھی۔ دریکتا ساتھ ساتھ تھی اُس کے۔

واپسی کا سفر شروع تھا۔

اشعر اُس کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

حویلی کے گیٹ پہ متعین چوکیدار کو اجازت نہیں تھی کہ وہ کسی اجنبی شخص کے لیے گیٹ کھولے اور اُسے گھر کے اندر آنے دے۔ پر گاڑی میں دریکتا کے ساتھ بیٹھے اُس نوجوان کی شخصیت ایسی تھی کہ چوکیدار کو بغیر کوئی سوال پوچھے گیٹ کھولنا پڑا۔

دریکتا جب تک رہائشی حصے تک پہنچی سب کو اُس کی آمد کا پتہ چل چکا تھا۔

فوزیہ، فرح، شریں، مائرہ، سائرہ اورنگزیب نوید سب ہی تو موجود تھے۔ دریکتا گھبرا سی گئی۔

اشعر اُس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں آیا۔ پہلی بار دریکتا کو اُس کی موجودگی سے ڈھارس ملی۔ ورنہ سب کتنی عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ گھر سے بھاگ کے اشعر کے ساتھ گئی ہو۔

''تمہیں تو میں دیکھ لوں گا''۔ اورنگزیب اشعر کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

شریں نے ہاتھ دبا کے اشارہ کیا کہ بات نہ بڑھائیں جب وہ دریکتا کو خود یہاں لے آیا ہے تو۔ اشعر کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد اُٹھ کھڑا ہوا۔ کیونکہ کسی کے رویئے میں گرمجوشی نہیں تھی۔ وہ کسی گرمجوشی کی توقع کر بھی نہیں رہا تھا۔

''او کے انکل انشا اللہ بہت جلد ملاقات ہوگی۔ پپا آپ کے پاس آئیں گے شادی کی تاریخ لینے۔ تب تک میری بیوی میری امانت کی صورت میں آپ کے پاس رہے گی''۔ اُس نے اورنگزیب سے زبردستی ہاتھ ملایا۔

وہ ہکا بکا اُس کے الفاظ پہ غور کر رہے تھے۔ وہ کیا کہہ گیا تھا۔ اورنگزیب تو سمجھ رہے تھے کہ اُس نے ہار مان لی ہے تب ہی دریکتا کو خود یہاں چھوڑ کے گیا ہے۔

☆☆☆

دریکتا کو سب گھیرے بیٹھے تھے۔ شریں کو عجیب سی کھد بھد لگی ہوئی تھی۔ دریکتا کے جسم پہ وہی کپڑے تھے جو اغوا والے دن اُس نے پہنے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے جنہیں ہاتھ مار کر اُس نے پیچھے کر کے سنوارنے کا فریضہ انجام دیا تھا۔ حالانکہ اشعر اُس کے لیے کپڑے لے کے آیا تھا اُس نے دریکتا سے کہا بھی تھا ان میں سے کوئی پہن لیں۔

ہر خوشی میں اُسے اپنے ناگفتہ بہ حلیے کی فکر ہی نہیں رہی تھی۔ اشعر کے ساتھ آتے وقت اُس نے پورے جسم اور سر کے گرد اچھی طرح چادر لپیٹ لی تھی جس نے اُس کی ہیبت کذائی کو چھپا لیا تھا۔

مگر گھر کی عورتوں کی نظروں سے کچھ بھی چھپ نہیں سکتا تھا۔

وہ دو راتیں اور تین دن اُس کے پاس گزار کے آئی تھی۔ اشعر نوجوان صحت مند اور جوانی کی اُمنگوں سے بھرا ہوا تھا۔ دریکتا کے ساتھ اُس کا نکاح ہو چکا تھا۔ ان دو راتوں اور تین دنوں میں کیا کچھ ہوا ہوگا۔ اُن میں سے کسی کے لیے بھی یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں تھا۔

شریں تائی سائرہ کو پرے کرتی اُس کے قریب آ بیٹھی۔ ''دریکتا اشعر نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں''۔ شریں اپنی طرف سے خاصی آہستہ آواز میں کہا تھا۔ پر وہاں موجود فوزیہ اور فرح نے بھی سن لیا۔ ''جی تائی دھمکیاں دی تھی۔ وہ سادگی سے بولی۔ ''ارے نہیں میرا مطلب ہے اُس نے کچھ ایسا ویسا تو نہیں کیا ناں''۔

شریں نے ''کچھ ایسا ویسا'' اس انداز میں کہا کہ شرم سے وہ کٹ کے رہ گئی۔ بچی تو نہیں تھی جو پس پردہ مفہوم کو نہ سمجھ پاتی۔

یہ اُڑے اُڑے سے گیسو یہ جھکی جھکی سی پلکیں
تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ......

سائرہ کو اس حال میں مذاق سوجھ رہا تھا۔ شریں نے اُسے گھور کے دیکھا پر وہ ڈھٹائی سے مسکرانے لگی۔

اب شریں سر پکڑ کے بیٹھی تھی۔ ''اُف اب کیا ہوگا''۔ اُسے سارا کھیل ہاتھ سے نکلتا نظر آ رہا تھا۔ تائی اشعر نے اس کاغذ پہ مجھ سے سائن کروائے تھے۔ رہی سہی کسر دریکتا نے وہ اسٹامپ پیپر اُنہیں دکھا کے پوری کر دی۔

''اُف دریکتا تم نے کیا کر دیا۔ یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی''۔ شریں نے اُسے تاسف سے دیکھا۔ ''تائی اُس کے بغیر میرا وہاں سے آنا ناممکن تھا۔ تب میں نے سائن کیے''۔

''میں تمہارے تایا کو دکھاتی ہوں۔ اب تو کیس بھی واپس لینا پڑے گا۔ تمہاری بے وقوفی نے یہ دن دکھائے ہیں۔ ہم جیتی بازی ہار گئے ہیں''۔ شریں کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔

''ویسے یہ اشعر لغاری اور اُس کی فیملی اس طرح کی لگتی تو نہیں ہے جس طرح اورنگزیب بھائی بتاتے ہیں''۔

فوزیہ پُر خیال انداز میں شریں کے وہاں سے جانے کے بعد بولی تو فرح نے بھی تائید کی۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ عمر بھائی نے کچھ سوچ کر ہی وہاں بیٹی دی ہے۔ اب کس قدر بدنامی ہوئی ہے پورے خاندان کی ایک غلط فیصلے کی وجہ سے۔ اشعر بے شک شوہر ہے دریکتا کا اگر اُسے ساتھ لے گیا ہے تو۔ پر اس طریقے سے یہ قابل تعریف نہیں ہے۔ اب دریکتا کے بارے میں جو باتیں ہو رہی ہیں۔ میری بیٹی کے بارے میں کوئی کرتا تو میں مارے شرم کے کسی کا سامنا تک نہ کر سکتی۔ ہارون بتا رہے تھے اورنگزیب بھائی نے عدالت میں کیس دائر کرنے سے پہلے اشعر کو بڑی دھمکیاں دیں کہ تم دریکتا کو طلاق دے دو۔ ایسی دھمکیاں بھلا کوئی مرد سن سکتا ہے۔ تب ہی اشعر نے یہ سب کیا۔ اُسے شک تھا کہ ہم لوگ پھر بھی مکر سکتے ہیں تب اُس نے اسٹامپ پیپر پہ یہ سب لکھوایا۔ سوچو تو کتنے شرم کی بات ہے یہ ہمارے خاندان کے لیے''۔

فرح اور فوزیہ آہستہ آہستہ آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے دریکتا سے شریں کی طرح پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔

ہر نوجوان نسل کے لیے یہ اپنی نوعیت کا اچھوتا واقعہ تھا وہ اب دریکتا سے طرح طرح کے سوال کر رہی تھی ان میں سائرہ پیش پیش تھی۔

''ویسے ایک بات ہے تمہارا ہزبینڈ ہے بہت بولڈ ورنہ روڈ سے تمہیں اس طرح اُٹھا کے اپنے ساتھ نہ لے جاتا''۔ وہ بہت مزے سے بولی تھی۔ دریکتا اُلجھن محسوس کر رہی تھی۔

''وہاں جا کے اُس نے تمہیں کیا کہا''۔ دریکتا کی ایک دوسری کزن بولی تو توہین کی شدت سے اُس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

اشعر تو اُسے چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ سوالوں کے نئے باب اُس کے لیے کھل گئے تھے۔

''ویسے اغوا ہونے کا بھی اپنا ہی مزا ہے۔ اگر اغوا کرنے والا اشعر لغاری کی طرح ہو تو میں سو بار اغوا ہونا پسند کروں۔ تمہاری طرح منہ لٹکا کے نہ بیٹھوں''۔

"شکر ہے اشعر لغاری دریکتا کا شوہر ہے ورنہ تم ساری زندگی اغوا ہی ہوتی رہتی"۔ سائرہ کی بات پہ اُن کی ایک اور کزن بولی تو زور کا قہقہہ پڑا۔

"کاش یار ایسا ہوتا......" سائرہ کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔ "یعنی تم اغوا ہوتی رہتی"۔ وہی کزن حیرت سے بولی۔ "ہاں کیونکہ اشعر لغاری بالکل میرے آئیڈیل کی طرح ہے"۔ وہ یہ بات کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں شرمائی کہ دریکتا پاس ہے۔

"ہاں یہ تو ہے دریکتا کا ہزبینڈ بہت زبردست ہے"۔ دوسری کزن نے بھی تائید کی۔ اُن کی باتوں سے دریکتا کے سر میں درد ہونا شروع ہو گیا تھا۔

وہ پچھلے دو گھنٹے سے اشعر لغاری کو ہی موضوع گفتگو بنائے ہوئے تھیں۔

مزیدار اور چٹ پٹا قصہ ہاتھ آیا تھا خاص طور پہ سائرہ اتنی آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھی۔

شریں نے وہ اسٹامپ پیپر کی نقل اورنگزیب کو دکھا دی تھی اُن کے خوابوں کا تاج محل پوری قوت سے زمین بوس ہوا تھا۔ سب کچھ چکنا چور ہو گیا تھا۔

اشعر لغاری نے اُنہیں شرم ناک شکست دی تھی۔

اب وہ ناں بھی نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆

دریکتا لیٹی ہوئی تھی۔ وہ ذہنی طور پہ بُری طرح تھک گئی تھی۔ سب کے سوالوں کا سامنا اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ اشعر نے جو کرنا تھا کر لیا تھا اَنا اور مردانگی کی جنگ میں فتح یاب ہوا تھا۔ پر اُسے جو شرمندگی اور توہین کا احساس ہو رہا تھا آنے والی جس بدنامی کا سامنا کرنا تھا وہ اُس کے لیے بہت مشکل تھی۔

گھر میں جب اتنی باتیں ہو رہی تھیں تو کیا گھر سے باہر کے لوگوں نے نہیں کی ہوگی۔ اورنگزیب تایا اپنی غلطی مان ہی نہیں رہے تھے۔ سارا قصور اشعر لغاری کے سر تھوپ رہے تھے۔

شریں کو زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اشعر لغاری دریکتا سے اپنا حق وصول کر چکا تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ نہ مارے شرم کے دریکتا اس کی وضاحت کر پائی تھی۔

اب رخصتی کرنا ضروری تھی۔

اُن کے پاس انکار کا کوئی جواب ہی نہیں رہا تھا۔

اُدھر سے عاشر نے بھی کہا تھا۔ دریکتا اغوا کے بعد واپس آئے یا اشعر اُسے طلاق دے دے وہ اب اُس سے شادی نہیں کرے گا۔ اُس کے ذہن میں بھی مخصوص مشرقی سوچ تھی کہ بیوی اَن چھوئی اور کنواری ہو۔

ابو نے جب اپنا منصوبہ اُس کے سامنے رکھا تو وہ خوشی خوشی راضی ہو گیا کیونکہ دریکتا خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بے پناہ جائیداد کی بھی مالک تھی۔

پر اب اُسے دریکتا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس کی خوبصورتی سے بالکل بھی نہیں کیونکہ اشعر اپنے سارے حق استعمال کر چکا تھا۔ شریں کی طرح اُس کی سوچ بھی یہی تھی۔

☆☆☆

زینب طیب کو اُس کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ اُس نے سوئے ہوئے طیب کی طرف کروٹ لی۔ کتنا معصوم اور دنیا کے غموں سے ناآشنا تھا وہ۔ کاش وہ بھی طیب جتنی ہی رہتی کبھی بڑی نہ ہوتی تو کتنا اچھا تھا۔ اُس کی سوچ ناممکن سی تھی۔

سوچ سوچ کے دریکتا کا سر درد کر رہا تھا۔

شریں تائی کی بات اُسے پھر یاد آئی تو اکیلے میں بھی وہ شرما گئی۔

اشعر کے پاس وہ دو رات رہی تھی۔ وہ مزے سے سو گیا تھا۔ اُس کے پاؤں میں چوٹ لگی تھی اس لیے وہ درد کی وجہ سے جاگ رہی تھی۔ کچھ اُس کی طرف سے خوف بھی تھا مگر اس کا خوف بے بنیاد تھا۔

پر آج جب دریکتا نے اسٹامپ پیپر پہ سائن کیے۔ اُس کے بعد جو ہوا وہ اُس کے لیے ناقابل فراموش تھا۔ اشعر کی جراٴت اور بیباکی بھولنے والی تو نہیں تھی۔ اُس کے حلق میں جیسے کانٹے پڑ گئے تھے۔ پانی کا گلاس لبوں سے لگایا اور ایک سانس میں پی گئی اس وقت تنہائی تھی وہ آرام سے ہر چیز پہ غور کر سکتی تھی۔

صبح کے واقعے کی جزئیات تک اُسے یاد تھیں۔ یاد کرتے ہی اُس کے ماتھے پہ پسینہ آ گیا۔ ساتھ مائرہ کا تبصرہ بھی کہ دریکتا کا ہزبینڈ بہت بولڈ ہے۔

اُس کی نیند ہی آج پلکوں سے روٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری تاسف سے اُسے دیکھ رہے تھے وہ سب کچھ بتا چکا تھا۔ "اشعر تم نے یہ سب کیوں کیا کم سے کم مجھے بتاتے تو......میں تمہیں ایسا کبھی نہ کرنے دیتا"۔ "پپا اب جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ وہ لوگ اب رخصتی سے انکار نہیں کریں گے"۔ "اشعر میں پہلے ہی خاندان والوں رشتہ داروں کی باتوں سے ڈر رہا تھا کہ اشعر کی منکوحہ نے اُسے عدالت میں گھسیٹ لیا ہے۔ میں بدنامی کو فیس نہیں کر سکتا"۔ "پپا کیسی بدنامی میں کسی اور کو نہیں اپنی بیوی کو لے گیا تھا۔ اس میں کوئی بات کرتا ہے تو کرے میں پروا نہیں کرتا۔ پپا دریکتا کے تایا چچا اور خود دریکتا تک نامناسب رویئے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مجھے دھمکیاں دی جا رہی تھی۔ خلع کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ جیسے میں کوئی زرخرید ملازم ہوں اُن لوگوں کا۔ تو بس دماغ گھوم گیا میرا۔"

"پپا میں اپنی عزت نفس اور اَنا پہ چوٹ برداشت نہیں کر سکتا۔ کسی صورت بھی نہیں۔ دریکتا کے تایا کی اکڑفوں نکل گئی ہے اور دریکتا کی بھی"۔ "آخری تین لفظ اُس نے دل میں کہے"۔ "اب میں نے پکا کام کر دیا ہے۔ رخصتی سے انکار نہیں ہوگا"۔ "دل ہی دل میں وہ مسکرا رہا تھا"۔ "چلو یہ تو اچھی بات ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ میں دریکتا کو جلدی رخصت کروا کے لے آؤں"۔ وہ طاہر لغاری پُرسوچ انداز میں بولے۔

"ہاں پپا ٹھیک ہے"۔ اشعر نے بھی تائید کی۔

دریکتا کو وہ چھوڑنے گیا تو اُس کے تایا کے رویئے میں پہلے جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اکڑ وہ غرور کچھ بھی تو نہیں تھا۔

اشعر جیت چکا تھا۔ جو چیز اُس کی اَنا اور غیرت کے لیے چیلنج بنی ہوئی تھی۔ وہی اُس کی فتح بن گئی تھی۔

دریکتا کا ڈرا ڈرا خوفزدہ انداز گریزپا رویہ یاد آتے ہی اشعر کے لبوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔ کہاں تو شیرنی ہوئی تھی اور کہاں اُس کے سامنے آ کے بھیگی بلی بن گئی تھی۔ فارم ہاؤس میں اُس نے خود سے اشعر سے کم ہی بات کی تھی۔ اُس کا

سارا زور رونے کی طرف تھا یا پھر ڈرنے کی طرف۔ اُس کی آنکھوں اور رویے میں ڈر تھا۔ جیسے اشعر کوئی ڈریکولا یا پھر خوفناک انگریزی فلموں کا کوئی کردار ہو۔ جو موقعہ ملتے ہی اُسے چیر پھاڑ کے کھا جائے گا۔

پتہ نہیں وہ اتنا خوفزدہ کیوں تھی اُس سے۔ اشعر کو اُس سے یہ بات پوچھنی یاد ہی نہیں رہی تھی۔ جب وہ یہاں آجاتی رخصت ہو کے تو تب اُس نے لازمی پوچھنا تھا۔ کہ محترمہ آپ مجھ سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہیں۔ جب وہ اُسے پہلی بار زبردستی ساتھ لے کے جا رہا تھا تب وہ گاڑی میں خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھی۔

پتہ نہیں اُسے کیا کیا کہا گیا تھا جو وہ اتنا کبیدہ خاطرہ تھی اُس سے۔

☆☆☆

شریں مائرہ کو چھوڑنے جا رہی تھی۔ دریکتا کی وجہ سے وہ اس مسئلے پہ دھیان نہیں دے پائی تھی۔ اب فرصت تھی۔ اُس نے حمزہ احمد سے خود بات کرنی تھی۔ باسط ایک ذرا سی بات پہ مائرہ سے اس طرح ناراض ہو گیا تھا۔ اس انتہا تک جانا اچھا نہیں تھا۔ شریں کے دل میں تلخی آ گئی تھی۔

بینا اُن دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ مائرہ کافی دن بعد واپس آئی تھی۔ بینا بڑی محبت سے ملی تھی۔ شریں اکھڑی اکھڑی تھی بینا فوراً بھانپ گئی کہ کوئی بات ہے۔ اُنہیں کھانا کھلا کے وہ اپنے بیڈ روم میں ہی لے آئی اور پھر بات کا آغاز کیا۔ ''آپا کیا بات ہے آپ کچھ ناراض ناراض سی لگ رہی ہیں''۔ ''ہاں میں ناراض ہوں۔ بات ہی ایسی ہے میں حمزہ بھائی کے سامنے بات کروں گی تم سے''۔ شریں اُسی موڈ میں تھی۔ بینا پریشان ہو گئی کہ یقیناً کوئی خاص بات ہے جو آپا حمزہ کے سامنے بات کرنا چاہ رہی ہیں اُس نے پھر نہیں پوچھا۔

حمزہ گھر آئے تو شریں نے پھر اُنہیں ساری بات بڑھا چڑھا کے بتائی۔

☆☆☆

جہاز کے لینڈ کرنے میں تھوڑا ہی ٹائم تھا۔ باسط فضا کی بلندی سے نیچے آنے والی عمارتوں کو دیکھ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ چیزوں کا حجم بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ اور سب کچھ واضح ہو رہا تھا۔ درخت، عمارتیں، روڈ، سڑک پہ بھاگتی دوڑتی گاڑیاں قریب اور قریب سے نظر آ رہی تھیں۔ جہاز کا زمین سے فاصل کم ہوتا جا رہا تھا۔

باسط کو پاکستان میں ایک آدمی سے ملنا تھا۔ اُس کا اچانک پروگرام بنا تھا۔ اُس نے سرپرائز دینے کے چکر میں گھر میں کسی کو بھی اپنے آنے کا نہیں بتایا تھا۔

☆☆☆

ایئر پورٹ سے باہر آ کر اُس نے ٹیکسی والے کو اشارے سے روکا اور بیٹھ گیا۔ گھر کے سامنے اُترا تو چھوٹا گیٹ کھلا ہوا تھا۔

وہ لان سے گزر کر اندر آیا۔ کوئی ذی نفس بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اُس نے سوچا سب آرام کر رہے ہوں گے۔ دبے پاؤں اپنے بیڈ روم کی طرف آیا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم سے ہلکی ہلکی باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ''اچھا تو سب وہاں ہیں''۔ اُس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آ گئی یہ سوچتے ہوئے کہ سب اُسے دیکھ کے کتنا خوش ہوں گے۔

وہ آرام آرام سے آہستگی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف آنے لگا۔ دروازہ ہلکا سا نیم وا تھا۔ اب آنے والی آوازیں واضح تھیں اور قابل شناخت بھی۔

''حمزہ بھائی کبھی بینا نے آپ کو شکایت کا موقعہ دیا۔ اس نے ساری زندگی کبھی آپ کو یا باسط کو احساس دلایا کہ وہ باسط کی سگی ماں نہیں ہے۔ میری بہن کا دل اور ظرف بہت بڑا ہے۔ اور باسط نے صرف اس بات پہ کہ مائرہ طیب کو ڈاکٹر کے پاس کیوں لے گئی ناراض ہو گیا۔ اس حد تک کہ کوئی لحاظ بھی نہیں کیا صاف کہہ دیا کہ اب اپنی ماں کے گھر ہی رہو۔ اتنی بڑی بات تو نہیں تھی۔ کاش بینا کا ظرف اور حوصلہ باسط میں بھی آ جاتا۔ آخر کو اس کی گود میں پلا پڑا ہے۔ کچھ تو اثر ہوتا ناں کہ بینا نے اس کی پرورش کی ہے''۔

شریں خالہ کی آواز ایک ایک لفظ، سماعتوں میں زہر بن کے اُتر رہا تھا۔

پر خود کو سنبھالنا ضروری تھا۔ جو کچھ وہ سن چکا تھا۔ اسے زیادہ سننا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اُس نے فوری طور پہ کچھ سوچا اور قدم موڑ لیے۔ وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر یہاں سے لوٹنا چاہتا تھا۔

جونہی وہ گیٹ سے باہر نکلا۔ اُس کی نظر دائیں طرف سے آتی میرون کلر کی کرولا پہ پڑی۔ یہ ایاز تھا۔ اُس کی نظر ابھی تک باسط پہ نہیں پڑی تھی۔ پر گاڑی قریب آ گئی تھی۔ باسط گیٹ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا جیسے ابھی ابھی پہنچا ہو۔

وہ یہ تاثر دینے میں پوری طرح کامیاب رہا تھا۔ ایاز چھلانگ مار کے نیچے اُترا اور اُس کے گلے لگ گیا۔ ''بھائی آپ کب آئے اور اس طرح۔ بتایا بھی نہیں''۔ ''بس سوچا تم سب کو سرپرائز دوں اس وجہ نہیں بتایا۔ اُس نے تیزی سے خود کو سنبھالا۔ پر نہ جانے کیوں آج ایاز سے ملتے ہوئے اُس کے رویئے میں سرد مہری سی تھی۔ ایاز نے اپنی خوشی میں اس بات کو محسوس ہی نہیں کیا۔

وہ گیٹ سے اندر بھاگ گیا۔ باسط دوبار جب گھر میں داخل ہوا تو سب اُس کے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔ شریں خالہ، مائرہ، حمزہ، احمد، بینا اُس کے چھوٹے بہن بھائی۔ سب ہی تو تھے۔ اُسے چمکتی محبت بھری نگاہوں سے تکتے۔ بینا حسب معمول اُس کا ماتھا چوم کے سینے سے لگا کے ملی۔ پر آج باسط بجھا بجھا تھا۔ شریں جو کچھ دیر پہلے حمزہ اور بینا کے سامنے گرج برس رہی تھی اس وقت صدقے واری ہوئی جا رہی تھی۔ کتنا تضاد تھا اُن کے رویئے اور سوچ میں۔

مائرہ البتہ کچھ ڈری ڈری سی لگ رہی تھی کہ جانے باسط اُسے کیا کہے۔ تنہائی ملتے ہی وہ اُس کے قریب آ گئی۔ باسط کے بازو اُس کی سمت نہیں بڑھے وہ خود اُس کی بانہوں میں سما گئی۔

''باسط آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ بس آخری غلطی تھی معاف کر دو۔ اب میں طیب کی طرف پلٹ کے دیکھوں گی بھی نہیں''۔ وہ اُس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ جواب میں باسط نے اُسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔ شریں خالہ کی کہی باتیں کانوں میں گونجنے لگی۔ ایک دم اندر کوئی آگ سی بھڑکنے لگی تھی۔ اُس نے مائرہ کو بازوؤں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اور خود سگریٹ سلگا لیا۔ خوب گہرے گہرے کش لیے کہ شاید سکون مل جائے۔ پر کہاں اُس کے من میں دور دور تک بے چینی اور بے سکونی پھیلی ہوئی تھی۔

کتنے کڑوے سچ کا سامنا کرنا پڑا تھا آج۔ سچ کڑوا اور جان لیوا تھا۔

بینا اُس کی سگی ماں نہیں تھی پر آج تک کبھی بھی اُن کے رویے سے یہ بات ظاہر یا محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایاز سے بھی زیادہ اُس کا خیال رکھتی تھی۔

آج تک اُس سے یہ بات چھپائی گئی تھی جانے کیا مصلحت تھی اس میں۔ کاش یہ بات چھپی ہی رہتی یا پھر اُسے بہت پہلے بتادی جاتی۔ وہ ریزہ ریزہ ہو کے ایسے بکھرتا تو ناں۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا بکھر رہا تھا۔ کوئی سمیٹنے والا تک نہ تھا۔ اُسے خود کو خود ہی جوڑنا تھا۔

کاش وہ گھر نہ آتا۔ یا اپنے آنے کی اطلاع کروا دیتا۔ کاش وہ شریں خالہ کے منہ سے اتنے کڑوے اور زہریلے انداز میں اس سچ کو نہ سنتا۔ کاش ابو اُسے خود بتاتے یا پھر امی اُسے پاس بٹھا کے آرام سے بتا دیتی کہ میں تمہاری اصلی ماں نہیں ہوں۔ پھر شاید اُسے اتنا دکھ نہ ہوتا اُسے کرب سے نہ گزرنا پڑتا۔ کاش کاش یہ سب نہ ہوتا۔ کاش اُسے پتہ نہ چلتا۔

☆☆☆

سورج کی کرنیں کمرے میں جھانک رہی تھیں۔ مائرہ کی آنکھ کھل گی۔ اور سب سے پہلے اُس نے اپنی دائیں سائیڈ پہ دیکھا۔ باسط کا تکیہ خالی تھا۔ اُس کے جوتے، ریسٹ واچ اور موبائل فون بھی سامنے ٹیبل پہ موجود نہیں تھا۔ وہ واش روم میں بھی نہیں تھا۔

مائرہ باہر آئی کہ شاید وہ بینا خالہ کے پاس ہو۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ اُلٹا اُسے پوچھنے لگی کہ باسط ابھی تک سو رہا ہے۔ مائرہ اُسے ڈھونڈنے باہر آئی تھی اور وہ اُسی سے پوچھ رہی تھی۔

وہ پورے گھر میں نہیں تھا۔

چوکیدار سے معلوم ہوا کہ چھوٹے صاحب رات تین بجے گھر سے نکلے تھے۔ بغیر گاڑی کے۔

''وہ کہہ رہے تھے کہ میں ائیر پورٹ تک ٹیکسی لے لوں گا''۔ چوکیدار بتا رہا تھا۔

بینا کو ڈر لگ رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں خود ہی یہ بات آئی تھی کہ باسط کو پتہ چل گیا ہے وہ اُس کی ماں نہیں ہے۔ اُس نے سن لیا ہے۔ تب ہی یہاں سے بغیر بتائے اس طرح گیا ہے۔ باسط نے وہاں جا کے کال کی تو اُس کی جان میں جان آئی۔ ''امی ایک ضروری کام تھا اس لیے جلدی میں آنا پڑا مجھے۔ سب سو رہے تھے میں نے سوچا کیا جگاؤں اس لیے اکیلا ہی آیا ائیر پورٹ تک''۔ وہ نارمل طریقے سے بول رہا تھا۔ بینا نے رُکی رُکی سی سانس خارج کی۔ اب دل کو کہیں سکون ملا تھا اور ایک بوجھ اُترا تھا۔

پر مائرہ باسط سے ناراض تھی۔

☆☆☆

باسط کبھی زندگی بھر نہیں رویا تھا۔ پر ائیر پورٹ سے اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچتے ہی وہ اپنے بستر پہ ایسے گرا جیسے میلوں دور سے پیدل چل کے آیا ہو۔ جن آنکھوں میں مائرہ کے نام سے دیئے جلتے تھے وہ آنکھیں اب بھیگ رہی تھیں۔ دوبئی آ کے کالے دھندے سے وابستہ ہونے کے بعد اُس کا دل سخت ہو گیا تھا۔ پر آج احساس ہوا کہ دل سینے میں ہے اور قطرہ قطرہ پگھل رہا ہے۔ موم کی طرح۔

اُسے بے پناہ گھٹن کا احساس ہو رہا تھا کوئی چیز نس نس تک کو کاٹ رہی تھی۔ چھید رہی تھی۔ باسط نے شرٹ اور اُس کے نیچے پہنی ہوئی بنیان بھی اُتار کے پھینک دی۔ پھر شاور کھول کے کھڑا ہو گیا۔ پر اندر آگ ہی آگ بھڑک رہی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو دھیرے سے چھوا۔ وہ بھیگ رہی تھیں۔ اُس نے سر کے بال دونوں مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

''نہیں نہیں''، وہ زور زور سے چیخنے لگا اور اپنا سر پوری قوت سے بیڈ کی پٹی سے ٹکرایا۔ شاید اس جنون کو سکون مل جائے۔ سکون ہوتا تو ملتا اُسے۔ باسط کا سر پھٹ گیا تھا۔ وہ پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔

وہ ایک پر تعیش اور مہنگے اپارٹمنٹ میں تھا کسی نے اُس کی چیخوں پہ دھیان نہیں دیا۔ وہ خود ہی بے حال ہو کے خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

نوید نے اورنگزیب کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا تھا کہ عمر کو چیک اپ کے لیے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جایا جائے۔

خلاف توقع وہ مان گیا تھا۔ نوید کو اپنے دماغ سے ایک بوجھ اُترتا محسوس ہوا۔ وہ عمر کو دیکھ کے احساس جرم کا شکار ہو جاتے۔ اُن تینوں بھائیوں میں سے کسی نے سنجیدگی سے اُس کے علاج پہ توجہ نہیں دی تھی۔ ہاں شاہ زیب کی موت کے بعد شروع میں طاہر لغاری اُسے یعنی عمر زیب کو خود ہی ڈاکٹر کے پاس لے جاتے رہے۔ اُن کے بھائیوں کو یہ بات پسند نہیں آئی۔

اورنگزیب کو اپنی لالچ پڑ گئی تھی۔ مائرہ کو عمر زیب کی بہو بنانے کے بعد اُسے عمر زیب کی اصل جائیداد کا علم ہوا۔ شاہ زیب کی حادثاتی موت نے عمر زیب کا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ اورنگزیب کا کہنا تھا کہ عمر اسی طرح رہے تو ٹھیک ہے۔ جب وہ تندرست ہو گا تو شاہ زیب کا صدمہ اُسے مار ڈالے گا۔

اُس نے نوید اور ہارون کو بھی قائل کر لیا تھا۔ اس کے بعد عمر کی ذہنی حالت خراب سے خراب ہوتی چلی گئی۔

ہر کسی کی اپنی دنیا تھی کسی کو احساس نہیں تھا۔ اورنگزیب ماحول کی تبدیلی کے بہانے عمر کو گاؤں لے آئے تھے تب سے وہ اور دریکتا اِدھر ہی تھے۔ دریکتا بیٹی ہونے کے ناطے۔ باپ کے لیے کڑھتی، پریشان ہوتی۔ عمر اب جارحیت پہ اُتر آیا تھا جس کو دیکھتا مارنے کے لیے دوڑتا۔ نوید کے دل میں قدرت کی طرف سے ہی یہ خیال آیا تھا کہ اُسے عمر کا بھائی ہونے کے ناطے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

اسجد بھی گاؤں آیا ہوا تھا۔ نوید اُسی کے ساتھ عمر کو لے کر شہر آئے۔ ڈاکٹر سے اُنہوں نے پہلے ہی ٹائم لے لیا تھا۔ اس لیے انتظار کی زحمت سے بچ گے۔

یہ تو ذہنی اور نفسیاتی امراض کا مشہور ہاسپٹل تھا۔ نوید کو پوری اُمید تھی کہ عمر یہاں سے ٹھیک ہو جائے گا۔

عمر کے مختلف قسم کے ٹیسٹ ہوئے۔ ڈاکٹرز کی ٹیم نے آپس میں مشورے کے بعد عمر کو ایڈمٹ کرنے کا مشورہ دیا۔ اُنہیں عمر کا کیس کافی دلچسپ اور قابل توجہ نظر آیا تھا۔

نوید نے ہاسپٹل میں ہی دریکتا کو کال کر کے بتایا۔ وہ بھی پپا کے مکمل علاج کروانے کے حق میں تھی۔ جب نوید آج عمر کو ساتھ لے کے آ رہے تھے تو دریکتا نے اُنہیں بھیگی بھیگی تشکرانہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ ان نگاہوں میں چمکتی نمی نے نوید کے ملال کو کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔

اُنہوں نے عمر زیب کو ہاسپٹل ایڈمٹ کروا دیا تھا۔ اُس کا علاج، طویل محنت طلب اور صبر آزما تھا۔ اُنہیں لمبا عرصہ اسی ہاسپٹل میں گزارنا تھا۔

بہر حال ایک اُمید کی کرن نظر آئی تھی جسے نوید نے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ عمر ایڈمٹ ہو چکا تھا اور ڈاکٹرز نے

علاج شروع کر دیا تھا۔

دریکتا کو اُمید تھی کہ پپا ٹھیک ہو جائیں گے۔ نوید نے اورنگزیب بھائی کو عمر کے علاج کی بابت بتایا۔ وہ غائب دماغی سے سر ہلاتا رہا۔ اُس نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی ہی پریشانیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اشعر والے مسئلے نے زچ کر کے رکھا ہوا تھا۔ اُنہیں کسی وقت بھی دریکتا کی رخصتی کے لیے تیاری مکمل رکھنی تھی۔ یعنی اُنہوں نے سارے فوائد سے ہاتھ دھو لیا تھا۔ دریکتا کی جائیداد پہ قبضے اور اختیار کا خواب اُدھورا رہ گیا تھا۔

جو کچھ شاہ زیب نے مائرہ اور اپنے بعد میں پیدا ہونے والے بچے کے لیے چھوڑا تھا۔ اُس میں سے کچھ نہیں بچا تھا۔

مائرہ اس گمان میں تھی کہ وہ شاہ زیب کے کاروبار کی مالک ہے۔ بے شک سب کچھ خسارے میں تھا پر مالک ہونے کا بھی اپنا نشہ تھا۔ اگر وہ اُن سے کاروبار کے بارے میں پوچھ لیتی تو وہ کیا جواب دیتے۔ عاشر نے اور اُنہوں نے جو فائدہ اُٹھانا تھا اُٹھا لیا تھا باقی کچھ بھی نہیں تھا۔ دریکتا کے اکاؤنٹ میں سے بھی اُنہوں نے تقریباً سب پیسے نکلوا لیے تھے۔ اُس نے تو شاہ زیب کے نام اور اُن کے بزنس کی خاطر اُن پہ اندھا اعتبار کیا تھا۔ وہ سب پیسہ اُن کی جیب میں گیا تھا۔ تھوڑا تھوڑا ہارون اور نوید کو دیا تھا لیکن زیادہ اُن کے پاس تھا۔ عمر زیب کے کاروبار کا اُنہوں نے بیڑا غرق کر کے رکھ دیا تھا۔ حالات تباہی کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ اب ہارون بھی اُن سے الگ ہو گیا تھا۔ اُسے آنے والی مشکلات کا اندازہ ہو گیا تھا۔

نوید بھائی عمر کو ہاسپٹل ایڈمٹ کروا آئے تھے۔ دوسری بار ہارون اُن کے ساتھ ہاسپٹل گئے اور عمر کے جگری دوست طاہر لغاری کو بھی بتا دیا۔

عمر کا علاج سست رفتاری سے ہو رہا تھا۔

وہ سب خاندان والوں کو دیکھ کر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ خاموش رہتا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

ڈاکٹرز عمر زیب کی حالت اور رویے کو تسلی بخش قرار دے رہے تھے۔

نوید نے دریکتا سے وعدہ کیا تھا کہ اگلی بار جب میں عمر کا پتہ کرنے جاؤں گا تو تمہیں ساتھ لے کے جاؤں گا۔

یہاں سے وہ خود بھی تین چار دن بعد ہاسپٹل کا چکر لگا لیتے۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے عمر کی دیکھ بھال کے لیے اپنے ایک ملازم کو ہاسپٹل میں چھوڑا ہوا تھا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ عمر کی بہترین دیکھ بھال ہو رہی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری عمر کے پاس بیٹھے تھے۔ عمر آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا۔ اشعر بھی طاہر کے ساتھ تھا۔ طاہر نے سب سے پہلے ڈاکٹرز سے مل کے عمر کے علاج کے بارے میں پوچھا تو اُنہیں کچھ تسلی ہوئی۔ اُنہیں ایک بات کا دکھ پھر بھی تھا کہ عمر کے بھائی اُنہیں بہت دیر کے بعد ہاسپٹل لائے۔ پھر بھی عمر کے علاج کی کامیابی کی پوری اُمید تھی۔

”میرے دوست میں گاؤں جا رہا ہوں تمہارے بھائی اورنگزیب سے دریکتا کی رخصتی کی تاریخ لینے۔ کاش تم خود ٹھیک ہوتے اور اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو رخصت کرتے۔“

طاہر عمر کے پاس بیٹھے اُسے یوں بتا رہے تھے جیسے وہ سن رہا ہو اور سمجھ رہا ہو۔ وہ تو سابقہ پوزیشن میں لیٹا ہوا تھا۔ طاہر کا بتانا نہ بتانا ایک برابر تھا۔

☆☆☆

طاہر اورنگزیب سے شادی کی تاریخ لینے آئے ہوئے تھے۔

اُنہوں نے کوئی چوں چرا کیے بغیر دس دن بعد کی تاریخ دے دی۔

دل میں پریشان بھی تھے کہ دریکتا کی شادی اپنے رتبے، خاندان اور عزت کے شایانِ شان کیسے ہو گی۔ طاہر لغاری نے تو کہا تھا کہ مجھے کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اشعر نے بھی سختی سے منع کیا تھا۔ پر وہ دریکتا کو ایسے ہی تو رخصت نہیں کر سکتے تھے۔ خاندان کی عزت اور آن بان کا خیال تھا۔

دریکتا تو یہی چاہتی تھی کہ شادی انتہائی سادگی سے ہو۔ بے شک کسی کو بھی مت بلایا جائے۔ اُسے سب کے سوالوں سے حیرت ہوتی تھی اور وہ ڈرتی بھی تھی۔ پپا ہاسپٹل میں تھے۔ وہ کسی قسم کی دھوم دھام کے حق میں بھی نہیں تھی۔

شریں نے بھی اورنگزیب کو یہی صلاح دی تھی کہ شادی سادگی سے ہو۔ چار دن وہ اشعر کے ساتھ گزار آئی تھی اب کیسی رخصتی اور کہاں کی دھوم دھام۔ وہ دریکتا کے بارے میں بڑے تنفر سے سوچ رہی تھی۔

وہ تو رخصت ہو کے چلی جاتی طیب کو کون سنبھالتا۔ مائرہ اپنے گھر تھی۔ باقی کوئی بھی طیب کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

طاہر اورنگزیب کے پاس سے اُٹھ کے دریکتا کے پاس آئے۔ وہ اُداس اور متفکر سی بیٹھی تھی۔ طاہر نے سلام کیا سر پہ ہاتھ پھیرا دعائیں دیں۔ وہ اپنے گزشتہ رویئے پہ شرمندہ تھی۔ اُن سے نگاہ ہی نہیں ملا پا رہی تھی۔ نہ اتنی ہمت ہو رہی تھی۔ طاہر انکل سے وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی پر ہچکچا رہی تھی۔

وہ بھانپ گئے کہ دریکتا اُن سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے پر ڈر رہی ہے۔

اُنہوں نے اُسے حوصلہ دیا۔ ”بیٹی تم مجھے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ میں محسوس کر رہا ہوں۔ پر تم بول نہیں پا رہی ہو۔ ایسی کون سی اُلجھن ہے مجھے نہیں بتاؤ گی۔ میں عمر کی جگہ ہوں“۔ وہ بے بسی سے اُنہیں تکنے لگی۔ ”بولو بیٹا جو بات ہے جو تمہارے دل میں ہے۔“ وہ اُسے بولنے پہ آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ دریکتا کو اُن کی نرمی نے کچھ حوصلہ دیا۔

”انکل طیب کسی کے پاس بھی نہیں رہتا۔ مائرہ بھابھی کا تو آپ کو پتہ ہی ہے وہ اپنے سسرال میں ہیں۔ طیب کو ساتھ لے کر نہیں گئیں۔ باقی وہ کسی کے پاس نہیں رہتا۔ میرے ساتھ وہ بہت مانوس ہے۔ کیسے رہ پائے گا۔ کون دیکھ بھال کرے گا اُس کی۔ ہر ایک کی اپنی زندگی ہے کوئی بھی طیب کی ذمہ داری نہیں لے گا“۔ آخر میں وہ تھوڑا تلخ سی ہو گئی تو طاہر اس سادہ اور بے غرض سی لڑکی کو دیکھنے لگے۔ جسے اپنی زیادہ فکر نہیں تھی بلکہ اُس چھوٹے سے بچے کی فکر تھی جو ابھی ایک سال کا بھی نہیں تھا۔ وہ اُس کی باتوں سے مطلب کی بات تک پہنچ گئے تھے۔ ”تم طیب کو یہاں چھوڑنا نہیں چاہتی۔ میرا مطلب ہے کوئی یہاں اُسے رکھنے والا نہیں ہے“۔ ”نہیں طاہر انکل زیبن ہے تو۔ پر وہ تنخواہ دار نوکرانی ہے میں اعتبار نہیں کر سکتی“۔

”تو پھر تم شادی کے بعد طیب کو ساتھ لے جاؤ“۔ اُنہوں نے اُس کے دل کی بات کہہ دی۔ دریکتا کا چہرا

دیکھنے والا تھا۔ اُس پہ خوشیوں کے ہزاروں رنگ بکھر گئے تھے۔ اور ہر رنگ اپنی جگہ مکمل اور خوبصورت تھا۔

''انکل کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں''۔ بے یقینی سے اُس کی آواز لرز رہی تھی۔

بالکل سچ۔ کیونکہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میرے گھر میں بہت جگہ ہے۔ طیب عمر کا پوتا ہے۔ اُمید ہے۔ نشانی ہے شاہ زیب کی۔ عمر سے وابستہ ہر چیز اور ہر رشتہ مجھے عزیز ہے۔ وہ مضبوط لہجے میں بولتے دریکتا کے چہرے پہ چھائے بے یقینی کے بادلوں کو ہٹتا دیکھنے لگے۔

''کسی اور کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا جب میں طیب کو ساتھ لاؤں گی''۔ وہ دانستہ طور پہ اشعر کا نام نہیں لینا چاہ رہی تھی۔ ''ارے میرے گھر میں نوکروں کے علاوہ میں اور اشعر ہوتے ہیں جب مجھے اعتراض نہیں ہے تو پھر اشعر کو بھی نہیں ہوگا۔ وہ غصے کا تیز ہے۔ اَنا پسند ہے پر انسانیت اور انسانیت سے وابستہ رشتوں کو جانتا ہے باشعور ہے۔ اُس کی فکر مت کرو۔ میں اُسے سمجھا دوں گا''۔ طاہر بھی اُس کی ہچکچاہٹ بھانپ گئے تھے۔ اس لیے آرام اور تسلی سے بات کی۔

''انکل میری ایک بہت بڑی فکر ختم ہوگئی ہے۔ میں طیب کی وجہ سے پریشان تھی کہ اُس کا کیا ہوگا۔ وہ اُنہیں یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کیا کیا سوچتی رہتی ہے۔ وہ پچھتاتی تھی کہ اُس اسٹامپ پیپر پہ اپنے دستخط کیوں کیے۔ اُسی وجہ سے تو پورا گھر پریشان اور مایوسی کا شکار تھا۔ اُس نے یقیناً بہت بڑی غلطی کر دی تھی تب ہی تو اورنگزیب تایا خاموش رہنے لگے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے اُس نے اُنہیں اس طرح اُداس، خاموش اور پریشان نہیں دیکھا تھا''۔

دریکتا نے اسٹامپ پیپر پہ سائن کر کے اور وہ تحریر اشعر کے حوالے کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی اپنے پاؤں پہ کلہاڑی ماری تھی۔ ورنہ وہ کبھی بھی اس طرح رخصتی پہ مجبور نہ ہوتی۔

دریکتا کی سوچ طاہر انکل سے بات کرنے کے باجود بھی ایسی ہی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری نے شادی کے کارڈ چھپنے کے لیے دے دیئے تھے۔

اُن کی دونوں بیٹیاں، داماد اور بچے پاکستان آ گئے تھے۔ اشعر کی بہنیں نکاح پہ نہیں آ پائی تھیں۔ یہاں آ کے روبرو پہلی بار اپنی بھابھی کو دیکھا تھا۔ بہت خوش تھیں دونوں بہنیں۔ اُن کا اکلوتا بھائی تھا۔ بہت ارمان تھے اُن کے دل میں۔ اپنے اپنے انداز سے خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ مہمانوں کی لسٹ بن رہی تھی۔ وقت کم تھا۔ لائبہ اور ثمرہ شادی کی شاپنگ کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اشعر سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

طاہر لغاری نے لائبہ، ثمرہ اور اشعر تینوں کو طیب کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد دریکتا کے ساتھ اسی گھر میں رہے گا۔ اشعر کچھ نہیں بولا تھا۔ پر لائبہ اُس کی سب سے بڑی بہن نے چھیڑ چھیڑ کے ناک میں دم کر دیا تھا۔ ''اشعر تمہیں تو جہیز میں ایک چھوٹا سا رقیب بھی مل رہا ہے''۔ وہ اُسے شرارتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ''تو پھر کیا ہے میں چھوٹے بڑے رقیبوں سے نمٹ لوں گا''۔ اشعر نے بات مذاق میں اُڑا دی۔

ثمرہ اُس سے یعنی اشعر سے بڑی اور لائبہ سے چھوٹی تھی۔ وہ سنجیدہ مزاج تھی۔ پر اشعر کو تنگ کرنے سے باز وہ بھی نہیں آ رہی تھی۔

طاہر بہت خوش تھے۔ بہن بھائی کی ہنسی مذاق نوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ برسوں بعد اس گھر میں خوشیوں کی بارات اُتری تھی۔ اُن میں جوانوں کی سی پھرتی اور تیزی آ گئی تھی۔ بڑھ چڑھ کے سب کاموں میں حصہ لے رہے تھے۔ مشورہ دے رہے تھے۔ آخر اُن کے اکلوتے بیٹے کی شادی تھی۔

☆☆☆

دریکتا پہلی بار ہاسپٹل آئی تھی پپا کو دیکھنے پرسوں اُس کی رخصتی تھی۔ فوزیہ چچی نے خود کہا تھا کہ شادی سے پہلے جا کے پپا کو دیکھ لو۔ دریکتا خود بھی یہی چاہ رہی تھی۔ اُس کے ساتھ فرح اور فوزیہ چچی دونوں آئی تھیں۔

عمر زیب الگ روم میں تھے۔ نرس نے اُنہیں ابھی اُن کے سامنے دوائی کھلائی اور انجکشن لگایا تھا۔ ''پپا آپ ٹھیک ہیں''۔ دریکتا سامنے کھڑی تھی۔ اُنہوں نے ایک ثانیے کے لیے نگاہیں اُٹھا کے اُسے دیکھا اور پھر خود میں گم ہو گئے۔ جیسے اُن کے سامنے کوئی بھی نہ ہو۔ آج اُن کے رویئے میں کوئی جارحیت نہیں تھی۔ یہ ایک اچھا اشارہ تھا۔ جانے کیوں دریکتا کا دل چاہا اُن کے سینے سے لپٹ جائے پہلے کی طرح۔ پر دل مسوس کے رہ گی۔ ڈاکٹر نے کسی بھی قسم کے جذباتی رویئے کے مظاہرے سے روکا تھا۔

جاتے جاتے وہ اُن کے سامنے رُکی اُنہیں جی بھر کے دیکھا۔ تو ٹوٹ کے رونا آیا۔ پر آنسوؤں کو آنکھوں میں قید کرنا پڑا۔ کیسا عجیب رشتہ تھا باپ بیٹی کا۔ وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ کوئی اپنا نہیں تھا راز دار نہیں تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو اُس کی جدائی پہ روتا۔ نہ ماں نہ بہن نہ بھائی۔ عمر خود ہاسپٹل میں تھے۔ کون اُس کے لیے دعا کرتا کہ تمہارے نصیب اچھے ہوں۔ کون سینے سے لگاتا۔ دریکتا کو اپنا اکیلا پن بہت زیادہ کھل رہا تھا۔

یہاں اُس کی شادی کی کوئی خاص خوشی نہیں تھی۔ ہاں فوزیہ اور فرح چچی اور اُس کی کزنز کچھ سرگرمی دکھا رہی تھیں ورنہ شریں یا سائرہ خاموش ہی تھیں۔ مائرہ رخصتی سے ایک دن پہلے آئی اُس کے ساتھ صرف بیٹا تھی۔ مائرہ مارے باندھے آئی تھی۔ اُس کا دل نہیں چار رہا تھا جب سے باسط اس طرح گیا تھا۔ اُس کو کسی کام میں بھی خوشی یا سکون نہیں مل رہا تھا۔ بیناز بردستی لے کے آئی تھی کہ چلو دل بہل جائے گا۔ مگر یہاں آ کے بھی اُس کی اداسی ختم نہیں ہوئی۔

☆☆☆

دریکتا پہ کل کی فکر سوار تھی۔ کہ آیا طیب کل اُس کے ساتھ جائے گا کہ نہیں۔ یا دو چار دن بعد اُسے یہاں سے لے جانا پڑے گا۔ یہ بات اُسے طاہر انکل سے پوچھتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ اشعر کی دونوں بہنیں یہاں گاؤں آ کے اُس سے ملی تھی مگر اُن سے بھی وہ یہ بات نہیں کر سکتی تھی۔

لے دے کے صرف ایک اشعر ہی بچتا تھا کیونکہ شادی اُسی کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اسٹامپ پیپر پہ سائن دریکتا نے اُسی کے کہنے پہ کیے تھے۔ اُس کو یہ بات اشعر سے ہی کرنی چاہیے۔ آخر اُس نے بھی تو (اپنے تئیں سائن کر کے) اُس کا ساتھ دیا تھا۔ دریکتا کے سر سے بوجھ اُترا۔ اشعر سے وہ کیسے بات کرتی۔ اُس کے پاس نمبر نہیں تھا اشعر کا۔ اور نہ کبھی اُسے عام حالات میں بات کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اشعر کا نمبر پتہ چل سکتا تھا یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ اورنگزیب کے پاس اشعر کا نمبر تھا لیکن تایا سے نمبر معلوم کرتے ہوئے اُسے شرم آ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں طاہر انکل کا نام آیا۔ جب وہ شادی کی ڈیٹ لینے آئے تھے تو اُنہوں نے تب دریکتا سے اُس کا سیل نمبر لیا تھا اور اپنا بھی اُسے دیا تھا کہ کبھی کبھی ضرورت پڑ جاتی ہے تو انسان بات تو کر سکتا ہے۔

وہ طاہر انکل سے اشعر کا نمبر پوچھ سکتی تھی۔ اُسے شرم تو آ رہی تھی پر ساری شرم بالائے طاق رکھتے ہوئے خود کو اس دلیل سے مطمئن کرتے ہوئے آخر میرا نکاح ہوا ہے۔ اشعر لغاری کے ساتھ میں بات کر سکتی ہوں۔ اس میں حرج نہیں

ہے اُس نے طاہر انکل کو کال کر دی۔

دریکتا نے اُنہیں خود کبھی کال نہیں کی تھی۔ اب کل اشعر کی بارات جانی تھی۔ اس تناظر میں دریکتا کی کال اُنہیں پریشانی سے دوچار کر گئی۔ کہ جانے کیا بات ہے۔ کہیں اُس نے رخصتی سے انکار کرنے کے لیے تو فون نہیں کیا۔ اُن کے ذہن میں پہلی بات ہی یہی آئی۔ تب ہی دریکتا سے بات کرتے ہوئے اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''بیٹا خیریت تو ہے ناں سب ٹھیک ہے ناں''۔ اُنہوں نے لہجے کی لرزش چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ دریکتا اپنی پریشانی میں تھی اُس نے محسوس ہی نہیں کیا۔

''جی انکل سب ٹھیک ہے''۔ وہ اتنا کہہ کے خاموش ہوگی۔ طاہر بے تابی سے اُس کے مزید بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔

مجھے اشعر کا نمبر چاہیے یا میری اُن سے بات کروا دیں۔ اُس نے خود میں جرأت پیدا کرتے ہوئے کہہ ہی دیا۔ ایک ثانیے کے لیے وہ خاموش سے ہوگئے اور پھر فوراً اُس کا نمبر نوٹ کروا دیا۔ ''بیٹا کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے''۔ وہ ابھی تک اُلجھن کا شکار تھے۔

''نہیں انکل بس مجھے ایک کام ہے''۔ دریکتا نے کام کی نوعیت اُنہیں نہیں بتائی۔

☆☆☆

اشعر لغاری کی طرف بڑی رونق لگی ہوئی تھی۔ ایک دن پہلے مہندی ہوئی تھی اور ثمرہ لائبہ نے دل کھول کے اپنے ارمان پورے کیے تھے۔ آج کے دن کوئی رسم وغیرہ نہیں تھی۔ آرام ہی آرام تھا۔ اس کے باوجود بڑا ہنگامہ تھا۔ اشعر کی کزنز، پاس پڑوس کی لڑکیاں، عورتیں سب جمع تھیں۔ کل کے دن کی تیاری ہو رہی تھی۔ اشعر کی بارات جانی تھی۔ اُس کے دوست بھی آئے ہوئے تھے۔ رات کافی ہو چلی تھی۔ ایک ایک کر کے سب جا رہے تھے۔

اشعر رضوان کو اللہ حافظ کہہ کر واپس آیا تو ایک بج رہا تھا۔ اُسے سخت نیند آ رہی تھی۔ فریش ہو کے چینج کر کے بیڈ پہ آیا تو اُس کا سیل بجنے لگا۔ ''جانے کون ہے''۔ اُس نے نمبر دیکھا اور کال ریسیو کر کے سیل فون کان سے لگا لیا۔

''اسلام علیکم'' اشعر بولا تو دریکتا پہ خاموشی طاری ہوگی۔ وعلیکم اسلام بمشکل اُس کے منہ سے نکلا۔ ''معاف کیجیے گا میں نے پہچانا نہیں''۔ رات کے اس پہر اس اجنبی لڑکی کو وہ واقعی نہیں پہچان پایا تھا۔

''میں دریکتا بات کر رہی ہوں''۔ اوہو'' اشعر ایک ٹھنڈی سانس لے کے رہ گیا۔

''آج ہی کا دن ہے۔ کیا آپ کل تک انتظار نہیں کر سکتی''۔ اشعر کو بے اختیار شرارت سوجھی تو دوسری طرف موجود دریکتا اس لطیف سی جرأت پہ تھوڑا نروس سی ہوگی۔ ''میں مَیں طیب کو کل اپنے ساتھ لانا چاہتی ہوں۔ مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ کیسے ہوگا۔ ہو سکتا ہے آپ کی فیملی کو اعتراض ہو طیب کو بارات والے دن ساتھ لانے پہ۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو ایسا ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کل خود کہہ دیں کہ طیب ہمارے ساتھ جائے گا تو..........''

وہ اُمید وبیم کی کیفیت میں اُس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ شروع میں بات کرتے ہوئے وہ نروس تھی اب اضطراب کا شکار تھی۔

اشعر اُس کی بات سمجھ گیا تھا۔ ''ٹھیک ہے کل طیب ساتھ ہی ہوگا آپ کے۔ باقی میں سنبھال لوں گا''۔ دریکتا بے طرح خوش ہوگی۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ میں اس بات کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ آپ نے میری مشکل آسان کر دی ہے''۔

اشعر تو مختلف ثابت ہو رہا تھا جیسا اُس نے اورنگزیب تایا اور شریں تائی سے سنا تھا اُس کے گھر پہ فائرنگ کروانے والا شخص اس قدر ہمدرد بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''کل ملاقات ہوگی آپ سے فیس ٹو فیس۔ پھر شکریہ ادا بھی کر دیجیے گا''۔

اشعر کے یہ کہنے کی دیر تھی اُس نے فون بند کر دیا۔

دریکتا بہت خوش اور مطمئن تھی۔ کل طیب اُس کے ساتھ ہوگا۔ اُسے حویلی میں کسی کے بھی رحم وکرم پہ نہیں چھوڑنا پڑے گا۔

اُسے مارے خوشی کے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

پپا کے بغیر شاہ زیب کے بغیر اُسے اپنی رخصتی کا تصور بھی کل تک بہت کربناک لگتا تھا۔ مگر وہ اُن کے بغیر ہی رخصت ہو کر اشعر لغاری کے گھر آئی۔ طیب اور زیبن اُس کے ساتھ تھے۔ اشعر نے نہ جانے اورنگزیب اور شریں سے کیا کہا تھا کس طرح بات کی تھی جو زیبن طیب کے کپڑے اور دیگر ضروری سامان پیک کر کے واپسی پہ بارات کے ساتھ ہی آئی تھی۔

اشعر نے ثمرہ، لائبہ اور پپا کو خود ہی قائل کیا تھا۔ کسی کو اگر تھوڑا بہت اعتراض تھا بھی تو اُس نے ختم کر دیا تھا۔

اس کے باوجود دریکتا یہاں آ کر بھی رو رو کے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ ثمرہ، لائبہ دونوں نے مشکل سے اُسے خاموش کروایا۔ اتنا تو اُنہیں بھی پتہ تھا کہ دریکتا کے جوان بھائی کی ڈیتھ ہو گئی ہے اور عمر انکل ذہنی امراض کے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔ اُنہیں دریکتا کے نازک احساسات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ یہ لڑکی جو ابھی اپنے گھر سے باپ اور بھائی کے بغیر وداع ہو کے آئی ہے اُس کے دل پہ کیا گزر رہی ہوگی۔ رو رو کے دریکتا کا سر درد کر رہا تھا۔

اشعر دوستوں کی طرف تھا۔ جب سے بارات لوٹی تھی وہ تب سے دوبارہ خواتین کے گھیرے میں نہیں آیا تھا جو عجیب عجیب سی رسمیں کر رہی تھی۔

☆☆☆

ثمرہ نے زیبن کے لیے کمرا خالی کروا کے سیٹ کروا دیا تھا۔ طیب اُسی کے پاس تھا۔ طیب کو سلانے سے پہلے وہ اُسے دریکتا کے پاس لے گی۔ نیند سے طیب کی آنکھیں بوجھل تھی پر وہ سو نہیں رہا تھا۔ بے چین سا تھا اتنے بہت سارے لوگوں کو دیکھ کر اور آج اُس نے تنگ بھی بہت زیادہ کیا تھا۔

دریکتا نے طیب کو اُس سے لے لیا۔ زیبن کے ہاتھ سے اُسے لینے کی دیر تھی اُس نے رونا شروع کر دیا دریکتا کا بھاری لہنگا اور اُس پہ کیا گیا کام طیب کے نازک جسم کو گراں گزرا تھا۔ اُس نے رو کے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ زیبن نے اُسے اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ اب وہ پرسکون تھا۔ اتنے میں ثمرہ بھی اُدھر آ گی۔ ''ہاں جی سونے سے پہلے طیب سے مل لو اشعر آ رہا ہے''۔ اُس کے لہجے میں شرارت ہی شرارت تھی۔ وہ سمٹ سی گی۔ ثمرہ کے بعد لائبہ اور اُن کی کچھ اور کزنز بھی دریکتا کے پاس بیٹھ گئیں۔

زیبن بھی وہیں تھی۔ طیب کے منہ میں فیڈر دبی تھی اور وہ نیند کی وادیوں میں آہستہ آہستہ اُتر رہا تھا۔ زیبن

دلچسپی سے اُن سب کی باتیں سن رہی تھی۔ لطف اندوز ہو رہی تھی۔

اشعر دوستوں سے فارغ ہو کے آیا تو لائبہ کو دریکتا پہ رحم آ گیا۔ بھاری جوڑے اور زیورات کی وجہ سے وہ بہت بے آرام سی تھی۔

لائبہ نے سب کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔

''دریکتا میں نے تمہارے کپڑے نکال کے رکھ دیے ہیں بدل لینا۔ اور پریشان مت ہونا طیب سو گیا ہے یہ دیکھو زیبن کی گود میں ہے''۔ وہ جاتے جاتے پھر شرارت سے بولی تھی۔ کمرا خالی ہو چکا تھا۔ اب صرف اشعر ہی تھا۔ جو صوفے پہ بیٹھا اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے آپ کافی تھک گئی ہیں۔ ذہنی اور جسمانی طور پر۔ آپ ان کپڑوں سے جان چھڑائیے اور ریسٹ کریں''۔ اشعر شوز اُتارنے لگا۔ دریکتا نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ باتھ روم میں جا چکا تھا۔ پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ چند منٹ بعد وہ نائیٹ ڈریس میں ملبوس باہر نکلا۔ ''جائیں آپ بھی چینج کر لیں''۔ وہ نرمی سے بولا تو دریکتا بھاری لہنگا سمیٹتی آرام سے اُٹھی۔ بیڈ کے پاس ہی اُس کے ہائی ہیل سینڈل پڑے تھے۔ اُس نے بمشکل تمام پاؤں میں ڈالے اور قدم اُٹھایا۔ دو قدم ہی چلی ہو گی کہ لڑکھڑا گئی۔ اشعر اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ دریکتا نے وہ سینڈل باتھ روم کے دروازے کے باہر ہی اُتار دیئے اور ننگے پاؤں اندر گئی۔

دوپٹہ اُتار کے ہینگ کیا۔ پھر ایک ایک کر کے جوڑے کی پنیں اُتاریں اُس کے بعد زیورات کی باری آئی۔ نہانے کے بعد کچھ سکون کا احساس ملا۔ پر باہر آنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ دل آنے والے لمحات کے تصور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ دل اور دماغ میں کشمکش ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اشعر سے ڈر بھی لگ رہا تھا۔

بڑی مشکل سے خود کو سمجھا کے باہر آئی۔

بیڈ روم کی تمام لائٹس بند تھیں۔ صرف زیرو پاور کی ایک لائیٹ جل رہی تھی۔ اُس کے قدم ہی من من بھر کے ہو گئے۔ چلا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اشعر کی نگاہ اُسی کی طرف تھی وہ شاید اُس کی اندرونی کشمکش سے واقف تھا اس لیے لائٹس دوبارہ آن کر دیں۔ وہ پُر اسرار اور معنی خیز ماحول یکسر بدل گیا۔

''آیئے سو جائیں مجھے خود بہت شدید نیند آ رہی ہے''۔ اُس نے سگریٹ، لائٹر دونوں چیزیں تپائی سے اُٹھا لیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی آگے آ گی۔ اشعر اُٹھ گیا تھا۔ دریکتا کا دل دھک دھک کرنے لگا وہ اُس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ سائیڈ پہ ہو گی جیسے بچنا چاہ رہی ہو۔ اشعر نے اُس کی طرف نہیں دیکھا وہ ٹیرس کا دروازہ کھول کے باہر آ گیا۔

دریکتا کو بہت دیر بعد نیند آئی۔

اشعر جانے کس وقت دوبارہ آیا اور سویا اُسے خبر نہیں تھی۔ صبح جب اُس کی آنکھ کھلی تو وہ جہازی سائز بیڈ کے دوسرے کونے میں سر کے نیچے دو دو تکیے رکھے محوِ خواب تھا۔

اُسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کب آ کے سویا یہ تو طے تھا کہ وہ اُس کے سونے کے بعد ہی آیا ہو گا۔ کچھ عجیب سا رویہ تھا اُس کا۔ جیسے دریکتا کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ وہ سوچنا چاہ رہی تھی پر ٹائم نہیں تھا۔ اُسے ناشتے کے بعد پالر جانا تھا۔ جانے کتنی دیر تختہ مشق بننا تھا اور پھر ایک ہی پوز میں مسلسل بیٹھنا تھا ایک ہی جگہ بہت مشکل تھا۔

اشعر دوپہر تک سویا۔

دریکتا سب کے ساتھ ناشتہ کر چکی تھی اور اب گاؤں سے آئے ہوئے رشتہ داروں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اشعر بھی بیدار ہونے کے بعد اُدھر ہی آ گیا۔ سائرہ نے بڑے غور سے اُسے دیکھا۔ اشعر نے سب کو سلام کیا۔ دریکتا کی دونوں چچیاں، تائی، کزنز وغیرہ سب ہی تھے۔ صرف اورنگزیب اور ہارون نہیں تھے۔ اُنہوں نے شام کو آنا تھا۔ اورنگزیب یہاں آنے میں بے عزتی محسوس کر رہے تھے پر شریں کے سمجھانے بجھانے پہ آمادہ ہو گئے تھے۔ نوید چچا تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے کہ شام کو پھر آؤں گا کیونکہ ولیمہ شام بلکہ رات کو تھا۔ دریکتا سے مل کے وہ ہاسپٹل چلے گئے عمر زیب کی طرف۔

☆☆☆

اشعر کا ناشتہ لائبہ ڈرائنگ روم میں ہی لے آئی جہاں دریکتا کے رشتہ دار بیٹھے تھے۔ اشعر ہنس ہنس کے باتیں کر رہا تھا اس وقت وہ کہیں سے بھی وہ سخت گیر پولیس آفیسر نہیں لگ رہا تھا جس طرح سائرہ نے اُس کے بارے میں سنا تھا۔

اشعر نے ڈٹ کے ناشتہ کیا اور آخر میں چائے پی۔ ہلکے رنگ کی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس سائرہ کو وہ بہت زوردار لگا۔ ٹی شرٹ میں جھانکتے بازوؤں کے مضبوط مسلز اور کلائی پہ بندھی قیمتی ریسٹ واچ سے لے کر اُس کے ہیر اسٹائل تک سب کچھ ہی قابل توجہ تھا۔

سائرہ کو اچانک دریکتا سے وہی پرانا حسد محسوس ہونے لگا۔ یہ شاندار مرد اُس کا شوہر تھا اُس کے تمام تر اختیارات اور جملہ حقوق کا مالک۔ اشعر لغاری اُسے تر و تازہ زندگی سے بھرپور لگ رہا تھا جبکہ اُس کے مقابلے میں دریکتا بجھی بجھی اور تھکی تھکی سی نظر آ رہی تھی۔

اُس کی تھکن کی وجہ نظر انداز کرنے والی نہیں تھی۔ سائرہ سلگ اُٹھی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی اشعر نے آخر کار دریکتا کو جیت ہی لیا تھا۔ ابو نے کتنا زور لگایا تھا وہ دریکتا کو چھوڑ دے۔ پر وہ ضدی تھا غیرت کا پکا تھا تب ہی تو کل اُسے رخصت کروا کے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اور آج وہ حقیقت بنی اُس کے گھر میں بیٹھی تھی۔ کتنا مکمل منظر تھا۔ اُس نے رشک سے دیکھا۔

نوکرانی ناشتے کے برتن اُٹھا کے لے گئی تو زیبن طیب کو لیے چلی آئی۔ دریکتا نے بے تابی سے اُسے گود میں لیا۔ اور اُس کے گال چومے۔ شریں نے معنی خیز نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ طیب کی ذمہ داری کا بوجھ مکمل طور پر اُن کے سر سے اُتر گیا تھا۔ دریکتا اُسے ساتھ لے آئی تھی اُسے اپنے دلہناپے کی بھی پروا نہیں تھی کہ اس طرح شادی کے اولین دنوں میں طیب پہ اتنی توجہ دینے سے کہیں اشعر ناراض نہ ہو جائے۔ پر وہ تو مسکرا رہا تھا اُسے طیب کے ساتھ لاڈ کرتے دیکھ کر۔ جیسے اُس کی اپنی اولاد ہو۔ سوچتے ہی شریں شرمندہ سی ہو گئی ایک مائرہ تھی اُس کی ماں اور دوسری شریں تھی طیب کی نانی، سائرہ بھی تھی وہ بھی تو دریکتا کی ہم عمر ہی تھی۔ کسی کو بھی طیب کی پروا نہیں تھی۔

ان اجنبی لوگوں نے جو طیب کے سگے نہیں تھے اُسے قبول کر لیا تھا۔ شریں نے اشعر کی فیملی کے ہر چہرے کو غور سے دیکھا کہ کہیں اُسے کوئی خفگی نظر آئے۔ پر نہیں۔ دریکتا پہلے دن ہی طیب کو ساتھ لے آئی تھی۔ شریں نے زیبن سے کرید کرید کے سب کے رویے کے بارے میں پوچھا۔ پر اُسے جواب سن کے مایوسی ہوئی۔ ثمرہ، لائبہ نے تو طیب کو گود میں لٹا کے لاڈ بھی کیا تھا۔ ثمرہ کی دو بیٹیاں ہی تھیں اُنہیں ایک کھلونا مل گیا تھا۔ طیب کو اُٹھا کے گھوم رہی تھیں وہ بھی ہنس رہا تھا کھل کھلا رہا تھا جیسے اپنی خوشی کا اظہار کر رہا ہو۔

وہ یہاں آکے خوش تھا۔ اس گھر کے مکینوں میں اپنائیت کی خوشبو تھی۔ بچے شائد اس چیز کو پہچانتے ہیں اس لیے طیب ثمرہ کی گود میں آکے رہ نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

ولیمے کی تقریب رات گئے اختتام پذیر ہوئی تو سب تھکن سے چور تھے۔ دریکتا کو تو سخت قسم کی نیند آرہی تھی۔ کل رات بھی وہ ٹھیک طرح سو نہیں پائی تھی۔ اجنبی جگہ تھی اجنبی بستر تھا اجنبی کمرا تھا۔ کچھ پریشانیاں بھی اپنی جگہ موجود تھیں جنہوں نے اسے سکون کی نیند سونے نہیں دیا تھا۔ صبح آنکھ بھی جلدی کھل گئی تھی۔

زیبن کل کی طرح آج بھی طیب کو سلانے لے گئی۔

دریکتا نے ولیمے کے بھاری کامدار جوڑے سے جان چھڑائی تو سکون ملا۔

کپڑے بدل کے باہر آئی تو اشعر موجود تھا۔ حالانکہ جب وہ کمرے میں آئی تھی تو وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ جیسے ہی بیڈ کے قریب آئی اشعر نے سب لائٹس آف کر دیں سوائے زیرو پاور لائیٹ کے۔ وہ خود صوفے پہ بیٹھا تھا۔ شاید اُسی کے انتظار میں تھا۔ دریکتا کا دل دھڑکنے لگا۔ کل تو وہ سو گیا تھا اُسے بھی ریسٹ کا کہا تھا۔ پر آج جانے کیا ہوگا۔ وہ گرنے کے انداز میں بیٹھی تھی۔ اشعر کو ہنسی تو بہت آئی پر ہونٹوں میں دبا لی۔ اشعر نے دو تکیے اُٹھائے سر کے نیچے رکھے۔ ''پلیز زیرو پاور کی لائیٹ بھی آف کر دیں یہ تیسرا بٹن ہے۔'' کروٹ بدل کے اُس نے یہ جملہ سو فیصد دریکتا سے کہا تھا۔ اُس نے لائیٹ آف کر دی۔

کافی دیر بعد اُسے بھی نیند آہی گئی تو وہ ہاتھ پاؤں چھوڑے بے خبر سو گئی۔ یہ اشعر لغاری پہ اعتماد کی دلیل تھی۔

☆☆☆

پندرہ بیس دن پر لگاتے ہی اُڑ گئے۔ ثمرہ، لائبہ واپس جا رہی تھیں۔ اُنہوں نے دریکتا کو بہت محبت اور اپنائیت دی تھی۔ بہت جلدی وہ اس گھر کے ماحول اور فضا سے مانوس ہو گئی تھی۔ اس میں سارا کمال ثمرہ اور لائبہ کے محبت بھرے رویئے کا تھا۔ یہی وجہ تھی دریکتا اُن کے واپس جانے پہ بہت روئی۔

دو دن بولائی بولائی پھرتی رہی۔ زیبن، طاہر انکل اور طیب نہ ہوتے تو وہ تنہائی کے احساس سے پاگل ہی ہو جاتی۔ اشعر کی شکل گھر میں کم ہی نظر آتی۔ وہ بہت مصروف ہو گیا تھا یا جان کے خود کو مصروف ظاہر کر رہا تھا۔ یہ کسی کو بھی نہیں پتہ تھا۔

اشعر کا چہرا اور لہجہ دونوں ہی بہت سنجیدہ تھے۔ آج وہ روز کی طرح کمرے میں آتے ہی سویا نہیں تھا بلکہ دریکتا کو پاس بلا کے بیٹھ گیا۔ ''میری دونوں بہنیں چلی گئی ہیں آپ نے طیب کی دیکھ بھال کے لیے جس خاتون کو رکھا تھا اُسے واپس بھجوا دیں اور خود یہ کام کریں کیونکہ اب آپ فری ہیں اور کوئی آپ کو پوچھنے والا بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی آپ طیب کو اپنی ذمہ داری گردانتی ہیں۔

آپ طیب کو یہاں لے آئیں میں ساتھ والے بیڈروم میں شفٹ ہو رہا ہوں۔ آپ اور طیب آرام سے یہاں رہیں۔ یہ کمرا آپ کا ہے۔ میں ڈسٹرب نہیں کروں گا۔'' وہ اُسے خوشخبری سنا کر وارڈروب سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔

دریکتا اُس کی حرکات کو دیکھ رہی تھی۔ اتنی توہین۔ اتنی انسلٹ۔ اشعر نے اُس کے ساتھ اجنبی سے بھی گیا گزرا برتاؤ کیا تھا جیسے وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں ہے۔ کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ بس اتنی اہمیت ہے۔ اُس کی اشعر

اُسے جیت کے یہاں لے آیا ہے۔ اب وہ کونے میں پڑے کاٹھ کباڑ جیسی ہے۔ کیونکہ اشعر کی دلچسپی اُسے اپنے گھر میں لانے تک تھی۔

وہ سوچ رہی تھی اور آنکھوں میں نمی پھیلتی جا رہی تھی۔

اشعر اپنے کپڑے لے کے چلا گیا۔ وہ دوبارہ باتھ روم سے اپنی کچھ چیزیں لینے آیا تو دریکتا اُسی طرح بت بنی بیٹھی تھی۔

''آپ طیب کو ابھی لے آئیں اپنے پاس سلائیں''۔ دریکتا نے غصے سے اُس کی طرف دیکھا۔ پر اشعر کی پیٹھ اُس کی طرف تھی ورنہ وہ اُس کا غصیلا چہرا ضرور دیکھ لیتا۔ جس پہ شکایات ہی شکایات رقم تھیں۔

☆☆☆

زیبن اگلے دن واپس چلی گئی۔ طاہر انکل نے ایک اور کل وقتی نوکرانی کا بندوبست کر دیا تا کہ دریکتا کو بھی تھوڑی آسانی ہو۔

گھر میں طاہر انکل، طیب اور دریکتا کے علاوہ باقی نوکر ہی تھے۔ اشعر الگ بیڈروم میں شفٹ ہو گیا تھا۔ طاہر انکل کے سامنے وہ اُس سے بات کر لیتا اور اکیلے میں سامنا ہوتا تو اجنبی بن جاتا۔

دریکتا کو خوش ہونا چاہیے تھا پر وہ خوش نہیں تھی۔ جانے کیوں؟

☆☆☆

باسط دو ماہ بعد بغیر بتائے آیا۔ اس بار وہ مائرہ کو ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا۔ ایک ہفتہ پاکستان میں قیام کرنے کے بعد وہ مائرہ کو ساتھ لے کر واپس آ گیا۔ وہ یہاں آکر بہت خوش تھی۔ باسط پورا ہفتہ دن رات اُس کے پاس رہا۔ اُس نے مائرہ کی پور پور اپنی محبت کی بارش سے بھگو دی تھی۔ ایک دم سے اُس کے رویے میں جو سرد مہری در آتی تھی اُس کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہ شادی کے ابتدائی دنوں والا باسط تھا پروانہ وار نچھاور ہونے والا۔

نوازنے پہ آیا تھا تو اُس کی جھولی بھر دی تھی۔

مائرہ کا حسن کچھ اور بھی نکھر آیا تھا۔

وہ پہلے سے بڑھ کر دلفریب لگ رہی تھی۔

اور باسط تو گویا اُس کا عاشق بنا ہوا تھا۔

مائرہ کی طبیعت دوبئی آنے کے کچھ دن بعد خراب ہو گئی اُس کا جی متلا رہا تھا۔ وہ بار بار سنک کی طرف جا رہی تھی۔ باسط اُسے پُرسوچ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ مائرہ اُلٹیاں کر کر کے بے حال تھی۔ واپس اُس کے پاس آ کے لیٹ گئی۔ ''اُٹھو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں''۔ باسط نے اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیریں۔ وہ پیار بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''مجھ سے نہیں جایا جاتا۔ باسط پلیز''۔ وہ تکیے میں منہ چھپانے لگی۔ ''میں کہہ رہا ہوں ناں اُٹھو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے''۔ مجھے کوئی اور ہی شک ہو رہا ہے۔ باسط کی بات کا مطلب سمجھ کر مائرہ سرخ پڑ گئی اور اُس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

ڈاکٹر نے مائرہ کا چیک اپ کیا اور دوائیں دے کر گھر بھیج دیا۔ مائرہ کی طبیعت کسی خوشخبری کی وجہ سے خراب

لیں گی۔ باسط بہت بجھا بجھا سا تھا۔ اُس کی اداسی مائرہ نے بھی محسوس کر لی تھی۔ ''باسط کیا ہوا ہے کیوں اداس ہو''۔ اُس نے باسط کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''تمہیں پتہ تو ہے مجھے کتنا شوق ہے میں ڈھیر سارے بچوں کا باپ بنوں۔ اور تم ہو کہ میری یہ خواہش پوری ہی نہیں کر رہی ہو''۔ وہ نروٹھے پن سے گویا ہوا اور اُس کا بازو کندھے سے ہٹا دیا۔ ''باسط ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے ہماری شادی کو ایک سال بھی پورا نہیں ہوا۔ اور آپ مایوسی کی باتیں کرنے لگے ہو''۔ ''مجھے جلدی سے باپ بناؤ بس''۔ وہ ضدی لہجے میں بولا۔

مائرہ کو گھر چھوڑ کے وہ خود دوستوں کی طرف چلا گیا۔

باسط کا دل چاہ رہا تھا کہ اب سب کچھ چھوڑ کے واپس چلا جائے۔ اُس کے پارٹنر نے کام شروع کرنے سے پہلے اُسے کسی بھی وقت کاروبار سے الگ ہونے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ مائرہ کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے سے پہلے انہی پہلوؤں پہ غور کر رہا تھا۔

☆☆☆

دریکتا طیب کو سلا رہی تھی جب دھیرے سے دروازہ کھول کے اشعر اُس کے پاس آیا۔ وہ آج گھر پہ ہی تھا اور کمرے میں بند تھا آفس کے ضروری کام نمٹا رہا تھا۔ دریکتا کے کمرے میں وہ بغیر ضرورت یا ضروری کام کے آتا نہیں تھا۔ اس لیے وہ حیران سی تھی۔ ''میں عمر انکل کے پاس ہاسپٹل جا رہا ہوں۔ آپ نے جانا ہے تو تیار ہو جائیں''۔ وہ منتظر نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے میں آتی ہوں دس منٹ تک''۔ ''اوکے میں اپنے روم میں ہوں مجھے بتا دیجیے گا''۔ وہ پلٹ گیا۔ دریکتا تیزی سے اُٹھی۔ اُس کے قدموں میں پھرتی تھی۔ شادی کے بعد وہ پہلی بار پپا کو دیکھنے جا رہی تھی۔ اپنا فیورٹ کلر کا سوٹ پہنا۔ ہونٹوں پہ لپ اسٹک لگائی۔ خود کو آئینے میں دیکھ کے وہ مطمئن تھی۔ کھلے بالوں کو کیچر میں جکڑے اُسے اپنا آپ بہت اچھا لگا۔ چہرے اور آنکھوں میں خوشیوں کی چمک تھی۔

تیار ہو کے اُس نے اشعر کے کمرے کا دروازہ ناک کیا۔ وہ اُسی کے انتظار میں تھا۔

طاہر لغاری دونوں کو اکٹھے جاتے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

دریکتا کے لیے اشعر نے فرنٹ ڈور کھولا تو وہ جھجک سی گئی۔

''بیٹھیں جلدی''۔ وہ اُسے تذبذب میں دیکھ کر بیزار سا ہوا۔

دریکتا خاموشی سے قدرے سائیڈ پہ ہو کے بیٹھ گئی۔ اس حد درجہ احتیاط کے مظاہرے پہ وہ کھول سا گیا۔ ''میں کوئی موم کا بنا ہوا نہیں ہوں جو پگھل جاؤں گا۔ آرام سے بیٹھیں''۔ دریکتا بالکل دروازے کے ساتھ لگ کے بیٹھی تھی آدھی سیٹ تقریباً خالی تھی۔ دیکھتے ہی عجیب سا لگ رہا تھا۔ لہجہ اُس کا سخت ہی تھا۔ دریکتا کو بُری طرح محسوس ہوا۔ اُسے رونا ویسے بھی بہت جلدی آتا تھا۔ لیکن اس وقت آنسو کنٹرول کرنے ضروری تھے۔ وہ پپا کے پاس جا رہی تھی۔ اُن کے سامنے وہ ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔

اشعر سب سے پہلے ڈاکٹر سے ملا اور عمر زیب انکل کے بارے میں پوچھا۔ ''آپ کا مریض امپروو کر رہا ہے۔ آپ کے لیے خوشی کی بات ہے یہ''۔ ڈاکٹر عمران کی خاص توجہ عمر زیب پہ تھی۔ اُن کی کیس سے وہ بخوبی واقف تھے۔ اُنہوں نے ہی اشعر کو یہ حوصلہ افزا خوش کن خبر سنائی۔ ''میرے پپا ٹھیک ہو جائیں گے ناں''۔ دریکتا نے بے تابی سے پوچھا تو ڈاکٹر عمران مسکرا دیئے۔ ''جی ہاں میں بہت پُر امید ہوں۔ اُن کی حالت میں بہتری کے آثار ہیں۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد وہ مکمل طور پہ صحت مند ہو جائیں گے۔ آپ جائیں اُن کے پاس۔ دیکھ لیں خود''۔ ڈاکٹر عمران ہلکی سی مسکراہٹ سمیت بولے تو دریکتا تیزی سے کرسی سے اُٹھ گئی۔

عمر زیب آج بیڈ سے ٹیک لگا کے بیٹھے تھے۔

دریکتا اُن کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اُنہوں نے اُس کی سمت دیکھا۔ آج اُن کی آنکھوں میں ہوش مندی کے آثار تھے۔ وہ بولے تو نہیں پر دیکھ کر ہی ڈاکٹر عمران کا کہا سچ لگ رہا تھا۔ اشعر عمر زیب کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ اُسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ دریکتا خود ہی اُن سے باتیں کرنے لگی۔ ''پپا آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں میں پھر آپ کو یہاں سے لے جاؤں گی۔ طیب بھی بڑا ہو رہا ہے۔ آپ اُسے دیکھ کے بہت خوش ہوں گے۔ وہ بالکل آپ کے لاڈلے شاہ زیب کی طرح ہے۔'' ''شاہ زیب'' عمر زیب آہستہ سے بڑبڑائے۔ ''ہاں شاہ زیب''۔ دریکتا کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔ عمر زیب نے مدھم لہجے میں کچھ اور بھی کہا جو دریکتا کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بالکل اُن کے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں نرس آ گئی۔ اُن کی میڈیسن کا ٹائم ہو رہا تھا۔ دوائی کھلانے کے بعد وہ اُنہیں اپنے ساتھ ایک ٹیسٹ کے لیے لے گئی تو دریکتا اور اشعر بھی واپسی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

طیب نے ڈرتے ڈرتے پہلا قدم اُٹھایا۔

اُس سے پہلے اُس نے دریکتا کے سہارے کچھ قدم اُٹھائے۔ لیکن یہ پہلا قدم اُس نے خود سے اُس کے سہارے کے بغیر اُٹھایا تھا۔ دریکتا نے چوم چوم کے اُس کا منہ سرخ کر دیا۔ وہ بہت خوبصورت اور صحت مند ہو گیا تھا۔ توتلی زبان میں کچھ لفظ بھی بولنے لگ گیا تھا۔ ہر نیا آنے والا دن طیب کے حوالے سے اُس پہ خوشیوں اور حیرتوں کے در وا کر رہا تھا۔ آج طیب ہنسا آج طیب نے اُس کی انگلی پہ کاٹا وہ طاہر انکل کو دیکھ کے خوش ہوا۔ آج طیب کا ایک اور دانت نکلا۔ آج اُس نے اتنے قدم اُٹھائے۔ ایسی کتنی باتیں اور حرکتیں تھی طیب کی جو دریکتا کو سارا دن مسرور رکھتی۔ وہ ایک سال کا ہو رہا تھا۔ دریکتا اُس کی سالگرہ منانے کی تیاری کر رہی تھی۔ طاہر انکل جوش و خروش سے اُس کا ساتھ دے رہے تھے۔ دریکتا نے گاؤں سے تینوں چچا اور اُن کی بیویوں سمیت سب کزنز کو بھی انوائیٹ کیا تھا۔ کچھ آس پاس کے ملنے جلنے والے تھے۔ یہ تو اچھی خاصی تقریب بن گئی تھی۔

☆☆☆

طاہر نے طیب کے لیے بہت سے کھلونے خریدے۔ اشعر نے بھی اُس کے لیے کافی مہنگی شاپنگ کی۔ طاہر انکل کیک خود جا کے لائے۔

سب مہمانوں کی موجودگی میں دریکتا نے طیب کا ہاتھ پکڑ کے کیک کاٹا۔ سی گرین اور کاپر کلر کے کپڑوں میں ملبوس وہ خاصی توجہ سے تیار ہوئی تھی۔ ورنہ شادی کے بعد اُس کے حلیے میں خاص تبدیلی نہیں آئی تھی جو بیاہتا عورتوں کا حصہ ہوتی ہے۔ آج تو سونے کی چوڑیاں، کڑے، بندے اور لاکٹ بھی اُس کی گردن کی زینت بنا ہوا تھا۔ لمبے بالوں کو سینے پہ ڈالے وہ بڑی جاذب نظر لگ رہی تھی۔

سائرہ بھی ٹیبل کے نزدیک کھڑی تھی۔ اُس نے کیک کاٹ کے سروکیا۔ اشعر طیب کے قریب تھا سائرہ نے کمال بے تکلفی سے کیک کا بڑا سا ٹکڑا اشعر کی طرف بڑھایا تو ناچار اُس نے منہ کھول دیا۔

تھوڑا سا حصہ سائرہ کے ہاتھ میں رہ گیا تو اُس نے خود کھالیا۔ اچانک دریکتا کی نظر پڑی۔ اُسے سائرہ کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ وہ اشعر کے خاصے قریب کھڑی تھی۔ وہ اُسے خوشدلی سے باتیں کر رہا تھا۔ مہمان چلے گے۔ سائرہ اشعر کے ساتھ صوفے پہ بیٹھی تھی جانے کون سے موضوعات زیر بحث تھے جو ختم ہی نہیں ہو رہے تھے۔

''مجھے اپنا گھر تو دکھائیں''۔ اُس نے اشعر سے فرمائش کی جو اُس نے جھٹ پوری کر دی۔ اُس نے سائرہ کو پورا گھر دکھایا۔ آخر میں بیڈ روم کی باری آئی تو وہ دریکتا اور طیب کے کمرے میں اُسے لایا۔ وہ تنقیدی نگاہ سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ دریکتا طیب کو سلانے اُن کے پیچھے پیچھے آ گئی۔

اُس کی نگاہوں اور چہرے پہ غصے کی سرخی بڑی واضح تھی۔ سائرہ کو تو سمجھ ہی نہیں آئی۔ وہ مزے سے تبصرہ کر رہی تھی ایک ایک چیز پہ۔ دریکتا نے طیب کو بیڈ پہ لٹا دیا۔ اشعر سائرہ کی طرف مڑا۔ ''آؤ سائرہ دوسرے کمرے میں۔ یہاں طیب سو رہا ہے۔ ڈسٹرب ہوگا''۔ یہ الفاظ اُس نے بڑی بے تکلفی سے ادا کیے تھے۔ جیسے سائرہ سے بڑی ذہنی ہم آہنگی ہو۔ دریکتا نے مشکل سے غصہ قابو کیا وہ اُسے کہنا چاہتی تھی طیب ڈسٹرب نہیں ہوگا آپ ہو رہے ہیں میری موجودگی سے۔

پر وہ اُسے بلند آواز میں یہ سب نہ کہہ پائی۔ وہ سائرہ کے ساتھ اپنے دوسرے بیڈ روم میں تھا جہاں اُس کا قیام تھا۔

''دھوکے باز، ڈرامے باز، انسان''۔ وہ بڑبڑا کے رہ گئی۔

شام میں سائرہ جانے لگی تو اشعر نے کچھ اور دیر رُکنے پہ اصرار کیا۔ دریکتا کے تو تلوؤں تک میں آگ لگ گئی۔ جانے یہ سب کیا ہو رہا تھا کیوں ہو رہا تھا۔ اُسے غصہ کیوں آ رہا تھا۔ وہ سائرہ کے ساتھ بات کرتا ہے تو کرے۔ اُسے کیوں اتنی جلن ہو رہی ہے۔ وہ اُسے توجہ کے قابل ہی نہیں تصور کرتی تو کیوں اُسے ذہن پہ سوار کر رہی ہے۔

یہ وہی شخص ہے جس سے میں لاکھ کوشش کے باوجود خلع نہیں لے پائی تھی۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میں مجبوری کی حالت میں اس شخص کے گھر ہوں مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

دریکتا نے خود کو باور کرایا۔ پر کاش یہ آسان ہوتا۔ اُسے سکون نہیں مل رہا تھا۔

طیب تو سو گیا تھا پر اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا۔ ساتھ والے بیڈ روم میں سکون کی نیند سوئے اشعر کو زبردستی اُٹھا دے۔ اُس کا حشر نشر کر دے۔ اُس کا حلیہ تک بگاڑ کے رکھ دے۔ وہ خود کو پہچان ہی نہ پائے۔

پر یہ آسان نہیں تھا۔ وہ کڑیل قد آور نوجوان تھا اور دریکتا میں سچ مچ اتنا دم نہیں تھا جو اُس کا حلیہ بگاڑ سکتی۔

☆☆☆

باسط بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔ اُس کی بات سن کے مائرہ خاموش ہو گئی تھی۔ بالآخر اُسے باسط کی بات ماننا پڑی۔ وہ کہہ رہا تھا ہم دونوں کو اپنا چیک اَپ کروانا چاہیے میں ابھی تک باپ کیوں نہیں بنا ہوں۔ اُس کے ذہن پہ باپ بننے کا بھوت سوار تھا۔

دونوں نے ایک مہنگے اور اچھے ڈاکٹر سے چیک اَپ کروایا۔ اُس کے بعد باسط اُسے ایک اور گائنا کالوجسٹ کے پاس لے گیا۔ وہاں بھی اُن دونوں نے چیک اَپ کرایا۔ پھر لیڈی ڈاکٹر نے اُن دونوں کے مختلف ٹیسٹ کیے۔ اُسی ایک دن میں باسط ایک تیسرے ڈاکٹر کے پاس بھی گیا۔ تینوں ڈاکٹرز مہنگے ترین اور اپنی فیلڈ میں کامیاب تھے۔

مائرہ کو اُس کی دیوانگی سے خوف آ رہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیسا جنون سوار ہو گیا تھا اس پہ۔ اُس نے چند دن کے لیے باسط سے پاکستان چلنے کو کہا۔ خلاف توقع وہ راضی ہو گیا۔ ''چلو وہاں سے بھی دونوں اپنا چیک اَپ کرائیں گے''۔ اُس نے تجویز دی تو مائرہ نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

تینوں ڈاکٹرز نے رپورٹس دینے کے لیے بعد میں بلایا تھا۔ باسط اُسے پاکستان لے آیا۔ ٹیسٹ کی رپورٹس کی بابت جاننے کے لیے وہ فون بھی کر سکتا تھا۔ اس لیے مطمئن تھا۔

☆☆☆

اشعر کا انتظار اُسے بے تابی سے تھا۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے گیٹ کے پاس ٹہل رہی تھی۔ اُس نے شکر ادا کیا جب اشعر کی گاڑی کا مخصوص ہارن بجا۔ چوکیدار گیٹ کھول چکا تھا۔ اشعر نے گاڑی پورچ میں روکی۔ وہ اُس کے قریب پہنچ گئی۔ ''مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے''۔ اُس نے سلام دعا کا تکلف نہیں کیا۔ چھوٹتے ہی بولی۔ اُس کے اضطرابی تاثرات اور اندرونی ہیجان سے سرخ ہوتا چہرا بتا رہا تھا کہ بات اہم ہی ہے۔ ورنہ وہ اس کے انتظار میں یوں گیٹ کے آس پاس چکر نہ لگا رہی ہوتی۔ ''اگر آپ مجھے چینج کرنے کی اجازت دے دیں اور ساتھ میں کچھ کھالوں پہلے۔ پھر اُس کے بعد بات کر لیجیے گا۔ کیا خیال ہے''۔ اشعر نے اپنے یونیفارم کی طرف اشارہ کیا تو دریکتا شرمندہ سی ہو گی۔ ''ٹھیک ہے آپ پھر فارغ ہو جائیں میں بعد میں بات کر لوں گی''۔ وہ اندر کی طرف بڑھ گی۔

اشعر اُس کی ضروری بات کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اُس نے کرنی تھی۔

پہلے اُس نے یونیفارم تبدیل کیا پھر پپا کے ساتھ کھانا کھایا کچھ دیر اُن کے ساتھ گپ شپ کی۔ اتنے میں اُن کے دوست کی کال آ گئی۔ ضروری کام تھا اُسے گھر سے باہر جانا پڑ گیا۔

دریکتا کو بہت غصہ آیا۔ اُسے اب پھر نئے سرے سے انتظار کرنا تھا۔

اشعر کا انتظار کرتے کرتے اُس کی آنکھ ہی لگ گی۔ پھر خود ہی آوازوں سے اُس کی نیند ٹوٹ گئی ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔

وہ پوری طرح بیدار ہو گئی اُسے یاد آ گیا کہ اشعر سے بات کرنی تھی۔ اُس نے کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر پاؤں میں جوتے پہنے۔ طیب بے خبر سویا ہوا تھا۔ وہ دبے قدموں اشعر کے کمرے کے دروازے تک آئی۔ دروازہ لاک نہیں تھا۔ ہاتھ کے ہلکے سے دباؤ سے کھل گیا چوپٹ۔

اشعر یقیناً باتھ روم میں تھا۔ شاور چلنے کی پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی آئی اور صوفے پہ بیٹھ گی۔

کچھ دیر بعد شاور بند ہو گیا۔ اور دروازہ کھلا۔

اشعر ٹراؤزر میں ملبوس شرٹ کے بغیر باہر آیا۔ اُس کے گیلے جسم پہ ابھی ابھی پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ اور سر کے بالوں میں نمی اُسی طرح موجود تھی۔ سینے اور بازوؤں پہ موجود گھنے بال بھی ہنوز گیلے تھے۔

دریکتا کو شرم آ گئی اس حلیے میں اُسے دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا تھا۔ اشعر کو یاد آ گیا کہ دریکتا نے کسی ضروری بات کا کہا تھا۔ تو گویا اُسی بات کے لیے وہ اس وقت اُس کے پاس آئی تھی۔ ''خیریت'' وہ گیلے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتا اُس کے پاس ہی صوفے پہ ٹک گیا۔ دریکتا پچھتانے لگی۔ صبح بات کر لیتی تو اچھا تھا۔

"آپ نے شام میں کسی ضروری بات کا کہا تھا۔ مجھے کام سے جانا پڑ گیا۔ خیر آپ بات کریں"۔ وہ اُسے تولتی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ "میں صبح بات کرلوں گی آپ آرام کریں"۔

اُس کی ہتھیلیوں میں پسینہ اُتر آیا وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اشعر نے اُس کا ہاتھ پیچھے سے پکڑ لیا۔ وہ گرتے گرتے بچی۔ اشعر کی مضبوط مردانہ گرفت اُس کے حواس معطل کرگئی۔ "بات کریں جو ہے"۔ وہ شائد اُس کی نروس نیس کی وجہ جان گیا تھا۔ وارڈ روب سے شرٹ نکال کے پہنی اور پھر اُس کی طرف آیا۔ گھڑی کی ٹک ٹک دریکتا کو اپنی دھڑکنوں کی طرح کانوں میں گونجتی محسوس ہورہی تھی۔ اتنی خاموشی سی طاری تھی۔ کچھ کہتی بولتی، رازان سنے بھید کھولتی۔ کچھ تو تھا اس خاموشی میں۔ جو دریکتا دھڑکنوں کے شور سے گھبرا گئی تھی۔

اُس کی سوچوں میں انقلاب آرہا تھا۔

خوشگوار انقلاب۔

☆☆☆

باسط نے یہاں بھی مختلف ڈاکٹرز سے اپنا اور مائرہ کا چیک اَپ کرایا۔ جس تواتر سے وہ ڈاکٹرز کے پاس خود بھی جارہا تھا اور مائرہ کو بھی لے کے جارہا تھا۔ اُس سے نہ جانے کیوں بینا پریشانی محسوس کررہی تھی۔

اُس نے دو جگہ سے رپورٹس اور مختلف ٹیسٹ کی بابت معلوم کرایا تھا۔ دونوں جگہ سے ایک ہی بات علم میں آئی تھی کہ بظاہر مائرہ، جوان اور تندرست ہونے کے باوجود بھی ماں نہیں بن سکتی۔

آج اُس نے ایک اور ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ یہ مشہور گائناکالوجسٹ فرخندہ امین تھی۔ اُس نے مائرہ کے ساتھ باسط کو بھی بلوایا تھا۔

اب وہ دونوں اُن کے سامنے بیٹھے تھے۔ مائرہ اور باسط کی رپورٹس ٹیبل پہ موجود تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر فرخندہ نے بتایا تھا کہ پہلے بچے کی پیدائش کے بعد مائرہ میں ایک اندرونی پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ اب وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ پھر بھی اُس نے باسط اور مائرہ کا دل رکھنے کے لیے کہا کہ آپ نا اُمید نہ ہوں۔ دعا کرتے رہیں شاید کوئی معجزہ رونما ہوجائے۔

باسط خالی خالی نگاہوں سے ڈاکٹر فرخندہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے اُسے یقین نہ آرہا ہو۔

ڈاکٹر فرخندہ نے اگلے مریض کو بلایا تو باسط کے ساتھ مائرہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

گاڑی کا دروازہ کھول کے باسط ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا تو اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اُس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ مائرہ ڈر گئی تھی کہ کہیں وہ کوئی حادثہ ہی نہ کر بیٹھے۔ لیکن وہ خیریت سے گھر پہنچ گئے۔

بینا اُن کا انتظار کررہی تھی۔ "کیا کہا ڈاکٹر نے"۔ اُس نے بے تابی سے پوچھا تو جواباً باسط نے مائرہ کی رپورٹس اُن کی طرف بڑھا دی اور خود اندر بڑھ گیا۔ مائرہ اتنی دیر سے برداشت کررہی تھی۔ اب سب برداشت اور صبر کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ اُن کے گلے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کے روئی۔ "خالہ میں اب ماں نہیں بن سکتی کبھی بھی۔ باسط کو وہ خوشی نہیں دے سکتی جسے وہ میرے وجود میں تلاش کررہا ہے۔ میں بنجر دھرتی ہوں"۔

بینا کے آنسو بھی بہنے لگے۔ کچھ بھی سہی۔ باسط کے حوالے سے وہ بھی کسی خوشخبری کے انتظار میں تھی۔ مائرہ اس کے بعد کمرے میں جا کے لیٹ گئی۔ بیڈ کے دوسرے سرے پہ باسط لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ سانسوں کی سرسراہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مائرہ کا جی چاہ رہا تھا باسط کے گلے لگ کے اتنا روئے کہ اُس کا سارا وجود تک بھیگ جائے۔ پر وہ اجنبی بنا ہوا سو رہا تھا۔

یہ مائرہ کا خیال تھا کہ باسط سو رہا ہے۔

وہ سو نہیں رہا تھا۔ اُس کے بے آواز آنسو بھی اُس کے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کو نہیں روک سکے تھے۔ اُس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل بھی جل رہا تھا اور اس آگ میں سب کچھ راکھ ہو رہا تھا۔ مائرہ کے ساتھ عشق محبت، زندگی بھر کے وعدے قسموں کے بھرم سب کچھ ختم ہو رہا تھا۔

اپنی اپنی جگہ پہ وہ دونوں ہی ختم ہو رہے تھے۔

☆☆☆

اندرونی کشمکش اور اس جذباتی صدمے نے مائرہ کو ہاسپٹل پہنچا دیا۔ اُسے شدید قسم کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔

باسط چند گھنٹے مارے بندھے وہاں اُس کے پاس رُکا اور پھر دوبئی جانے کی خوشخبری سنا کر گھر آگیا۔ اُسے پیکنگ کرنی تھی۔ مائرہ اُس کے ساتھ نہیں جارہی تھی وہ اکیلا ہی تھا۔ وہ مائرہ کو عام سے انداز میں بتا کر اور مل کر رخصت ہوا۔ اُس میں گزشتہ پُر جوش وارفتگی ندارد تھی۔ جس کا تجربہ مائرہ کو دوبئی میں اُس کے ساتھ ہوا تھا۔ مائرہ کا احساس زیاں کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

دُکھ کے اتھاہ سمندر میں اکیلا چھوڑ کر باسط چلا گیا۔ وہ اکیلی تھی۔ اپنی بے بسی اور تنہائی پہ اُس نے کتنے ہی آنسو چپکے چپکے خاموشی سے دل میں اُتار لیے۔

بینا خالہ اُس کے ساتھ تھی پر پھر بھی اُس کی تنہائی حد سے سوا تھی۔

☆☆☆

طلاق کے پیپرز باسط کے سامنے پڑے تھے۔

دوبئی واپس آتے ہی اُس نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا۔ سائن کر کے اُس نے پیپرز دوبارہ لفافے میں ڈال دیئے۔

مائرہ سے علیحدگی کا فیصلہ کرتے ہوئے اُسے دکھ تو ہوا تھا مگر اب اُس کے فیصلے میں کسی بھی تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی۔ اُس نے خوب سوچ سمجھ کے اور خود کو مزید کرب واذیت سے بچانے کے لیے یہ انتہائی اقدام کیا تھا۔

مائرہ کے ماں نہ بننے کا جان کر اُس کا کرب حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔

اُس نے محبت کو پانے کے لیے مائرہ سے شادی تو کرلی پر اس احساس سے پیچھا نہ چھڑا سکا کہ مائرہ شاہ زیب کی تنہائیوں اور قربتوں کی ساتھی رہی ہے۔ یہ احساس اُس کا دل چیرتا تھا کچوکے لگاتا تھا اندر ہی اندر مارتا تھا۔ مائرہ کو پانے کے بعد بھی اُس کی پیاس اُدھوری تھی اُس کا وجود اُدھورا تھا۔ مائرہ اُس کی بھرپور جذباتی قربت کے بعد بھی اُسے باپ نہ بنا سکی۔ وہ خود اُدھوری عورت تھی۔ جسے شاہ زیب نے مکمل کیا تھا۔ اور مرنے کے بعد اپنی نشانی اُس کی گود میں اُس کی کوکھ میں چھوڑ گیا۔ اور مائرہ اُسے کچھ بھی نہ دے سکی۔ سب کچھ تو اُس نے پہلے ہی شاہ زیب کو دے ڈالا تھا۔ باسط کے مقدر میں صرف آبلہ پائی اور تشنہ لبی تھی۔

مائرہ اور شریں خالہ کا جرم ناقابل معافی تھا۔

اُس نے مائرہ کو شادی کے بعد طیب کے ساتھ ہر قسم کے تعلق سے منع کر دیا تھا۔ وہ پھر بھی اُسے لے کر ڈاکٹر کے پاس گی۔

جب وہ ناراض ہوا تو شریں خالہ اُن کے گھر لڑنے پہنچ گئیں۔ ورنہ وہ حقیقت اُس پہ کبھی نہ کھلتی کہ بینا اُس کی سگی ماں نہیں ہے۔

اس زہریلے سچ نے اُسے پہلی بار رُلایا تھا اور دوسری بار وہ ڈاکٹرز کی رپورٹس دیکھ کے رویا۔

مائرہ کے ساتھ وہ مزید نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر وہ ماں بن جاتی تو شاید وہ اُس کے ساتھ زندگی گزار ہی دیتا لیکن اب ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ مائرہ کے ساتھ وہ ویسے بھی تو ایک اذیت مسلسل میں تھا۔ شریں خالہ نے نادانستگی میں جو کڑوا سچ بولا تھا وہ باسط کو اُن سے بہت دور لے گیا تھا۔ کاش وہ اس سچ سے آگاہ نہ ہوتا یونہی بے خبری میں زندگی گزر جاتی۔

مائرہ کے ساتھ ساتھ شریں خالہ کو بھی تو سزا ملنی چاہیے تھی۔

وہ کون سا اُس کی سگی خالہ تھی۔ مائرہ کی ماں تھی۔ اور مائرہ اب اُس کے لیے پرائی ہو گئی تھی۔ صرف ایک اجنبی عورت۔

اب باسط کا اُس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا۔

☆☆☆

کوریئر دوپہر میں وہ لفافہ دے گیا تھا۔ بینا نے ٹیبل پہ رکھ دیا اور مائرہ کو آواز دے کے دیکھنے کے لیے کہا۔ وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ بینا خالہ کے بلانے پہ اُن کی طرف آ گئی۔ اُنہوں نے ٹیبل پہ پڑے لفافے کی طرف اشارہ کیا۔

"دیکھ لو پتہ نہیں کہاں سے آیا ہے کس نے بھیجا ہے"۔ اُن کے لہجے سے ہی لفافے سے متعلق اُن کی عدم دلچسپی ظاہر ہو رہی تھی۔

مائرہ نے اُلٹ پلٹ کے دیکھا۔ یہ اسی کے نام تھا اور باسط کی طرف سے آیا تھا۔ وہ وہیں کرسی گھسیٹ کے بیٹھ گئی۔ انجانے وسوسوں اور خیالات سے اُس کا دل کانپ رہا تھا۔ جانے اس لفافے میں کیا تھا جو باسط نے بھیجا تھا۔ اُس کی خاموشی سے بینا بھی اُس کی طرف متوجہ ہو گی۔ "کیا ہے کس نے بھیجا ہے؟"۔ "پتہ نہیں کھول کے دیکھتی ہوں"۔ اُس کے خیالات اس سمے جانے کہاں جا رہے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ اندر موت کا پروانہ تھا اس کے لیے۔ باسط نے بڑی بے دردی سے اُسے اپنی زندگی سے علیحدہ کر دیا تھا۔

وہ تیورا کے اُدھر ہی گری۔

بینا کو ہاتھ پاؤں پڑ گئے۔ اُس نے مشکل سے مائرہ کو سیدھا کیا اور گھبرا کے سب کو زور زور سے آوازیں دینے لگی۔ سب سے پہلے حمزہ اور ایاز باہر نکلے۔ بینا اور ایاز نے مائرہ کو اُٹھا کے کاؤچ پر لٹایا۔ بینا پانی لے آئی۔ اور مائرہ کے منہ پہ چھینٹے مارے۔ "ہوا کیا ہے"۔ حمزہ پریشانی سے بولے۔ "کوریئر کوئی لفافہ دے گیا تھا میں نے کہا دیکھو کس کا ہے۔ اس نے کھولا۔ دیکھا اس کے بعد سے یہ حالت ہے اس کی"۔ "کہاں ہے لفافہ"۔ "وہ ٹیبل پہ ہے"۔ بینا نے اُٹھا کے پہلے خود دیکھا تو اُسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔ لفافہ پیپرز سمیت اُس کے ہاتھ سے گر گیا۔

حمزہ نے اُٹھایا۔ مائرہ کی طلاق کے کاغذات اُن کا منہ چڑا رہے تھے۔

مائرہ کی بے ہوشی کا راز اسی لفافے میں بند تھا۔ طلاق کے کاغذات کے ساتھ ایک چھوٹا سا خط بھی تھا۔ حمزہ نے وہ بھی پڑھ لیا۔

باسط کو آخر کار پتہ چل گیا تھا کہ بینا اُس کی سگی ماں نہیں ہے۔ شریں کا انجانے میں کھولا گیا راز اُن کے ساتھ ساتھ اُن کی لاڈلی بیٹی کی زندگی کو بھی تباہ کر گیا تھا۔ حمزہ نے خط پڑھنے کے بعد پرزے پرزے کر دیا۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی اور بھی یہ خط پڑھے اور باسط کے دُکھ سے آگاہ ہو۔ جن کو پتہ نہیں تھا اُن کا لاعلم رہنا ہی بہتر تھا۔

باسط نے اگر شور نہیں مچایا تھا تو اُنہیں بھی خاموش رہنا چاہیے تھا۔

جو ہونا تھا۔ ہو گیا تھا۔ وقت سے نکلا تیر کمان میں واپس نہیں آ سکتا تھا۔

☆☆☆

عمر زیب آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہے تھے۔ طاہر لغاری اُنہیں دیکھنے گئے تو اب بار انہوں نے کچھ باتیں بھی کیں جن میں ہوش مندی کا تاثر واضح تھا۔

دوسری بار دریکتا بھی اُن کے ساتھ گئی۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا۔ وہ طیب کو بھی ساتھ لے کے جائے۔ پر طاہر انکل نے اُسے آرام سے منع کر دیا۔ دریکتا نے دوبارہ ضد نہیں کی۔ طیب کی حرکتیں دن بہ دن بہت پیاری ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے آہستہ قدم اُٹھانے شروع کر دیئے۔ اُس کی چال میں ڈر اور خوف نہیں تھا۔ وہ توتلی زبان میں ماماما کی گردان بھی کرتا تب دریکتا کو اُس پہ ٹوٹ کے پیار آتا۔ وہ چیزوں کو ہاتھ میں پکڑنے کی کوشش کرتا۔ پالتو طوطوں کو دیکھ کے خوش ہوتا ہوا میں ٹانگیں چلاتا قلقاریاں مارتا۔ اُس کی سب معصوم حرکتیں دل موہ لینے والی تھی۔

☆☆☆

اشعر بڑی دیر سے بیدار ہوا۔ چھٹی کا دن تھا وہ جی بھر کے سویا تھا۔ کسی نے ڈسٹرب بھی نہیں کیا تھا۔ اُس کی آنکھ خود ہی کھلی۔ اُس نے بیڈ سے اُتر کے گلاس ونڈو سے پردے ہٹائے تو خوشگوار دھوپ کی کرنیں کمرے میں در آئیں۔ سامنے لان کا منظر واضح تھا۔ پپا کرسی پہ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ دریکتا نیچے گھاس پہ بیٹھی طیب کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا گر جاتا پھر گرتا پھر اُٹھتا۔ دریکتا تالیاں بجا کے اُس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔

اشعر بھی نیچے لان میں آ گیا۔

"وہ طاہر لغاری کے پاس بیٹھ گیا وہ اُس کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ اشعر کی توجہ طیب کی طرف تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کی طرف آنے لگا۔ دریکتا اُس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اشعر نے آگے بڑھ کر طیب کو گود میں اُٹھا لیا"۔

وہ اُس کے پاس آ کے خوش تھا۔ اُس کی شرٹ کے بٹنوں اور ریسٹ واچ کو بار بار چھیڑ رہا تھا۔ کبھی اُس کے بال پکڑ لیتا اور کبھی اپنی چھوٹی اُنگلی اُس کی آنکھوں میں گھسیڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اشعر اُس کی شرارتوں اور معصوم حرکتوں کو انجوائے کر رہا تھا۔

دریکتا بھی اُن کے پاس آ کے بیٹھ گئی۔ طیب اب اُس کی گود میں جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میرے کپڑے نکال دو اور پھر ناشتہ بنواؤ۔ پہلے میں فریش ہو لوں"۔ اشعر کا مخاطب سو فیصد دریکتا ہی تھی۔ لہجے میں شوہرانہ تحکم بڑا واضح تھا۔ طاہر انکل سامنے بیٹھے تھے ورنہ وہ جی بھر کے حیران ہوتی۔ لیکن اب تو اُس نے حیران ہونا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کہ وہ طاہر انکل کے سامنے ہی تو "شوہریت" جتاتا تھا۔

وہ اپنی بات کرنے کے بعد منتظر تھا کہ کب حکم پہ درآمد ہوتا ہے۔

''آپ طیب کو دیکھیں میں جاکے نکالتی ہوں کپڑے''۔ وہ بھی بڑے گھریلو انداز میں بولی۔ اشعر کا کمرا اوپر والے پورشن میں تھا۔

اُس کے ساتھ ہی اشعر کا پرانا بیڈروم تھا جو اب دریکتا اور طیب کے استعمال میں تھا۔ اُس کے کپڑوں کی الماری اپنے بیڈروم میں ہی تھا جہاں وہ تا حال مقیم تھا۔

دریکتا نے ایک پینٹ شرٹ جو سامنے نظر آئی نکال دی۔ وہ بھی طیب کو بازوؤں میں جھلاتا پیچھے آگیا۔ دریکتا نے کپڑے بیڈ پہ رکھ دیئے۔ ''میچنگ ٹائی اور موزے بھی نکال دو''۔ اُس کا لہجہ سادہ اور آپ جناب کے تکلف سے مبرا تھا آج اس بار اُسے سچ مچ حیرت ہوئی۔ ایک کونے میں ٹائیاں اور موزے ترتیب سے رکھے تھے۔ اُس نے اپنی پسند سے ایک ٹائی اور موزوں کا جوڑا الگ کر دیا۔ اُس کا کام مکمل ہوگیا تھا۔

دریکتا نے طیب کو لینے کے لیے بازو آگے بڑھائے۔

طیب اشعر کے ساتھ سختی سے چمٹ گیا۔ اُس کا موڈ نہیں تھا دریکتا کے پاس جانے کا۔ تب ہی وہ اشعر کے سینے میں منہ چھپانے لگا۔ وہ جھنجھلا سی گئی۔ ''طیب میں کہتی ہوں میرے پاس آؤ''۔ اُس نے طیب کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ پر وہ شرارت کے موڈ میں تھا۔ اُس نے اشعر کی شرٹ مضبوطی سے پکڑ لی۔ ''آپ تو ہمارے پاس آتی نہیں ہیں۔ مگر یہ میری محبت کو پہچان گیا ہے تب ہی تو دامن نہیں چھڑوا پا رہا ہے''۔ اشعر کا لہجہ اور مسکراہٹ بلا کی معنی خیز تھی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور چہرے سے نادیدہ پسینے کے قطرے صاف کرنے لگی۔ طیب کو شاید خود ہی اُس کی حالت زار پہ رحم آگیا اب اُس کی طرف بازو بڑھا رہا تھا۔

''جاؤ طیب''۔ اشعر نے بازو کھولے اور اُسے بیڈ پہ بٹھا دیا۔ دریکتا نے اُسے اُٹھایا اور باہر جانے کے لیے پلٹی۔ اشعر آگے راستے میں حائل تھا۔ طیب پھر اُس کی طرف جانے کے لیے مچل رہا تھا۔ دریکتا کو جانے کیوں طیب پہ غصہ آگیا۔ ''طیب آرام کرو''۔ طیب صاحب پہ اُس کے نرم لہجے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مزے سے دوبارہ اشعر کے پاس چلا گیا۔ ''آپ جائیں میں اپنے بیٹے کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔ ناشتہ بنوائیں۔ میرے لیے''۔ اشعر نے اُسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا پر دریکتا خوشگوار حیرت میں گھری ہوئی تھی۔ اشعر کا جملہ نظر انداز کرنے والا نہیں تھا میں اپنے بیٹے کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔

اُس کے لب مسکرانے والے انداز میں کھل گئے۔ ایک سرمستی کی حالت میں سیڑھیوں سے نیچے اُتری۔ اُس کا تو انگ انگ جیسے جھوم اُٹھا تھا اور دل ایک ہی جملے کی گردان کر رہا تھا۔ ''میں اپنے بیٹے کے ساتھ کھیل رہا ہوں''۔

اشعر کی سمت جانے والے راستوں کا فاصلہ اور بھی کم ہو رہا تھا۔

''یہ تو بہت ہی اچھا ہے نیک دل شہزادے کی طرح''۔ اُس کے دل نے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔

☆☆☆

ایسے ٹوٹے ہیں تمناؤں کے پندار کہ بس
میں نے جھیلے ہیں محبتوں میں وہ آزار کہ بس
اک دھماکے میں زمانے میرے ہاتھ سے گئے۔

اُس قدر تیز ہوئی وقت کی رفتار کہ بس
کل بھی صدیوں کی مسافت سے پرے تھے دونوں
درمیاں آج بھی پڑتی ہے وہ دیوار کہ بس

مائرہ کھڑکی والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کتنی دیر سے بیٹھی تھی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ باہر بہت رونق اور شور تھا۔ ہنسی مذاق، قہقہے، باتوں کی آوازیں، دنیا کی رنگینیاں سب کچھ ہی تو تھا۔

اگر کچھ اُجڑا تھا کہیں کوئی تبدیلی آئی تھی تو وہ صرف اور صرف اُس کے خیالات میں۔ ورنہ باقی دنیا ویسی کی ویسی ہی تو تھی۔

اُس کا ہنسنا بولنا سب ختم ہوگیا تھا۔ ایک اُداسی اور کرب تھا جس نے دل میں ڈیرے ڈال لیے تھے۔

شریں اور اورنگزیب کے لیے جوان بیٹی کے دوسری بار اُجڑنے کا صدمہ بہت بڑا تھا۔ اورنگزیب تو بیمار پڑ گیا تھا۔ شریں مائرہ کو دیکھ دیکھ کے روتی۔ وہ بجھ کے رہ گئی تھی۔ وہ خوشگوار ہنسی، وہ تازگی اور اُس کی شخصیت کا جادو سر چڑھ کے بولتا تھا سب ماضی کا حصہ بن کے رہ گیا تھا۔

شریں مائرہ کی طلاق کے بعد بہن اور بہنوئی سے لڑنا چاہتی تھی اُن سے جواب طلب کرنا چاہتی تھی جو کچھ باسط نے اُس کے ساتھ کیا تھا۔ پر مائرہ نے روک دیا تھا۔ لڑائی کرنے سے جھگڑنے سے جانے والے کارواں پلٹ نہیں سکتے تھے۔ اُس کے پاس بھی تو ماتم کرنے کے لیے کچھ ہونا چاہیے تھا۔

مائرہ کے سامنے آئینہ تھا۔ اُس آئینے میں سب کچھ واضح تھا۔

شاہ زیب کے ساتھ شادی، اُس کی والہانہ محبت، باسط کے ساتھ زندگی کا دوسرا دور، باسط کی دہری شخصیت اُسے ذہنی اذیت دینا اور بالآخر محبتوں کی حد۔

اُس نے شاہ زیب کی قدر نہیں کی۔ اور باسط نے اُسے قدر کے قابل نہیں جانا۔

مکافاتِ عمل کتنا مکمل اور واضح تھا۔

اُس میں کہیں کوئی جھول اور کمی نہیں تھی۔

انصاف تک مکمل تھا۔

☆☆☆

طاہر انکل اور اشعر ان دنوں بڑی باقاعدگی کے ساتھ عمر زیب کو دیکھنے ہاسپٹل جا رہے تھے۔ اشعر نے دریکتا کو کبھی بھی ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہا۔

دریکتا کو طاہر انکل سے بڑی شکایتیں تھیں۔ ویسے تو وہ اُسے بہت چاہتے تھے بالکل لائبہ اور ثمرہ آپی کی طرح۔

لیکن ایک پھانس اُس کے دل میں گڑی ہوئی تھی۔ اشعر اُسے کتنی اہمیت دے رہا تھا کیا کر رہا تھا کیا سمجھ رہا تھا سب کچھ طاہر انکل کے علم میں تھا اس کے باوجود انہوں نے کبھی اشعر سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی اُسے سمجھایا تک نہیں کہ تم بیوی کو بیوی کا مقام دو۔ وہ اتنے بچے تو نہیں تھے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے انجان بنے ہوئے تھے۔ اُن کے اعلیٰ درجہ کی بے حسی پہ دریکتا کو ان دنوں بہت غصہ آنے لگا تھا۔

اشعر کا بیڈروم علیحدہ تھا کیا یہ اُنہیں نظر نہیں آتا تھا؟

جانتے بوجھتے یہ خاموشی کیا معنی رکھتی تھی۔
وہ منفی انداز میں سوچنے پہ مجبور ہو رہی تھی۔
نہ جانے ایسا کیوں تھا؟

☆☆☆

مائرہ خاموش بیٹھی تھی شریں کتنی دیر سے سمجھا رہی تھی کہ ہنسا بولا کرو۔ جو ہوا بھول جاؤ۔ تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ اس غم کو سینے سے لگا کے کب تک بیٹھی رہو گی؟"

"امی کیسے بھول جاؤں سب کچھ۔ میں ماں بھی نہیں بن سکتی۔ جس وجہ سے مجھے باسط نے چھوڑا ہے"۔ وہ دھیرے دھیرے پھر سے سلگنے لگی کسی شمع کی مانند۔

"تم بانجھ تو نہیں ہو۔ طیب کو جنم دیا ہے تم نے۔ اولاد ہے تمہاری۔ حقیقت ہے وہ جا کے لے آؤ اُسے۔ تمہاری اپنی سگی اولاد ہے۔ اُس میں کھو کے بھول جاؤ گی سب کچھ"۔

شریں اس وقت پرانی باتیں بھول گئی تھی۔ اُسی نے مائرہ کو طیب کے زیادہ قریب نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ روتا رہتا ماں کی آغوش کے لیے۔ کبھی ذہین اور کبھی دریکتا کی گود میں ہوتا۔ مائرہ نے تین چار دن کے علاوہ اُسے کبھی اپنے پاس تک نہیں سلایا۔ اُسے خود فیڈ بھی نہیں کروایا۔

اب شریں اُسی طیب کو واپس لانے کے لیے کہہ رہی تھی۔
مائرہ کا دل خود تڑپ رہا تھا۔
طیب کی محبت ٹھاٹھیں مار رہی تھی دل کے سمندر میں
پر اُسے کس منہ سے واپس لاتی؟

سائرہ نے طیب کی سالگرہ کا آنکھوں دیکھا حال اُسے سنایا تھا جو دریکتا نے چند ماہ پہلے منائی تھی۔ وہ طیب کی صحت مندی، اُس کی خوب صورت حرکتوں، معصوم شرارتوں کا تذکرہ کرتی تو مائرہ کا دل طیب کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے مچل مچل جاتا۔

زندگی کتنی بے رنگ اور بوجھل تھی۔
طیب اُس کے پاس آ جاتا تو زندگی پھر سے خوبصورت اور اُمنگوں سے بھرپور ہو جاتی تھی۔
مائرہ کو اس بات کا مکمل یقین تھا۔

اب رات کی تنہائیوں میں طیب کے معصوم وجود کی کمی اُسے بُری طرح محسوس ہوتی۔ طیب کے چھوٹے چھوٹے بازو اُسے اپنے گرد لپٹے محسوس ہوتے تو خوشی ہی خوشی اُس کے وجود میں اُتر جاتی۔

☆☆☆

اَن کہی کو سن لینا
اَن لکھے کو پڑھ لینا
چاندنی کے رستوں پہ منزلوں کو پا لینا
کھیل ہیں رفاقت کے یا کہ یہ محبت ہے

اک ادا پہ مر جانا
سب جہاں سے لڑ جانا
اک بار ملنا اور
اُنگلیوں کا کٹ جانا
یوسفوں کی بدنامی
یا کہ یہ محبت ہے
چاند بے حجاب آنا
ساحلوں پہ لہروں کا
پتھروں سے ٹکرانا
انتظامِ قدرت ہے
یا کہ یہ محبت ہے
اک نحیف لمحے کا زندگی پہ چھا جانا
اس بہار موسم کا
عین ہجر میں آنا
وقت کی شرارت ہے
یا کہ یہ محبت ہے
بوئے گل بکھر جانا
باغ کا نکھر جانا
بعد بارش برسات آسماں پہ قطروں کا
قوس ایک دھر جانا
شوخی سفارت ہے
یا کہ یہ محبت ہے
سفر واپسی پہ جب
فصلِ گل روانہ ہو
اس کے غم میں
پتوں کا ٹوٹ کے بکھر جانا
پیڑ کی سخاوت ہے
یا کہ یہ محبت ہے
یا کہ یہ محبت ہے

اشعر طیب کو بازوؤں میں لیے ہوا میں اُچھال رہا تھا۔

درکتا صوفے پہ بیٹھی بڑی محویت سے اُن دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے اشعر خود طیب کو اُس کے پاس سے اُٹھا کے لے گیا تھا۔ طیب کی قلقاریاں اُس کی بے پناہ خوشی کا مظہر تھیں۔

اشعر اُسے درکتا کے پاس چھوڑنے آیا تو اُس نے دوبارہ اشعر کے پاس جانے کی ضد شروع کر دی۔

اُسی دن والا حساب تھا وہ اُس کے سینے سے لپٹ گیا تھا۔

''میں اسے اپنے بیڈروم میں لے کے جا رہا ہوں۔ جب سو جائے تو اپنے پاس لے آیئے گا''۔ اشعر طیب کو اُٹھائے اُس کے پاس سے گزرا تو درکتا کو رونا آ گیا۔ ''میرا کسی کو کوئی خیال ہی نہیں ہے میں کس کے پاس جا کے شکایت کروں۔ آخر مجھے کیوں اتنا دُکھ ہوتا ہے۔ جب اشعر لغاری مجھے اگنور کرتا ہے۔ تایا اورنگزیب، تائی شریں اور میرے خاندان کے کچھ اور لوگ اشعر کا امیج کچھ اور ہی بناتے رہے۔ نہ یہ جارحیت پسند ہے اور نہ انتقامی مزاج رکھتا ہے اور نہ ہی میں نے ابھی تک اس میں کوئی آوارہ مزاجی دیکھی ہے۔ نہ ہی عیاش طبع ہے (سائرہ خود دلچسپی لیتی ہے مرتی ہے اس پہ) درکتا نے دلیل بھی ڈھونڈ رکھی تھی۔''

تو پھر سب کیوں ہے ایسا۔ کیوں اشعر کے غلط امیج کو میرے سامنے پیش کیا گیا تا کہ میں برگشتہ ہو جاؤں۔ وہ خلع بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ کل رات ہی تو طاہر انکل نے اُسے کتنی حقیقتوں سے آگاہ کیا تھا۔

شاہ زیب کے کاروبار کی عاشر اور تایا اورنگزیب کے ہاتھوں تباہی۔

عمر زیب کے کاروبار اور حسابات میں گڑبڑ۔ اُس کے بنک اکاؤنٹ کا خالی ہونا۔ اُسے اور عمر زیب کو منظر سے ہٹانے کے لیے گاؤں بھیج دینا۔ اور عمر زیب کی صحت اور پھر اشعر لغاری کی فرضی فائرنگ کو جواز بنانا۔

مائرہ کے گھر کی نیلامی۔

عمر زیب کے وفادار ملازموں کو کاروبار سے الگ کرنا۔

اُسے اشعر لغاری سے خلع دلوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا۔

عاشر بھائی اور شریں تائی کی معنی خیز باتیں۔

سائرہ کا اظہار افسوس اور طنزیہ انداز گفتگو۔

عمر زیب کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے سے کترانا۔

سب کچھ واضح تھا۔

طاہر لغاری نے کم و بیش سب کچھ اُسے بتا دیا تھا۔

غم و غصے کا ایک طوفان اُسے ساتھ بہا لے جانے کے لیے بے قرار تھا۔

اُس کی نگاہوں کے سامنے سے کتنے پردے سرکے تھے۔ اس روشنی میں پردوں کے ہٹنے کے بعد سب کچھ نظر آ رہا تھا۔

ان میں اشعر لغاری بھی واضح تھا۔ اور اُسے وابستہ وہ مبہم سا جذبہ بھی اپنا آپ منوا رہا تھا۔ شور مچا رہا تھا۔ احتجاج کر رہا تھا۔ زور و شور سے ایک ہی بات کر رہا تھا کہ یہی تو محبت ہے۔ اب تو دل کے دروازے کھول دو۔ اب کا ہے کا ڈرنا۔ اب کیسا شرمانا۔ کھل کے اقرار کر لو۔ مگر نہیں۔ ابھی نہیں۔ وہ اُسے نظر انداز کیوں کرتا ہے۔ گریزاں کیوں ہے اور طاہر انکل

بھی کچھ نہیں لیتے اپنے لاڈلے سپوت کو۔ پہلے وہ سارے سوالوں کے جواب حاصل کرے گی۔ اس کے بعد ہی بہاروں کی وادی میں قدم رکھے گی۔

وہ اتنی گئی گزری نہیں ہے۔

اشعر لغاری کو بھی تو معلوم ہونا چاہیے۔

☆☆☆

مائرہ شریں اور اورنگزیب کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکی تھی۔ ''میں طیب کو درکتا سے لے آؤں گی۔ نوید اور ہارون چچا بتا رہے تھے کہ عمر چچا صحت یاب ہو رہے ہیں۔ میں اُن کے پاس جاؤں گی اور اپنے گھر میں طیب اور عمر چچا کے ساتھ رہوں گی۔ میں اپنی غلطیوں کی تلافی کروں گی۔ میں نے سب کچھ کھو دیا ہے کچھ محبتیں بچی ہیں۔ اُنہیں کھونے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے۔ میرا گھر خالی کروا دیجیے ابو۔''

مائرہ اورنگزیب سے مخاطب تھی۔ اُن کا چہرا زرد پڑ گیا تھا کہ مائرہ کو سچائی سے کیسے آگاہ کریں۔ وہ گھر اُنہوں نے نیلام کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ اسے میں نے کرائے پہ دے دیا ہے۔ مائرہ کو ابھی تک یہی خوش فہمی لاحق تھی کہ وہ شاہ زیب کے چھوڑے ہوئے کاروبار کی مالک ہے۔

اورنگزیب سر جھکائے شرمندہ شرمندہ سے بتا رہے تھے۔ وہ مائرہ سے آنکھیں نہیں ملا پا رہے تھے۔ مائرہ کو اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابو اُس کے ساتھ بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ عمر چچا اور درکتا کی جائیداد پہ قبضہ کرنے کا پلان اُس کے سامنے ہی تو بنا تھا۔ پر ابو اور عاشر بھائی اُس کی جائیداد بلکہ شاہ زیب کی چھوڑی ہوئی جائیداد کے ساتھ ایسا کر چکے تھے۔ سگے رشتوں پہ اندھا اعتبار تھا اُسے۔ کس بُری طرح یقین ٹوٹا تھا۔ ابھی تو باسط کے لگائے ہوئے زخم بھی نہیں بھرے تھے۔ انہوں نے اُسے بالکل خالی ہاتھ کر دیا تھا۔

اُسے درکتا کا خیال آیا۔ اُس نے بھی تو تایا اورنگزیب پہ۔ اپنوں پہ اندھا اعتبار کیا تھا۔ اُس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ مائرہ کو وہیں سے سبق لینا چاہیے تھا۔ درکتا تو اورنگزیب کے بھائی کی بیٹی تھی۔

پر مائرہ تو اورنگزیب کی اپنی بیٹی تھی۔

بیچ دریا میں اُس کا سفینہ ڈوبا تھا۔

کچھ بھی تو نہیں بچا تھا۔

اورنگزیب اور شریں تو آنکھیں ہی نہیں ملا پا رہے تھے اپنی سگی اولاد تک سے۔ مائرہ کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ سرد مہری تھی۔

وہ اب ایک پل بھی حویلی میں رہنے کی روادار نہیں تھی۔

وہ اپنے پرانے ٹھکانے پہ لوٹنا چاہتی تھی۔

طیب اور عمر چچا کے پاس۔

آج بڑے دنوں بعد اُسے اپنا احتساب کرنے کا موقع ملا تھا۔

وہ شاہ زیب کی قبر پہ جا کے دل کھول کے روئی۔

مٹی میں مٹی ہوئے شاہ زیب سے معافی مانگی۔

پر آنسوؤں سے یہ آگ کہاں بجھنے والی تھی۔

پچھتاوے سے زندگی بھر کی ندامت کہاں ختم ہونے والی تھی۔

وہ شاہ زیب کی موت کی اپنی خوشگوار زندگی کے خاتمے کی، اپنے جگر کے ٹکڑے کو خود سے خود ہی دور کرنے کی ذمہ دار تھی۔

مائرہ بری طرح رو رہی تھی۔

ڈوبتا سورج بھی اُس کے ساتھ شرمندہ تھا۔

☆☆☆

مائرہ دریکتا کے پاس جانے کے لیے تیار تھی۔

وہ اکیلی ہی جا رہی تھی۔ شریں شرمندہ تھی پر وہ بھی اُس کے ساتھ جانا چا رہی تھی اکیلے میں دریکتا کا سامنا کرنا اُس کے لیے محال تھا۔ مائرہ کے ساتھ اُسے بھی کچھ حوصلہ مل جاتا۔ وہ گاڑی میں اُس کے ساتھ بیٹھی تو مائرہ عدم توجہی کا مظاہرہ کرتی رہی۔

وہ شریں کی طرف دیکھ تک نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

عمر چچا کا گھر خالی پڑا تھا۔ بہت اجنبی اور پرایا پرایا سا لگ رہا تھا۔ اورنگزیب عاشر کے ساتھ گاؤں چلے گئے تھے۔ عمر صحت یاب ہو رہا تھا یہ خبر ہارون اور نوید نے سنائی تھی جو اُن کے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی اُنہیں اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا خوب اندازہ تھا۔ اور عمر کو جواب دہی کا احساس بھی۔

وہ عمر سے معافی مانگ لیں گے۔ آخری حل اُن کے پاس یہی تھا۔

عمر کا ظرف بڑا تھا۔ وہ اُنہیں معاف کر دے گا۔ اورنگزیب کو یقین تھا۔ ہارون اور نوید برابر عمر کے پاس ہاسپٹل جا رہے تھے۔ لیکن اورنگزیب کو ابھی تک ہمت نہیں ہوئی تھی عمر کا سامنا کرنے کی۔

☆☆☆

مائرہ شاہ زیب کے بیڈ روم میں کھڑی تھی۔ اسی کمرے میں وہ دولہن بن کے آئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے کمرے میں اُس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ کسی کی سانسوں کی ہلکی آواز محسوس ہو رہی تھی۔ یہ آواز صرف اُس کے محسوس کرنے کی حد تک تھی۔ حقیقت میں اس کا وجود نہیں تھا۔

شاہ زیب کے کپڑوں کی سرسراہٹ بھی واضح تھی۔ اُس کی خوشبو یہیں کہیں موجود تھی وہ بول رہا تھا آہستہ آہستہ۔ مائرہ کان لگا کے سننے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ شاہ زیب کی آواز ہی تھی۔ ''مائرہ تم ہار گئی ہو۔ میرے ساتھ تم نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے وہ محبت نہیں دی جس کا میں حقدار تھا۔ مائرہ میں نے تو تم سے ٹوٹ کے محبت کی۔ اپنے پیا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر بھی پھر بھی تم نے میری آرزوؤں کو سیراب نہیں ہونے دیا۔ تم نے میرے طیب کو اکیلا چھوڑ دیا۔ تم مطلبی اور خود غرض ہو مائرہ۔ تمہیں اپنے کیے کی سزا مل گئی ہے۔ تم اکیلی رہ گئی ہو۔ اپنی خود غرضی اور سفا کی سمیت اکیلی رہ گئی ہو''۔

اب آواز کے ساتھ ساتھ شاہ زیب کا وجود بھی واضح ہو گیا تھا۔ شاہ زیب نے وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جو مرنے سے پہلے آخری بار اُس کے جسم پہ موجود تھے۔

مائرہ نے دہشت سے اُس کی طرف دیکھا۔ ''نہیں نہیں میں اکیلی نہیں ہوں''۔ وہ چیختی چلی گئی۔ نیچے سے شریں سیڑھیاں چڑھ کے بھاگتی اُس کی طرف آئی۔ مائرہ پوری قوت سے چیخ رہی تھی۔ اب شاہ زیب غائب ہو چکا تھا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ اُس کے کپڑوں کی سرسراہٹ، نہ سانسوں کی مہک نہ اُس کی آواز۔

کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف اور صرف مائرہ کا اندرونی خوف اور پچھتاوے تھے۔

☆☆☆

مائرہ اور شریں کو طاہر نے عزت سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ساتھ ہی دریکتا کو آواز دی۔ مائرہ بے تابی سے دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی کچھ ہی دیر کے بعد دریکتا طیب کو اُٹھائے اندر داخل ہوتے ہوتے وہیں ٹھٹھک کے رُک گئی۔

اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مائرہ بھابھی یہاں آ سکتی ہیں۔ بے اختیار اُس نے طیب کو سینے سے چمٹا لیا جیسے اُس کے چھن جانے کا اندیشہ ہو۔

''آؤ آگے دریکتا تمہارے گیسٹ آئے ہیں''۔ دریکتا کی گھبراہٹ وہ بھانپ گئے تھے۔

طیب دو اجنبی مہمانوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

مائرہ اُس کی طرف بڑھی۔ دریکتا نے بے بسی سے طاہر انکل کی طرف دیکھا۔ جیسے اُن سے مدد مانگ رہی ہو۔

مائرہ نے جھپٹ کے طیب کو اُچک لیا اور اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ وہ اس اچانک افتاد سے گھبرا کے رونے لگا۔

''ماماماما''۔ وہ امداد طلب نگاہوں سے دریکتا کو دیکھتا مسلسل ماماماما کی گردان کیے جا رہا تھا۔ جبکہ مائرہ اُسے دیوانوں کی طرح چوم رہی تھی۔ ''میرا بیٹا، میرا طیب، میرا شہزادہ۔ میں ہوں ناں اپنے بیٹے کی ماما''۔ بہت عرصے کے بعد سب کچھ گنوا کے اُسے یاد آیا تھا کہ وہ طیب کی ماما ہے۔

دریکتا نے بڑی مشکل سے اُسے مائرہ کی گود سے الگ کیا تو وہ رونے لگی۔ ''طیب میرا ہے میں اسے لینے آئی ہوں۔ پلیز اسے مجھ سے جدا نہ کرو۔ میں مر جاؤں گی''۔ ''اُس وقت آپ کہاں تھیں جب اسے آپ کی ضرورت تھی۔ یہ صرف میرا ہے میرے پیا کا ہے میں نہیں دوں گی اسے''۔ دریکتا ضد میں آ گئی تھی۔

''پلیز میں طیب کے بغیر نہیں رہ پاؤں گی۔ میں نے بہت سزا پا لی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ طیب مجھے دے دو''۔ وہ گڑگڑا رہی تھی۔

ڈرائنگ روم سے رونے چیخنے کی آوازیں سن کے اشعر بھی اس طرف آ گیا۔

اندر کا منظر بڑا حیران کرنے والا تھا۔

مائرہ دریکتا سے طیب کو لینے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ کبھی ادھر اور کبھی اُدھر ہو رہی تھی۔ ''نہیں نہیں میں نہیں دوں گی''۔ شریں خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔

وہ بے بسی سے کبھی مائرہ اور کبھی دریکتا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ طاہر لغاری کا بھی یہی حال تھا۔ دریکتا نے ایسے وقت میں طیب کو اپنایا تھا جب اُس کی جنم دینے والی ماں نے بھی اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

وہ اُس کے لیے راتوں کو جاگی تھی اپنے آرام کی قربانی دی تھی۔ اس گھر میں اپنے ساتھ لے کے آئی تھی کہ وہاں حویلی میں کوئی اُس کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نہ سگی ماں اور نہ نانی اور نہ نانا۔

طیب کے لیے دریکتا ہی سب کچھ تھی۔

دوسری طرف مائرہ تھی۔ طیب کو جنم دینے والی ماں۔ وہ اُس کا خون تھا۔ جس سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

طیب اس کشمکش سے گھبرا کے بُری طرح رو رہا تھا۔

اشعر آگے بڑھ آیا۔ اُس نے طیب کو دریکتا سے لے لیا۔ ''میرا بیٹا میرے پاس آئے''۔ اُس نے طیب کو پیار سے چمکارا۔ مائرہ اُسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ طیب اشعر کے پاس جا کے پُر سکون ہو گیا۔ ''آپ سب بیٹھیں''۔ اُس نے مائرہ، شریں اور دریکتا کو اشارہ کیا۔

ملنے ملانے سلام دعا کے مرحلے اب طے ہو رہے تھے۔ مائرہ شرمندہ سی تھی۔

دریکتا البتہ رو رہی تھی۔ اُسے شائد آنے والے لمحات کا اندازہ ہو گیا تھا۔

''طیب آپ ہی کا بیٹا ہے اور آپ ہی اس کی ماں ہیں''۔ اسے آپ سے کوئی نہیں الگ نہیں کر سکتا۔ دریکتا نے پھوپھو ہونے کے ناطے اس کی دیکھ بھال کی لیکن یہ آپ کا خون ہے۔ آپ آج ادھر ہی رُکیں کل صبح طیب کو لے جائیے گا اپنے ساتھ۔ تب تک اس کی اجنبیت بھی ختم ہو جائے گی۔ کیوں دریکتا''۔ وہ تائیدی نگاہ سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کیا بولتی۔ اُس کے گلے میں آنسوؤں نے پھندا ڈال دیا تھا۔ مزید سننے کی اُس میں تاب نہیں تھی۔ وہ وہاں سے اُٹھ گئی اور تقریباً بھاگ کے سیڑھیاں چڑھ کے اُوپر آئی۔

اشعر طیب کو مائرہ کے پاس چھوڑ کے اُس کے پیچھے آیا۔

وہ اوندھی لیٹی بُری طرح رو رہی تھی۔

اشعر نے کندھے سے پکڑ کر اُسے سیدھا کیا۔ دریکتا کا چہرا آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ مائرہ کو اپنا فیصلہ سنا چکا تھا اور دریکتا کو پتہ تھا اب اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ اشعر نے اُس کے بال سہلائے۔ ''مائرہ طیب کی ماں ہے۔ بھلا اُسے اپنی ماں سے دور کرنے کا ظلم کیوں کیا جائے۔ خون کی اپنی کشش ہے ایک دن طیب کو اپنی ماں کے پاس لوٹنا تھا۔ وہ آپ کے پاس امانت تھا۔ ہنسی خوشی اس حقیقت کو تسلیم کر لیں تو دل مطمئن ہو جائے گا۔ طیب اپنی ماں کے پاس جا رہا ہے کسی اور کے پاس نہیں''۔

اشعر بہت نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔

وہ دریکتا کے بہت پاس بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے ایسا موقعہ نہیں آیا تھا وہ رو رہی تھی ورنہ ضرور محسوس کرتی۔

طیب مائرہ کے پاس ہی سویا۔

اُس کے روم روم میں سکون تھا۔ اس کے لیے وہ دریکتا کی شکر گزار تھی۔

☆☆☆

باسط نے سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اُس کے پارٹنر نے اُس کا فیصلہ خوش دلی سے مان لیا تھا۔

باسط نے کینیڈا شفٹ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ فی الحال وہ پاکستان واپس جانا نہیں جاتا تھا۔ نہ سوال جواب کا سامنا کر سکتا تھا کیونکہ حمزہ احمد اور بینا سمیت مائرہ کے گھر والے بھی اُس سے ناراض تھے۔

کچھ عرصے بعد حالات معمول پہ آ جاتے تو اُس نے واپس اپنے ملک آ کے نئی زندگی نئے سرے سے شروع کرنی تھی۔

وہ تیز تیز اپنے سارے کام نمٹا رہا تھا۔

اُس نے سیٹ بھی بک کروالی تھی۔

باسط تیار ہو کے باہر نکلنے ہی والا تھا جب ڈور بیل زور دار آواز میں بجی۔ اُس نے خود آ کے دروازہ کھولا۔

باہر چار مسلح پولیس والے مخصوص یونیفارم میں ملبوس اُس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔

واپسی کے راستے اور فرار کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ اس کا اندازہ بہت پہلے سے تھا باسط کو۔ پر اُسے عین آخری وقت میں شکست ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ ہر بار صفائی سے قانون کی نگاہوں میں دھول جھونکتا آیا تھا جو ایک عرصے سے اُس کے پیچھے لگی تھیں۔ کالے دھندوں اور کالے کرتوتوں کا یہی انجام ہونا تھا۔

باسط کو ایک لمبا عرصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا تھا۔

ایک پولیس والے نے ہتھکڑیاں اُس کے بازوؤں میں پہنائیں اور دوسرے نے ٹھوکا دے کے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

باسط تھکے ہارے قدموں سے پولیس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا۔

☆☆☆

مائرہ دریکتا کے ساتھ مل کے گھر کو سجانے سنوارنے میں لگی ہوئی تھی۔ اُن دونوں نے خود مل کے سارے کمروں کی سیٹنگ کی تھی۔

عمر کا کمرا ٹھیک کیا تھا۔ نئے پردے اور نیا قالین بچھایا تھا۔ دریکتا نے تازہ پھول توڑ کے گل دان میں سجا کے چھوٹی تپائی پہ رکھے۔ طیب اِن تمام سرگرمیوں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

وہ مائرہ کا دوپٹہ پکڑے اُس کے پیچھے پیچھے گھوم رہا تھا۔

☆☆☆

نوید، ہارون اور نگزیب تایا، اشعر اور طاہر کے ساتھ عمر کو ہاسپٹل سے گھر لانے کے لیے گئے تھے۔

گاؤں سے سب رشتہ دار ان کے گھر آئے ہوئے تھے۔

عمر زیب اتنے ماہ ہاسپٹل میں رہ کے پہلی بار گھر آ رہے تھے۔

دریکتا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔

وہ دو دن سے اِدھر پیا کے گھر پہ ہی تھے۔ طاہر انکل نے ہی اُسے خوشخبری سنائی تھی کہ عمر بالکل صحت یاب ہو گیا ہے۔ تم تیاری کرو اُسے خوش آمدید کہنے کی۔

تب سے وہ اور مائرہ گھر کی حالت خود ٹھیک کرنے میں لگ گئی تھی۔

وہ دونوں بے تابی سے انتظار کر رہی تھیں کہ کب عمر گھر آتے ہیں۔

مائرہ نے نہلا دُھلا کے طیب کو نئے کپڑے پہنائے تھے۔ وہ بہت صحت مند اور پیارا لگ رہا تھا۔

باہر گیٹ پہ ایک سے زائد گاڑیوں کے رُکنے کی آواز آئی تو دریکتا اور مائرہ کے ساتھ ساتھ فوزیہ اور فرح بھی

گیٹ کی طرف بڑھیں۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ دو گاڑیاں اکٹھے اندر داخل ہوئیں۔

سب سے پہلے طاہر اُترے اور دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ عمر گاڑی سے نیچے اُترے۔ سامنے مائرہ طیب کو اُٹھائے کھڑی تھی۔ وہ بھاگ کے عمر چچا کے گلے لگ گئی۔ اتنے میں اشعر بھی دوسری گاڑی سے اُتر آیا اور طیب کو خود اُٹھا لیا۔ مائرہ رو رہی تھی۔ آنسو عمر کی آنکھوں میں بھی تھے۔

''یہ لیں طیب کو بھی تو اُٹھائیں کیسے آپ کی طرف دیکھ رہا ہے''۔ اشعر نے طیب کو اُن کی طرف بڑھایا۔ طاہر ہاسپٹل میں سب کچھ بتا چکے تھے۔ اُنہوں نے طیب کو سینے سے چمٹا لیا۔ ''میرا بیٹا میرا شاہ زیب''۔ اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے پھوٹ پڑے۔ اس بار دریکتا، مائرہ، فوزیہ، فرح کے ساتھ شریں بھی رو رہی تھی۔ طاہر کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔

قدرت نے غم کے بعد خوشی دی تھی۔

سب خوش تھے۔ عمر زیب نے طیب کو گود میں اُٹھایا ہوا تھا اُس کے ساتھ لاڈ کر رہے تھے۔ ''اے اللہ عمر کے گھرانے کی خوشیوں کو ہمیشہ قائم رکھنا''۔ طاہر نے دل کی گہرائی سے دعا دی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری اور اشعر رات کو کافی لیٹ گھر واپس آئے۔

عمر نے رات کا کھانا کھلائے بغیر اُٹھنے نہیں دیا۔ اُن کی باتیں ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ عمر نے اشعر سے کہا بھی کہ رات اِدھر ہی رُک جاؤ۔ پر اُس نے سلیقے سے معذرت کر لی۔

طاہر بہت خوش تھے۔ عمر صحت یاب ہو کے گھر آ گیا تھا۔ اُس کے گھر کی خوشیاں لوٹ آئی تھی۔ زندگی کا ٹوٹا سرا وہیں سے جڑ گیا تھا۔

شاہ زیب کی جگہ مائرہ اور طیب نے لے لی تھی۔

قدرت کی منشاء اور مرضی اسی میں تھی۔

مائرہ نے بھی قسمت کے لکھے کو قبول کر لیا تھا۔

قدرت کے فیصلوں کی مصلحت وہ جان چکی تھی۔

اور یقیناً شاہ زیب کی روح بھی اب سکون میں تھی۔ کیونکہ رات اپنے بیڈروم میں سوتے ہوئے اُسے بالکل بھی ڈر نہیں لگا تھا۔

☆☆☆

عمر طیب کے ساتھ بہت خوش تھے۔ مائرہ صبح ناشتے کے وقت کبھی دودھ کا مگ کبھی آملیٹ اور کبھی بریڈ عمر کی طرف بڑھاتے ہوئے۔ کھانے پہ اصرار کرتے ہوئے۔ مکمل طور پہ ذمہ دار بہو کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔

دریکتا کو اُس کی یہ تبدیلی بہت خوشگوار لگی تھی۔

اُسے اب پپا اور طیب کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ مائرہ اُن کی دیکھ بھال بہتر طور پہ کر سکتی تھی۔

اُس نے عمر زیب سے بہت ساری معافیاں مانگی تھیں۔

اُنہوں نے کھلے دل سے سب کچھ معاف کر دیا تھا۔

عمر کو طیب کے ساتھ مائرہ پھر سے مل گئی تھی۔ ایک نئی زندگی کی اُمید۔ ایک نئی اُمنگ۔ وہ سب کچھ پرانے زخم پرانی تلخیاں بھول گئے تھے۔

اُن کا آج طیب کی صورت میں سامنے تھا۔

اُس کے ساتھ ہنستے مسکراتے، شرارتیں کرتے وہ خود بھی بچہ بن گئے تھے۔ وہ خوشیوں بھرے دن لوٹ آئے تھے۔ اُن کی دسترس میں تھے جو کچھ عرصہ قبل بچھڑ گئے تھے۔

عمر اپنے رب کے شکر گزار تھے جس نے طویل سیاہ رات کے بعد روشن چمکدار اُجلا دن نصیب کیا تھا۔

اب طیب اور مائرہ ہی اُن کی زندگی تھے۔

☆☆☆

سات دن ہو چکے تھے دریکتا کو پپا اور مائرہ کے ساتھ خوشیاں سمیٹتے ہوئے۔ اچانک وہیں بیٹھے بیٹھے ہی اُسے طاہر انکل اور اشعر کا خیال آیا۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی۔ اُن دونوں میں سے کسی نے بھی اُسے پوچھا نہیں تھا۔ نہ کوئی آیا تھا وہ خود ہی گھر جانے کے لیے پر تولنے لگی۔

اپنے کمرے میں آ کے کپڑے وغیرہ بیگ میں ڈالے پھر پہلے پپا کو بتایا۔ وہ اور مائرہ بھی اُس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

شام ڈھل رہی تھی جب وہ پپا اور مائرہ کے ساتھ سبز بیلوں سے ڈھکے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ طاہر لغاری اُن سب کو دیکھ کے بہت خوش ہوئے۔ موسم خوشگوار تھا۔ وہ اُدھر لان میں ہی کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔

اشعر گھر میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ طاہر انکل نے دریکتا کو کھانے میں خصوصی اہتمام کرنے کا مشورہ دیا۔ عمر مائرہ کے ساتھ پہلی بار اُن کے گھر آیا تھا۔

رات کے کھانے سے کچھ دیر پہلے اشعر کی واپسی ہوئی۔

بڑی چہل پہل سی تھی۔

طیب اُس کی طرف بھاگ کے آیا۔

طیب کو گود میں اُٹھائے وہ عمر انکل اور دریکتا کی طرف آیا۔ عمر کھڑے ہو کر ملے اُسے گلے سے لگایا۔ دریکتا نے البتہ ایک اُچٹتی ہوئی نظر ہی ڈالی۔ اشعر نے بھی زیادہ دھیان نہیں دیا۔

عمر اور مائرہ کھانا کھا کے گھر واپس گئے۔ طاہر انکل نے دریکتا کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ پہلے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر اصل بات کی طرف آئے۔

''جب وہ خلع کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا تب تمہیں پتہ ہی ہو گا کہ اورنگزیب تمہارے تایا نے کون کون سے ہتھکنڈے استعمال نہیں کیے''۔ وہ پہلو بدل کے رہ گئی جانے طاہر انکل پرانی باتیں کیوں دہرا رہے تھے۔ ''تمہارے ذہن میں بہت سارے شکوے اور شکایتیں ہوں گی۔ ان ساری باتوں کا تعلق تمہارے تایا کے نامناسب رویئے سے ہے۔ اشعر تمہیں بیاہ کے لے آیا پر وہ تمہیں موقعہ دینا چاہ رہا تھا کہ تم خود سے اُسے پرکھو، جانو اور تب خود فیصلہ کرو کہ آیا وہ کس طرح کا انسان

ہے۔ کیا وہ ویسا ہی ہے جیسا اُسے بیان کیا گیا ہے یا ویسا ہے جیسا تم نے پایا ہے۔ تمہارے ذہن پہ بہت بوجھ تھا۔ تم مجبوری میں رخصتی کے لیے راضی ہوئی تھی وہ اس مجبوری سے فائدہ اُٹھانے والوں میں سے نہیں تھا۔

اَب تو تمہیں پتہ چل گیا ہوگا کہ وہ کس قسم کا نوجوان ہے۔ سو اپنے دل کو ہر قسم کے منفی خیالات سے پاک کرلو۔ مجھے اشعر نے بتایا تھا کہ تم آج کل بہت غصے میں ہو۔ میں نے سوچا اس سے پہلے کہ میں بھی اس غصے کی لپیٹ میں آؤں۔ سب کچھ بتا دوں''۔

آخر میں وہ اُسے شرارتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے تو وہ شرمندہ ہوگی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دل میں اُن کی سمجھداری کی قائل ہوگی تھی۔ واقعی اُس وقت طاہر انکل یا اشعر میں سے اُسے کوئی کچھ کہتا تو وہ غلط ہی سوچتی۔ اب درست غلط سب کچھ اُس کے سامنے تھا۔

''اب جاؤ آرام کرو رات کافی ہوگی ہے۔ میری سب دعائیں تم دونوں کے ساتھ ہیں''۔

اُسے سونے کا کہہ کر وہ خود بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گے۔ وہ دریکتا کو اپنے سامنے مزید شرمندہ ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

☆☆☆

اشعر اپنے پرانے بیڈروم میں تھا جو اُس نے کبھی دریکتا اور طیب کے حوالے کردیا تھا۔ وہ دو تکیے سر کے پیچھے رکھے نیم دراز تھا۔ دریکتا اندر آ تو گئی تھی پر تذبذب کا شکار تھی۔

اشعر نے اُس کی مشکل آسان کردی۔ بیڈ سے نیچے اُتر آیا۔ ''میں اب مزید دوسرے بیڈروم میں اکیلا نہیں سو سکتا۔ پپا نے آپ کو سب بتا دیا ہوگا۔ میں نے کہا تھا اپنی بہو کو خود ہی سمجھائیں میں اُس کے ساتھ دماغ نہیں کھپا سکتا''۔ اشعر نے مسکراہٹ ہونٹوں میں ہی دبالی اور اُس کا بازو پکڑا۔ دریکتا نے چھڑانا چاہا پر نہیں اشعر نے دوسرا بازو بھی پکڑ لیا۔ ''اب نہیں، میں دوسرے بیڈروم میں سوتا تھا تو چپکے چپکے روتی تھی۔ مجھے بتاتی نہیں تھی پر''۔ اشعر کھل کے ہنسا۔ ''جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے اپنی انسلٹ فیل ہوتی تھی اس لیے رونا آتا تھا''۔

وہ اشعر کی قربت سے خائف ہو رہی تھی۔ ''میں تو چاہ رہا تھا کہ مجھے خود جانو، پرکھو، ورنہ میری بیوی تھی تم جملہ حقوق میرے نام تھے اور میں........ لیکن میری مضبوطی کی گواہ تم خود ہو۔ ہے ناں؟'' اشعر نے اچانک اُسے خود سے قریب کرلیا۔

دریکتا نے پیچھے ہٹنا چاہا اشعر کی گرفت سخت تھی۔ ''اب بھی بھاگو گی؟''۔ اشعر نے اُس کے کان میں سرگوشی کی تو اُس کی مزاحمت کمزور پڑ گی۔ ''پاگل لڑکی میں بھی تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ پہلے تم میری غیرت پھر ضد بن گئی اور اب میری محبت ہو''۔ ''سچ'' دریکتا نے بے یقینی سے اُس کی طرف دیکھا۔ ''ہاں سو فیصد سچ''۔

''اشعر میں بھی آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ مجھے آپ سے محبت ہوگی ہے''۔ وہ بے چارگی سے بولتی اُسے بہت اچھی لگی۔ ''اب تو کچھ نہیں ہوسکتا کیونکہ تمہیں مجھ سے محبت جو ہوگی ہے''۔ اشعر اُسے محبت لٹاتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

دریکتا نے اُس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اُس نے بھی اشعر کی محبت کو قبولیت بخش دی تھی۔

اشعر نے بڑی نرمی سے اُسے بانہوں میں سمیٹتے ہوئے سب محبت بھرے جذبوں کو پذیرائی بخش دی تھی۔ اُس

نے شکوے شکایتوں کی نوبت ہی نہیں آنے دی تھی۔ اُس کا ہم سفر کتنا حساس اور سمجھدار تھا۔

دریکتا نے بڑے غرور سے اُس کی طرف دیکھا تھا۔

اشعر اُس کا مان، اَنا، خودداری سب کچھ ہی تو تھا۔

صد شکر کہ وہ اُسے پہچان گئی تھی۔

اشعر کی شریر نگاہیں کچھ نئی کہانیاں رقم کرنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ اور دریکتا میں انکار کی ہمت نہیں تھی۔ اُس کی اپنی مرضی بھی تو یہی تھی۔

ختم شد